جواہر شریعت

مجموعۂ رسائل

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

جواہر شریعت

مجموعہ رسائل

جلد اوّل

مؤلّف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور

نام کتاب : جواہر شریعت جلد اول

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

خلیفہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۵۲۳

تاریخ طباعت: رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

جواہرِ شریعت (جلدِ اول)
پر ایک اجمالی نظر

☆ لیلۃ القدر اور عید الفطر

☆ انحطاط و پریشانیوں کے اسباب اور راہِ عمل

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی۔ حقائق و اسرار

☆ فقہِ اسلامی اور غیر مقلدین

☆ احکامِ عید الاضحیٰ و قربانی

☆ سفرِ آخرت کے اسلامی احکام

☆ قیامت کی نشانی، حدیث کی زبانی

فہرس

انحطاط و پریشانیوں کے اسباب اور راہِ عمل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی - حقائق واسرار

فقہِ اسلامی اور غیر مقلدین

احکامِ عیدالاضحیٰ وقربانی

قیامت کی نشانی، حدیث کی زبانی

مُقَدِّمَة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقَدِّمَہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ أَجْمَعِیْنَ ، أَمَّا بَعْدُ: اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اپنے مشائخ کرام واساتذۂ عظام کی توجہات سے، بالخصوص حضرت اقدس مرشدی مسیح الامت: مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی علیہ الرحمہ، حضرت اقدس مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی صاحب علیہ الرحمہ، حضرت اقدس فقیہ الاسلام: مولانا مفتی مظفر حسین صاحب سہارنپوری علیہ الرحمہ کی برکات سے راقم الحروف کے قلم سے متعدد کتب ورسائل اور مضامین ومقالات مختلف حالات میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے اور اپنے وقت پر شائع بھی ہوتے رہے؛ کتب ورسائل تو کتابی صورت میں اور مضامین ومقالات بعض جرائد وماہناموں یا اخبارات میں۔ جو شائع ہوئے ان میں سے اکثر کتب ورسائل کی اشاعت کی ذمے داری رفیق محترم حافظ محمد شرف الدین صاحب (مدرس شعبۂ حفظ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) اُٹھاتے رہے اور تقریباً پچیس سے زائد رسائل انھوں نے اپنی محنت وکوشش سے طبع کیے؛ لیکن ان میں سے بعض ایک ہی مرتبہ شائع ہوکر ختم ہوگئے اور بعض دو یا تین چار دفعہ چھپ کر ختم ہوگئے، نیز بعض ایسے بھی مضامین تھے، جو اب تک کسی صورت میں بھی شائع نہ ہوسکے تھے۔

بعض احباب و دوستوں کی خواہش واصرار ہوا کہ ان رسائل ومضامین ومقالات کو جمع کر دیا جائے اور حسبِ عناوین ان کو ترتیب دے دیا جائے، تو یہ سب محفوظ بھی ہو جائیں گے اور لوگوں کے لیے استفادہ بھی آسان ہو جائے گا، میرے ان احباب میں بالخصوص عزیزی مولانا محمد زبیر احمد حفظہ اللہ (مدرس جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) اپنی طالبِ علمی کے دور ہی سے ان کو جمع کرنے اور ان کی ترتیب دینے کا شوق وجذبہ رکھتے تھے، جب انھوں نے اپنے اس جذبے کا اظہار کیا، تو احقر نے ان کو اجازت دے دی اور ان مضامین کی تین قسمیں بنا کر تین مجموعے بنانے کا خیال کیا گیا ہے:
ایک تو میرے شائع شدہ کتب ورسائل کا مجموعہ، دوسرے فقہی وعلمی مقالات کا مجموعہ اور تیسرے ان مضامین کا مجموعہ جو مختلف النوع اصلاحی وتربیتی، ملی وملکی، تاریخی وسوانحی اور تردیدی وتنقیدی وغیرہ عنوانات پر مشتمل اخبارات وجرائد میں شائع ہوئے ہیں۔
زیرِ نظر مجموعہ پہلی ترتیب ہے، جس میں میرے شائع شدہ رسائل جمع ہیں۔ جو مختلف اصلاحی عنوانات پر حسبِ ضرورت وتقاضائے وقت لکھے گئے تھے، البتہ ان میں سے جو ضخیم ہیں اور وہ باقاعدہ کسی کتب خانے سے طبع بھی ہو رہے ہیں، ان کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔

عزیزِ گرامی مولانا زبیر احمد سلمہ نے محنت سے ان کو جمع بھی کیا اور پھر ان کی ترتیب کا کام بھی نہایت سلیقے سے انجام دیا؛ نیز آیات کے حوالے اور ان پر اعراب اور احادیث کے حوالجات کی تحقیق، کتابت کی اغلاط سازی وتصحیح وغیرہ امور کی نگہداشت میں نہایت عرق ریزی سے کام کیا اور اس سلسلے میں میرے دوسرے عزیز مولانا محمد یاسین حفظہ اللہ (مدرس جامعہ مسیح العلوم) نے بھی ان کا بھرپور تعاون کیا اور اصل سے ٹیپ شدہ مواد کو ملانے اور ان کی اغلاط سازی میں نہایت مستعدی کے ساتھ لگے رہے۔
اس موقع پر میرے ان عزیزان کا شکریہ ادا نہ کرنا ناسپاسی ہوگی، جن کی لگاتار

محنت وتوجہ کے نتیجے میں میری یہ کاوشیں منظر عام پر آئیں اورلوگوں کے لیےان سے استفادے کا راستہ آسان ہوا؛ ایک مصنف کی یہی سب سے بڑی خواہش وتمنا ہوتی ہے کہ اس کی لکھی ہوئی کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں وہ دیکھے اورلوگ اس سے استفادہ کریں؛ تاکہ لکھنے کا مقصد پورا ہو۔ ان حضرات نے میری اس خواہش کی تکمیل میں سعی کی ہے، اللہ ان دونوں کو اپنے شایان شان جزا و بدلہ عطا فرمائے اور ان کو دینی ، علمی وعملی لحاظ سے بھی اور دنیوی وظاہری اعتبار سے بھی خوب ترقیات سے نوازے۔ آمین

اس موقع پر میرے ایک اور کرم فرما عزیز القدر جناب مولانا آصف اقبال صاحب عمری (مدرس جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) کا ذکر نہ کرنا نہایت ناسپاسی کی بات ہوگی، جنھوں نے وقتاً فوقتاً ان مضامین کو جمع کرنے اور کبھی ان کو کمپیوٹر سے ٹیپ کرنے کی خدمت بھی انجام دی اور ان مضامین کی حفاظت کا کام بھی فرمایا، میں ان کے حق میں بھی دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی خدمات کو شرفِ قبول بخشے اور انھیں علمی وعملی کمال سے سرفراز فرمائے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر خدمت کو شرف قبول عطا کرے اور میرے لیے اس کو ذخیرۂ نجات بنائے اور استفادہ کرنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ میرے حق میں، میرے والدین کے حق میں اور میرے اساتذہ ومشائخ کے حق میں دعائے خیر فرماتے رہیں۔ فقط

۱۷/محرم/۱۴۲۷ہجری — محمد شعیب اللہ خان

۶/فروری/۲۰۰۷عیسوی — (مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

ليلة القدر
اور
عيد الفطر

حرف آغاز

زیرِ نظر رسالہ میرے چند مضامین کا مجموعہ ہے، جو "لیلۃ القدر اور عید الفطر" سے متعلق مختلف اوقات میں اخبارات کے لیے لکھے گئے تھے۔

روز ناموں کی زندگی جیسا کہ مشہور بھی ہے اور معلوم بھی، ایک دن کی ہوتی ہے، اس کے بعد ان میں آئے ہوئے مضامین کی کوئی حیثیت نہیں رہتی الا ماشاء اللہ اس لیے خیال ہوا کہ ان مضامین کو یک جا کر دیا جائے؛ تا کہ ان سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہے اور کاتب مضامین کے لیے صدقۂ جاریہ بنیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی شرف قبول عطا فرمائے اور بندے کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لیلۃ القدر-اس کی حقیقت اور خصوصیات

لیلۃ القدر کی فضیلت وعظمت پر قرآن پاک واحادیث شریفہ، آثار صحابہ واقوال علماوصوفیا سب کے سب متفق ویک زباں ہیں اور تمام کے تمام اہل اسلام بھی ہر دور میں اس کی عظمت وبزرگی کے قائل رہے ہیں، قرآن پاک میں تو ایک مستقل سورت "لیلۃ القدر" کے عنوان سے موجود ہے، جس میں حق تعالی شانہ نے لیلۃ القدر کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

﴿إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ. وَمَا أَدْرٰکَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ. لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ. تَنَزَّلُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ. سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ.﴾ (القدر: ۳۰)

(ہم نے اس (قرآن) کو اتارا "لیلۃ القدر" میں اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے؟ لیلۃ القدر ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے، اس (رات) میں فرشتے اور روح (جبرئیل) اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں ہر کام پر، سلامتی ہے یہ رات صبح کے نکلنے تک۔

اس میں لیلۃ القدر کے متعلق چار باتوں کا ذکر ہے:

(۱) یہ کہ اس رات قرآن نازل ہوا۔

(۲) یہ کہ یہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

(۳) یہ کہ اس رات اللہ کے فرشتے مع جبرئیل کے ہر کام کے ساتھ نازل

ہوتے ہیں۔

(۴) یہ کہ یہ رات صبح نکلنے تک سلامتی ہی سلامتی ہے۔

احادیث بھی اس کی فضیلت میں متعدد آئی ہیں نیز حضرات صحابہ وعلما اور صوفیا کے اقوال بھی۔

لیلۃ القدر امتِ محمد یہ کے لیے مخصوص عطیہ ہے

حضرات مفسرین نے ﴿ سورۃ القدر ﴾ کی شانِ نزول میں متعدد روایات نقل کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر کا یہ عطیہ امت محمد یہ کے ساتھ مخصوص ہے، کسی اور امت کو اس سے مشرف نہیں کیا گیا۔

(۱) ابن ابی حاتم نے حضرت علی وعروۃ رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن بنی اسرائیل کے بزرگوں کا ذکر کیا، جنھوں نے اسّی برس تک اللہ کی اس طرح عبادت کی، کہ پلک جھپکنے کے برابر بھی کوئی گناہ نہیں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں کا نام بتایا کہ وہ حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت حزقیل بن العجوز اور حضرت یوشع بن نون علیہم السلام تھے، اس پر حضرات صحابہ کو تعجب ہوا، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی امت ان افراد کی عبادت پر تعجب کر رہی ہے، کہ انھوں نے اسّی برس عبادت کی، اللہ تعالی نے آپ پر اس سے بھی بہتر چیز نازل کی ہے، پھر سورہ ﴿ إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ پڑھی، پھر فرمایا کہ یہ لیلۃ القدر اس سے افضل ہے، جس پر آپ نے اور آپ کی امت نے تعجب کیا تھا۔ یہ سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت مسرور ہوئے۔ (۱)

(۱) الدر المنثور: ۸/۵٦۸، روح المعاني: ۳۰/۲۲۲، القرطبی: ۲۰/۱۳۲

(۲) ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت مجاہد سے روایت کی ہے، کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر کیا، جس نے ایک ہزار ماہ تک اللہ کے راستے میں ہتھیار باندھے رکھا (یعنی برابر اَسّی برس جہاد میں لگا رہا) اس پر مسلمانوں کو تعجب بھی ہوا اور اس کے مقابلہ میں اپنے اعمال حقیر معلوم ہوئے، تو اللہ نے سورۂ قدر نازل فرمائی۔ [(۱)]

امام مالک رَحِمَهُ اللّٰهُ نے قابل اعتماد اہل علم سے روایت کی ہے، کہ رسول کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو پچھلی امتوں کی عمریں بتائی گئیں (کہ بہت لمبی لمبی ہوتی تھیں)، یہ دیکھ کر آپ کو اندیشہ ہوا کہ پچھلی امتیں طول عمر کی وجہ سے جو بہت سارے عمل کر سکی ہیں، میری امت اتنے عمل (عمر کم ہونے کی وجہ سے) نہ کر سکے گی، تو اس پر اللہ نے آپ کو لیلۃ القدر عطا فرمائی اور اس کو ایک ہزار ماہ سے بہتر قرار دیا۔ [(۲)]

اس سلسلے میں اور بھی روایات آئی ہیں؛ مگر یہ چند بھی کافی ہیں، ان روایات میں بظاہر تعارض محسوس ہوتا ہے؛ مگر حقیقت میں کوئی تعارض نہیں؛ کیوں کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایسے کئی واقعات کے بعد سورۂ قدر نازل ہوئی اور ہر ایک سے اس کا تعلق ہو، اسی لیے مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک آیت یا ایک ﴿سُوْرَةُ الْقَدْرِ﴾ کے متعدد شان نزول ہو سکتے ہیں۔

غرض معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر ایک خاص عطیہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا فرمایا ہے۔

لیلۃ القدر کے عطیہ کا مقصد؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال بالکل فطری بھی ہے کہ اس امت کو خصوصیت کے

(۱) تفسیر مجاهد:۲/۷۷۴، الدر المنثور:۸/۵۶۸، وغیرہ.

(۲) المؤطا للإمام مالک:۹۹

ساتھ یہ عظیم و بابرکت عطیہ (لیلۃ القدر) کس مقصد سے دیا گیا ہے؟

اس کا جواب اوپر ذکر کی گئی روایات سے اجمالاً یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس عطیۂ خداوندی سے مقصود یہ ہے کہ امتِ محمدیہ اس رات محض اللہ کی عبادت واطاعت میں لگی رہے اور ایک رات کے اس عمل سے پچھلی اُمتوں کے ان حضرات کا ثواب حاصل کرلے، جنھوں نے اسّی اسّی برس اللہ کی عبادت واطاعت میں زندگی بسر کی ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیبات وتلقینات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ اس رات اللہ کی عبادت میں اشغال وانہماک ہونا چاہیے۔ چناں چہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

«من قام رمضان إيماناً واحتساباً غفر له ماتقدم من ذنبه.» (۱)

(جس نے لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے قیام کیا (یعنی عبادت کیا) اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔)

اس حدیث سے لیلۃ القدر میں عبادت واطاعت کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رغبت اسی لیے دلائی جاتی ہے کہ یہ کام اس موقع پر کرنے کا ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ عبادت واطاعت کی رات ہے، اس کے علاوہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں لیلۃ القدر کو پاؤں تو اس میں کیا کہوں؟ فرمایا کہ یہ دعا کرو:

«اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا.» (۲)

(اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے معافی کو پسند کرتا ہے لہذا ہم کو معاف فرما۔)

---

(۱) البخاري:۳۴، مسلم:۱۲۶۸، الترمذي:۶۱۹، النسائي:۲۱۷۳۰ أبو داود :۱۱۶۵، أحمد:۶۹۷۹

(۲) الترمذي:۳۴۳۵، ابن ماجه:۳۸۴۰، أحمد:۲۴۲۱۵

اس سے یہ معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر میں ایک کام اللہ سے دعا مانگنا بھی ہے، جس میں عاجزی وانکساری، انابت وتوجہ الی اللہ کے عناصر شامل ہوں، ان مقاصد کے لیے ہمیں لیلۃ القدر عطا فرمائی گئی ہے۔

قدر کے تین معنے

لیلۃ القدر کو لیلۃ القدر کیوں کہتے ہیں؟ علما نے اس کی تین وجوہات بیان کی ہیں، اور یہ تین وجوہ دراصل قدر کے تین معانی کے اعتبار سے پیدا ہو گئے ہیں۔

قدر کے عربی میں تین معانی بیان ہوئے ہیں (۱) عظمت: جیسے کہا کرتے ہیں کہ باپ کی قدر کرو یعنی اس کی عزت وعظمت کرو (۲) تقدیر (۳) تنگی: جیسے قرآن میں فرمایا ﴿مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ﴾ (جس کا رزق تنگ کر دیا گیا)۔

ان تین معانی کے لحاظ سے لیلۃ القدر کے بھی تین معنی ہو گئے اور پھر ہر معنی پر اس کی مختلف توجیہات بھی فرمائی گئی ہیں اور ابن الجوزی نے پانچ معنے بیان کیے ہیں، مگر وہ ان ہی تین میں منضم ہو جاتے ہیں۔ (۱)

لیلۃ القدر کی پہلی توجیہ

چناں چہ قدر کے پہلے معنی عظمت وعزت کے ہیں، اس لحاظ سے لیلۃ القدر کے معنی عزت وعظمت والی رات کے ہوئے، اب رہا یہ سوال کہ اس کو عزت وعظمت والی رات کیوں کہا گیا؟ بعض علما فرماتے ہیں کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا قابل قدر کلام، حضرت جبریل جیسے قابل قدر فرشتے کے ذریعے، نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم جیسے قابل قدر رسول پر نازل فرمایا تھا؛ لہذا اس کو قدر وعزت والی رات کہا۔

---

(۱) زاد المسیر:۹/۱۸۲

بعض نے فرمایا کہ اس رات اللہ کے جلیل القدر ورفیع القدر فرشتے دنیا میں نازل ہوتے ہیں؛ اس لیے اس کو قدر والی رات کہا گیا، بعض نے یہ توجیہ کی، کہ چوں کہ اس میں اللہ کی طرف سے رحمت وبرکت ومغفرت جیسی جلیل القدر روحانی نعمتیں نازل ہوتی ہیں؛ اس لیے اس کو لیلۃ القدر فرمایا گیا ہے، اس بارے میں ایک تاویل یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی عبادت کے ذریعے اس رات شب بیداری کرتا ہے، وہ قابل قدر ولائق عظمت وعزت ہو جاتا ہے؛ لہذا اس رات کو قدر والی رات سے موسوم کیا گیا۔ (۱)

قدر کے دوسرے معنی اور اس کی توجیہ

قدر کے دوسرے معنی تقدیر کے ہیں اور اس معنی کے اعتبار سے لیلۃ القدر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس رات میں اللہ کی طرف سے بندوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور ان فیصلوں کا اظہار فرشتوں پر کیا جاتا ہے، ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ یہ بات صحیح سندوں کے ساتھ حضرت مجاہد، عکرمہ، قتادہ وغیرہ سے عبدالرزاق رحمہم اللہ وغیرہ مفسرین نے روایت کی ہے۔ (۲)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ علما نے کہا کہ لیلۃ القدر اس رات کو اس لیے کہا گیا کہ اس رات میں ملائکہ کے لیے یہ لکھ کر دے دیا جاتا ہے کہ (انسانوں کا) رزق، عمر، وغیرہ کیا اور کتنی ہے؟ جو اس سال میں مقدر ومقرر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ (الدخان: ۴) (اس رات میں تمام بڑے امور کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔) نیز (سورۃ القدر) میں فرمایا کہ اس رات فرشتے

(۱) فتح الباري: ۴/۲۵۵
(۲) فتح الباري: ۴/۲۵۵

جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام کے ساتھ اترتے ہیں، ہر امر کو یعنی فیصلہ کو لے کر اور فیصلہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فیصلوں کا اظہار فرشتوں کے سامنے کیا جاتا ہے اور ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی ڈیوٹی و وظیفہ انجام دیتے رہیں۔(۱)

قدر کے تیسرے معنے کی توجیہ

قدر کے تیسرے معنی ہیں تنگی، اس لحاظ سے لیلۃ القدر کو تنگی کی رات اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار فرشتے اس رات زمین پر اُترتے ہیں اور فرشتوں کی کثرت کے نتیجے میں اس رات زمین تنگ ہو جاتی ہے؛ اس لیے اس رات کو لیلۃ القدر یعنی تنگی کی رات کہا گیا، یا اس لیے اس کو تنگی کی رات کہا گیا کہ لیلۃ القدر کو مخفی کر دینے کی وجہ سے لوگوں پر کچھ دقت اور تنگی محسوس ہوتی ہے۔(واللہ اعلم)

لیلۃ القدر کب آتی ہے؟

یہ عظیم و مبارک رات کب آتی ہے؟ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رَحِمَہُ اللہُ نے "فتح الباري" میں اس بارے میں چھیالیس (۴۶) اقوال اور ان کے دلائل کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، جمہور علما نے اس سلسلے میں جو فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے اور اس میں بھی طاق راتوں میں ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

«فلتمسوها في العشر الاواخر.»(۲)

(لیلۃ القدر کو رمضان کے اخیر عشرہ میں تلاش کرو۔)

---

(۱) شرح مسلم: ۱/۳۶۹

(۲) البخاري: ۱۸۷۸، مسلم: ۱۹۹۸، الترمذي: ۷۲۳، أحمد: ۲۳۱۵۷

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« تحروا ليلة القدر من العشر الأواخر من رمضان. »

(جو لیلۃ القدر کو تلاش کرنا چاہے، وہ اس کو آخری دس (راتوں) میں تلاش کرے۔)(۱)

ان کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ لیلۃ القدر آخری عشرہ رمضان میں آتی ہے؛ نیز یہ بھی وارد ہوا ہے کہ آخری عشرے میں بھی وتر یعنی طاق راتوں میں زیادہ امکان ہے۔ چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« تحروا ليلة القدر في الوتر من العشر الأواخر من رمضان. »

(حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اخیر عشرہ میں سے طاق راتوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو۔)(۲)

پھر بعض روایات میں ستائیس رمضان کی شب میں لیلۃ القدر ہونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ چناں چہ "ابو داؤد" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول کو نقل کیا ہے۔(۳)

اسی طرح بعض صحابہ سے بھی مروی ہے، چناں چہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ جانتے ہیں، کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہوتی ہے اور رمضان کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے اور یہ کہ وہ ستائیسویں رات میں ہوتی ہے، پھر خود قسم کھا کر فرمایا کہ وہ بلا استثنا و بلا تخلف

(۱) البخاري:۱۸۷۷، مسلم:۱۹۹۰

(۲) البخاري:۱۸۷۶

(۳) أبو داود:۱۱۷۸

ستائیسویں میں ہوتی ہے۔(۱)

مگر چوں کہ دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ستائیسویں ہی میں یہ متعین نہیں ہے، چناں چہ ابن عباس سے ''بخاری'' میں ایک قول: ستائیسویں کا اور دوسرا: چوبیسویں کا مروی ہے، پھر علما نے ان کے اقوال کی توجیہ وتطبیق میں بھی لمبا کلام کیا ہے، پھر ''مسلم'' میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے دیکھا کہ لیلۃ القدر ستائیسویں میں ہے، اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھی تمھاری طرح دکھایا گیا ہے، لہٰذا تم آخری عشرے میں سے طاق راتوں میں اس کو تلاش کرو۔(۲)

اس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تسلیم کر کے کہ ستائیسویں میں لیلۃ القدر ہوئی، پھر بھی فرمایا کہ آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ معلوم ہوا کہ دوسری راتوں میں ہونے کا بھی امکان ہے؛ لہٰذا آخری عشرے میں تلاش جاری رکھنا چاہیے۔

ایک نبوی تنبیہ

یہاں ایک اہم حدیث ذکر کرنا مناسب ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ لیلۃ القدر کے سلسلہ میں تعیین پر اصرار بھی مناسب نہیں؛ بل کہ آخری عشرے میں تلاش کرنا اور اس تلاش کو جاری رکھنا مناسب ہے۔

حاکم نے ''مستدرک'' میں اور ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے لیلۃ القدر کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا وہ رمضان میں ہوتی ہے یا غیر رمضان میں بھی

(۱) مسلم:۱۲۷۲، أبو داود:۱۱۷۰، الترمذي:۷۲۳

(۲) مسلم:۱۹۸۷

ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں؛ بل کہ رمضان میں ہوتی ہے، میں نے عرض کیا کہ کیا انبیا جب تک زندہ ہوتے ہیں وہ رہتی ہے اور انبیا کے چلے جانے سے وہ بھی اٹھالی جائے گی یا قیامت تک رہے گی؟ فرمایا کہ وہ قیامت تک رہے گی، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ رمضان کے کون سے حصے میں ہوگی؟ فرمایا کہ اول یا آخری عشرے میں تلاش کرو؛ پھر آپ ﷺ کچھ اور بیان فرماتے رہے، میں نے فرصت کا موقع غنیمت جانا اور عرض کیا کہ لیلۃ القدر ان بیس دنوں میں سے کون سے دن میں ہوتی ہے؟ فرمایا کہ آخری دس دنوں میں اس کو تلاش کرو اور اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ پوچھنا، پھر آپ ﷺ کچھ اور بیان کرتے رہے، پھر میں نے فرصت کو غنیمت جانا اور عرض کیا کہ میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ مجھے بتائیں کہ وہ دس میں سے کون سی رات ہوتی ہے؟ اس پر آپ اس قدر غضب ناک ہوئے کہ نہ اس سے پہلے مجھ پر آپ نے ایسا غصہ کیا اور نہ بعد میں اور فرمایا کہ اللہ اگر چاہے گا؛ تو تم کو مطلع کردے گا آخری سات دنوں میں اس کو تلاش کرو۔ (۱)

حاکم نے اس کو "مسلم" کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے، معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں زیادہ کاوش اللہ کے رسول ﷺ کو پسند نہیں تھی؛ لہٰذا آخری عشرے میں یا کم از کم آخری سات راتوں میں لیلۃ القدر کی تلاش جاری رکھنا چاہیے۔

لیلۃ القدر کو بھلا دیا گیا

اصل یہ ہے کہ لیلۃ القدر کے سلسلے میں مختلف روایات ہیں، اولاً تو اسی میں کلام ہے کہ لیلۃ القدر کسی خاص و متعین تاریخ کو آتی ہے یا کبھی کسی تاریخ کو اور کبھی کسی اور

(۱) المستدرک للحاکم:۱/۶۰۳، ابن أبي شیبة:۲/۲۵۰

تاریخ کواوراس اختلاف کی بنیاد یہ حدیث ہے، جس میں اللہ کے نبی ﷺ نے یہ خبر دی ہے کہ مجھے لیلۃ القدر کا علم دیا گیا پھر وہ اٹھالیا گیا۔ پوری حدیث یہ ہے:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے؛ تاکہ ہم کولیلۃ القدر کی خبر دیں، وہاں دو مسلمان جھگڑ رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا:

« خورجت لأخبركم بليلة القدرفتلاحى فلان وفلان فرفعت، و عسى أن يكون خيرا لكم، فلتمسوها في التاسعة والسابعة والخامسة. »

(میں اس لیے نکلا تھا کہ تم کولیلۃ القدر کی خبر دوں، فلاں اور فلاں نے جھگڑا کیا، تو یہ اٹھالی گئی اور شاید یہی تمھارے لیے بہتر ہے، پس (آخری عشرہ میں) نویں یا ساتویں یا پانچویں رات میں اس کو تلاش کرو۔)(۱)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کو پہلے تولیلۃ القدر کا علم دیا گیا، پھر وہ اٹھا لیا گیا، اب علما کے مابین اختلاف ہو گیا کہ سرے سے تعیین اٹھالی گئی کہ اب لیلۃ القدر کسی متعین تاریخ میں نہیں آتی، بل کہ کبھی کسی تاریخ میں اور کبھی کسی تاریخ میں آتی ہے یا یہ کہ تعیین تو اب بھی ہے کہ ایک متعین تاریخ میں یہ آتی ہے، مگر اللہ کے نبی ﷺ کے قلب و ذہن سے اس متعینہ تاریخ کو اٹھا لیا گیا، احتمال تو دونوں باتوں کا ہے اور ایک احتمال یہ ہے کہ اٹھا لینے سے مراد اُس سال جس میں اللہ کے نبی علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا: اس کی برکت کو اٹھالینا ہے؛ مگر بعض روایات میں صاف صاف یہ آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

(۱) البخاري:۱/۲۷۰،ورواه مالک عن أنس:۹۸

«نَسِیتُهَا أو نُسِّيتُهَا.» (۱)

(میں اس کو بھول گیا یا مجھ سے بھلا دیا گیا۔)

اس سے بہ ظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اٹھا لینے کا مطلب ہے ذہن سے اس تعیین کا اٹھا لینا اور بھلا دینا۔

بھلا دینے کا سبب

پھر اس نسیان یا بھلا دینے کا سبب کیا ہوا؟ اس میں ایک بات تو وہی بیان ہوئی ہے جو اوپر عرض کی گئی اور ''بخاری'' و'' موطا مالک'' کی روایات میں اس کا ذکر ہے، کہ دو آدمیوں کے جھگڑنے کی وجہ سے لیلۃ القدر کو بھلا دیا گیا، ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ یہ دو آدمی عبداللہ بن ابی حدرد اور کعب بن مالک تھے، جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ (۲)

اور مسلم شریف میں ایک دوسرا سبب بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قال أريت ليلة القدر ثم أيقظني بعض أهلي فنُسيتُها.» (۳)

(مجھے لیلۃ القدر دکھائی گئی پھر میرے بعض گھر والوں نے مجھے بیدار کر دیا تو میں بھول گیا یا بھلا دیا گیا۔)

اس میں لیلۃ القدر کو بھول جانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ گھر والوں نے اٹھا دیا تھا، اب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دو الگ الگ قصے ہوں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں

---

(۱) مسلم: ۱/۳۶۹

(۲) فتح الباري: ۴/۲۶۸

(۳) مسلم: ۱/۳۶۹

جو لیلۃ القدر کو دکھائے جانے کا ذکر ہے، وہ خواب کا واقعہ ہو اور اٹھانے اور بیدار کرنے کے سبب سے بھلا دیا گیا ہو۔ اور حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو لیلۃ القدر کے دکھائے جانے کا تذکرہ ہے، وہ بیداری کا واقعہ ہو اور دو آدمیوں کے جھگڑے کی وجہ سے بھول ہو گئی ہو، تو مطلب یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو دفعہ اس کا علم دیا گیا اور ہر دفعہ ایک ایک سبب سے وہ علم اٹھا لیا گیا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان دونوں احادیث میں ایک ہی واقعہ مذکور ہو اور یہ دونوں سبب ایک ہی وقت میں پیش آئے ہوں، اس طرح کہ آپ کو لیلۃ القدر کا علم دیا گیا؛ مگر ایک تو گھر والوں کے بیدار کر دینے، پھر ان دو آدمیوں کے جھگڑے کی وجہ سے بھلا دیا گیا۔

الغرض اس سے معلوم ہوا کہ ان دو اسباب کی وجہ سے لیلۃ القدر کا علم اٹھا لیا گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جھگڑا نہایت بُری بلا ہے، جس کی وجہ سے ایک عظیم علم سے محروم کر دیا گیا۔

لیلۃ القدر کو مخفی رکھنے کی حکمت

مگر لیلۃ القدر کو مخفی کر دینا اور اس کی تعیین کا علم اٹھا لینا یا خود تعیین ہی کا اٹھا لینا، بڑی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

«عَسٰی أن یکون خیرًا لّکُمْ .» یعنی لیلۃ القدر کا علم اٹھا لیا جانا، امید ہے کہ تمھارے لیے بہتر ہو گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس میں خیریت کا کونسا پہلو ہے اور وہ کیا حکمت و مصلحت ہے؟ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے حضرات علما کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

”لیلۃ القدر کے چھپا دینے میں یہ حکمت ہے کہ اس کی تلاش و جستجو میں مجاہدہ اور سعی کی جائے اور اگر اس کو متعین کر دیا جاتا، تو اسی ایک

رات پر اقتصار کر لیا جاتا۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر کو چھپا دینے سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کو پانے کے لیے لوگ محنت و مجاہدہ کریں گے اور نہ صرف ایک رات بل کہ پورا عشرۂ اخیرہ شب بیداری اور عبادت و اطاعتِ خداوندی میں گذاریں گے، اگر لیلۃ القدر کو متعین کر کے بتا دیا جاتا، تو صرف اسی ایک رات میں لوگ عبادت کرتے۔

دوسری حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ اگر لیلۃ القدر کو ظاہر کر دیا جاتا اور پھر بھی ہم سے اس میں عبادت میں کمی و کوتاہی ہوتی اور غفلت اندیشی کا ظہور ہوتا تو، اس عظیم نعمت کی کھلی ناقدری کی وجہ سے عذاب کے مستحق قرار پا جاتے، اب اللہ نے اس کو چھپا کر یہ کرم فرمایا کہ اس میں کوتاہی ہو جاتی ہے تو چوں کہ متعین طور پر معلوم نہیں اس لیے اس کو کھلی ناقدری میں شمار نہیں کیا جاتا اور محروم ہونے کے باوجود مستحق عذاب قرار نہیں دیا جاتا، یہ بھی اللہ کی بہت بڑی حکمت و مصلحت ہے۔

لیلۃ القدر کی پانچ خصوصیات

﴿ سُوْرَةُ الْقَدْرِ ﴾ میں لیلۃ القدر کی پانچ خصوصیات بیان کی گئی ہیں، جس سے یہ رات دیگر راتوں سے ممتاز ہو جاتی ہے اور اس کی حقیقت بھی ان سے واضح ہو جاتی ہے، یہاں ان کی تفصیل عرض کی جاتی ہے۔

نزولِ قرآن:

پہلی خصوصیت بیان کی گئی کہ لیلۃ القدر میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔

﴿اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ دوسری جگہ فرمایا ﴿ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾

---

(۱) فتح الباري:۴/۲۶۶

(ہم نے اس قرآن کو مبارک رات میں نازل کیا ہے۔)

اس میں مبارک رات سے مراد جمہور علمائے تفسیر کے نزدیک لیلۃ القدر ہے، جس عظیم الشان رات میں یہ عظیم کلام نازل کیا گیا، اس کی عظمت و بزرگی کا کیا ٹھکانہ ہے، یہ قرآن کیا ہے؟ انسانوں کے لیے پروانۂ آزادی ہے، اللہ نے دنیا میں انسان کو تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ مکرم ومقدس بنا کر بھیجا تھا، اس کو مسجود ملائک بنا کر دنیا میں روانہ کیا تھا؛ مگر یہ دنیا میں آکر خود کو ذلیل وخوار کیا اور اینٹ و پتھر و درخت اور دنیا کی ذلیل سے ذلیل اور بے حقیقت چیزوں کی پوجا و غلامی میں مبتلا ہو گیا، اللہ نے حضرات انبیا کے ذریعہ اس کو بتایا کہ تیرا مرتبہ کیا ہے؟ تو شجر و حجر کے سامنے سجدہ کرنے نہیں، شمس وقمر کی پوجا کرنے نہیں، ہواؤں اور دریاؤں کی غلامی کے لیے نہیں؟ بل کہ تو تو ان سب مخلوقات کو اپنا غلام و محکوم بنانے کے لیے بھیجا گیا ہے، تو اگر کسی کا غلام ہو سکتا ہے، تو وہ صرف اللہ کی ہستی ہے، اخیر میں یہی پیغام لے کر نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ پر اللہ کا یہ کلام نازل فرمایا گیا، جس میں انسان کو اس کا مرتبہ و مقام بتا کر دنیا کی تمام طاقتوں سے آزادی بخشی گئی ہے، باطل معبودوں کی غلامی سے نجات کا سامان کیا گیا ہے اور تمام مخلوقات کا اس کا غلام ہونا بیان کیا گیا ہے، شمس وقمر کی تسخیر آخر انسان کے لیے جو کر دی گئی، اس کا آخر مطلب ہی کیا ہے؟ یہی کہ یہ سب تیرے غلام ہیں تو کسی کا غلام نہیں، تو صرف اللہ کا غلام و بندہ ہے، یہ عظیم الشان آزادی کا پروانہ (قرآن مجید) اسی لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا، تو گویا یہ رات انسان کا یوم آزادی ہے، غرض یہ کہ اس رات میں یہ عظیم کلام نازل فرما کر انسانیت پر خدا تعالیٰ نے بے انتہا کرم فرمایا اور اس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا۔

ہزار مہینوں سے افضل:

لیلۃ القدر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہزار مہینوں سے زیادہ افضل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک رات میں نیکی اور عبادت کرنا، ایک ہزار مہینوں میں عبادت و نیکی کرنے سے افضل ہے، علمانے لکھا ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ میں ایک ہزار ماہ تک عبادت کرنے کا ثواب پاؤں، تو اس کو چاہیے کہ لیلۃ القدر میں عبادت کرے، ایک ہزار مہینوں کا حساب لگایا جائے تو (۸۳) تراسی برس چار مہینے ہوتے ہیں۔

چند فوائد

ایک یہ کہ لیلۃ القدر جس طرح افضل ہے، کیا اس سے متصل دن کو بھی یہی فضیلت حاصل ہے یا نہیں؟ امام شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہاں! اس سے متصل آنے والا دن بھی اسی طرح افضل ہے اور جمہور علما نے فرمایا نہیں، یہ فضیلت صرف رات کو حاصل ہے، البتہ رات کی طرح دن میں بھی عبادت میں سعی و کوشش بہتر ہے۔

دوسرے یہ کہ جمعہ کی رات لیلۃ القدر سے افضل ہے یا لیلۃ القدر اس سے بھی افضل ہے؟ ظاہرِ قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات تمام راتوں سے افضل ہے؛ حتیٰ کہ جمعہ کی شب سے بھی افضل ہے، نیز اس رات کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں قرآن مجید نازل ہوا، جو کسی اور رات کو حاصل نہیں، نیز لیلۃ القدر میں خصوصیت کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی فضیلت بتائی گئی ہے، جب کہ جمعہ کی رات کے لیے یہ بات نہیں ہے اور بعض علما (حنابلہ) اس بات کے قائل ہیں کہ جمعہ کی رات لیلۃ القدر سے افضل ہے؛ کیوں کہ جمعہ کے جو فضائل حدیثوں میں آئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ سید الایام ہے، لہٰذا اس کی شب بھی سید اللیالی ہونا چاہیے، اس سلسلے میں ایک متوسط و معتدل بات حنبلی عالم

ابوالحسن تیمی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ لیلۃ القدر جس میں قرآن نازل ہوا وہ جمعہ کی رات سے افضل ہے اور اس لیلۃ القدر کے بعد جو ہر سال لیلۃ القدر آتی ہے، اس سے جمعہ کی رات افضل ہے؛ مگر جمہور کے نزدیک لیلۃ القدر سب سے افضل ہے۔

تیسرے یہ کہ عیدِ قربان کی رات کی فضیلت میں جو حدیثیں آئی ہیں، ان کی بنا پر بعض علما نے لیلۃ القدر پر لیلۃ النحر کو افضل قرار دیا ہے؛ مگر جمہور علما نے آیات قرآنیہ کے پیش نظر اس کی تردید فرمائی ہے۔

نزول ملائک

لیلۃ القدر کی تیسری خصوصیت یہ کہ اس رات اللہ کے فرشتے زمین پر نازل ہوتے ہیں اور مومنین کے حق میں دعائیں کرتے ہیں، قرآن میں ہے کہ اس رات میں فرشتے اور روح اللہ کے حکم سے نازل ہوتے ہیں، اس جگہ روح سے مراد اکثر علما کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں اور بعض علما نے فرمایا کہ روح ایک عظیم فرشتہ ہے اگر وہ تمام زمین و آسمانوں کو نگل جائے تو ایک لقمہ ہو جائے گا۔ بعض نے فرمایا کہ روح سے فرشتوں کی ایک مخصوص جماعت مراد ہے جو فرشتوں کو بھی صرف اسی لیلۃ القدر میں نظر آتی ہے اور بعض نے فرمایا کہ روح وہ فرشتے ہیں، جو دیگر فرشتوں پر نگراں مقرر کیے گئے ہیں۔ (۱)

یہ فرشتے دنیا میں کیوں آتے ہیں؟ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

> ''یہ اس لیے آتے ہیں کہ اس رات میں عبادت کرنے کا جو ثواب اللہ نے رکھا ہے یہاں آکر اس کو پائیں؛ کیوں نکہ لیلۃ القدر کا یہ ثواب دنیا میں مقرر ہے، لہذا وہ آسمانوں سے اتر کر یہاں آتے اور عبادات میں مشغول

---

(۱) روح المعاني:۳۰/۲۲۵

ہوکر ثواب حاصل کرتے ہیں جیسے ہم میں سے بعض لوگ مکہ جاکر زیادہ ثواب حاصل کرتے ہیں۔"

اور علامہ عصام الدین رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فرشتے یہاں اس لیے آتے ہیں، کہ لیلۃ القدر کو پالیں؛ کیوں کہ لیلۃ القدر آسمانوں پر نہیں ہوتی ،اللہ تعالی نے اس جگہ فرشتوں کے نزول کا ذکر کرکے انسانوں کو ترغیب دی ہے، کہ جب اللہ کے فرشتے آسمانوں سے اس کو پانے یہاں آتے ہیں،تو تم یہیں رہ کر محروم کیوں ہوتے ہو؟ لہٰذا تم بھی عبادت میں مشغول رہو۔

"روح المعانی" میں ایک حدیث بہ حوالہ "غنیۃ الطالبین" نقل کی گئی ہے:

"لیلۃ القدر میں اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام سدرۃ المنتھی کے ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ زمین پر آتے ہیں اور ان سب کے ہاتھوں میں نور کی جھنڈیاں ہوتی ہیں، یہ فرشتے ان جھنڈیوں کو چار مقامات پر گاڑ دیتے ہیں، کعبۃ اللہ کے پاس، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس، بیت المقدس کے پاس اور کوہِ طور کے پاس، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام حکم دیتے ہیں کہ زمین پر منتشر ہوجاؤ، پس یہ فرشتے منتشر ہو جاتے ہیں اور ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔کوئی گھر، کوئی پتھر، کوئی کشتی نہیں چھوڑتے جہاں کوئی مومن بندہ یا مومنہ بندی ہو۔ سب جگہ چلے جاتے ہیں؛ مگر اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا خنزیر ہو، یا شراب ہو یا زنا کر کے کوئی ناپاک آدمی ہو یا جاندار کی تصویر ہو، یہ فرشتے اللہ کی تسبیح و تقدیس بیان کرتے اور امت محمدیہ کے لیے استغفار کرتے ہیں، جب صبح ہو جاتی ہے؛ تو آسمانوں کی

طرف چلے جاتے ہیں، (پھر آگے چل کر ہے) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے امت محمدیہ کے لیے میرے پاس ایسی چیزیں رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے قلب پر اس کا خطرہ گزرا۔"(۱)

غرض یہ اللہ کے فرشتے آسمانوں سے آتے اور امت کے لیے دعا کرتے اور استغفار کرتے ہیں، یہ بڑی عظیم خصوصیت لیلۃ القدر کی ہے۔

تقدیری فیصلوں کا اظہار

لیلۃ القدر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بندوں کی تقدیر کے فیصلے، فرشتوں کے سامنے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ چناں چہ فرمایا﴿مِنْ كُلِّ اَمْرٍ﴾ اس کی تفسیر میں صاحب "روح المعانی" نے لکھا ہے:

" اي من أجل كل أمر تعلق به التقدير في تلك السنة الى قابل و أظهره سبحانه و تعالىٰ لهم. قاله غير واحد."(۲)

(یہ فرشتے نازل ہوتے ہیں ہر اس امر کی وجہ سے جس کا تعلق اس سال سے آئندہ سال تک کی تقدیر سے ہو اور اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں پر اس کو ظاہر کیا ہو، یہ بات بہت سے علما نے بیان کی ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اس رات اللہ تعالیٰ بندوں کے متعلق تقدیری فیصلے، جو اس سال سے آئندہ سال تک کے لیے ہوتے ہیں، ان کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرما کر ان کے حوالہ کر دیتے ہیں تا کہ وہ ان کا نفاذ کریں، ﴿سُوْرَةِ الدُّخَانِ﴾ میں بھی اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

---

(۱) روح المعاني:۳۰/۲۲۵
(۲) روح المعاني:۳۰/۲۲۷

﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾. (الدخان:۴)

(اس رات میں ہر حکمت والے معاملے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔)

اس کی تفسیر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس رات (شب قدر) میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم (صادر) ہو کر طے کیا جاتا ہے (سال بھر کے معاملات جو سارے کے سارے ہی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جس طرح انجام دینے اللہ کو منظور ہوتے ہیں، اس طریقے کو متعین کر کے ان کی اطلاع متعلقہ فرشتوں کو کر کے ان کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔''(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''یعنی اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ کا فیصلہ ہماری طرف سے کیا جاتا ہے، جس کے معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمائے ہیں، کہ یہ رات جس میں نزول قرآن ہوا، یعنی شب قدر، اسی میں مخلوقات کے متعلق تمام اہم امور، جن کے فیصلے اس سال میں اگلی شب قدر تک واقع ہونے والے ہیں طے کیے جاتے ہیں، کہ کون کون اس سال پیدا ہوں گے، کون کون آدمی اس میں مریں گے؟ کس کو کس قدر رزق اس سال میں دیا جائے گا؟ یہی تفسیر دوسرے ائمہ تفسیر حضرت قتادہ، مجاہد، حسن وغیرہم سے بھی منقول ہے۔''(۲)

اوپر یہ لکھ چکا ہوں کہ یہ بات بہ قول ابن حجر؛ حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت

(۱) بیان القرآن:۲/۴۹۶

(۲) معارف القرآن:۷/۷۵۷

عکرمہ وغیرہم سے اسانید صحیحہ سے مروی ہے۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر فیصلوں کی رات ہے اور اللہ کے فرشتے اس رات ان فیصلوں کو لے کر دنیا میں آتے ہیں۔

ایک شبے کا جواب

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شب برأت کے سلسلے میں مشہور ہے کہ اس میں فیصلے ہوتے ہیں اور یہاں بتایا گیا ہے کہ لیلۃ القدر میں فیصلے ہوتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ شب برات میں فیصلوں کا ہونا بھی بعض احادیث میں وارد ہوا ہے اور ان میں سے اکثر روایات اگر چہ ضعیف ہیں؛ تاہم ان سب کا مجموعہ قوی ہے، جیسا کہ میں نے اس کی تحقیق اپنے ایک رسالہ'' احکامِ شعبان و شب برات'' میں کردی ہے اور ایک روایت ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالے سے ''صالح للاحتجاج'' بھی پیش کی ہے اور دونوں راتوں میں فیصلے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک رات میں فیصلے ہوتے ہیں اور ایک میں ان فیصلوں کا نفاذ ہوتا ہے۔

سلامتی کا نزول:

پانچویں خصوصیت لیلۃ القدر کی یہ ہے کہ اس رات کو سلامتی کی رات بتایا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿سَلَامٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾

(یہ رات صبح طلوع ہونے تک سلامتی ہی سلامتی ہے۔)

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس رات میں صرف سلامتی کے فیصلے ہوتے ہیں اور حضرت مجاہد نے فرمایا کہ یہ رات شیطان کی اذیت سے سالم ہوتی ہے، یعنی اس میں شیطان کسی کو تکلیف نہیں دے سکتا اور نہ وہ باہر نکل سکتا ہے۔(۱)

(۱) روح المعاني: ۳۰/ ۲۲۷

بعض نے فرمایا کہ یہ رات دوزخ اور قیامت کی ہولناکیوں سے نجات وسلامتی دینے والی ہے، وہ اس طرح کہ اس میں عبادت کرنے پر تمام گناہوں کی مغفرت کا وعدہ ہے، تو جو عبادت کرے گا وہ مغفور ہوگا اور جہنم سے محفوظ ہوگا۔

بعض نے فرمایا کہ اس رات اللہ کے فرشتے اہل اسلام کو سلام کرتے ہیں؛ اس لیے اس کو سلامتی کی رات کہتے ہیں۔ یہ پانچ خصوصیات لیلۃ القدر کی ہیں۔

لیلۃ القدر اور اختلافِ مطالع

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر کیا ہر جگہ ایک ہی وقت پر ہوتی ہے یا الگ الگ وقتوں پر ہوتی ہے، اس شبہ کی بنیاد اختلافِ مطالع ہے، کیوں کہ دنیا میں ایک وقت کسی جگہ رات ہوتی ہے تو دوسری جگہ دن ہوتا ہے؛ نیز کسی جگہ فجر طلوع ہوجاتی ہے اور دوسری جگہ ابھی رات کا حصہ باقی رہتا ہے۔ بعض جگہ رات داخل ہوجاتی ہے اور دوسری جگہ ابھی دن باقی رہتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ لیلۃ القدر سب جگہ ایک ہی وقت ہو؛ تو کسی جگہ رات کو ہوگی اور کسی جگہ دن کو اور دن کو لیلۃ القدر کیسے ہوسکتی ہے، وہ لیلۃ القدر نہ ہوئی بلکہ یوم القدر ہوا؟ اس پر حضرت علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں طویل بحث کی ہے، زیادہ صاف بات یہ ہے کہ لیلۃ القدر ہر علاقے میں اپنے اپنے وقت پر آتی ہے، ایک ہی وقت پر نہیں آتی، مثلاً کسی جگہ مغرب کا وقت ہوگیا اور لیلۃ القدر داخل ہوگئی اور دوسری جگہ ابھی مغرب کا وقت نہیں آیا، تو یہاں ابھی لیلۃ القدر کا آغاز نہیں ہوا، جب مغرب ہوگی تو لیلۃ القدر کا آغاز ہوگا۔ (وعلی ہذا القیاس)

لیلۃ القدر میں کیا کرنا چاہیے؟

لیلۃ القدر جس کی یہ فضیلتیں اور بڑائیاں بیان ہوئیں، ہمیں اس میں کیا کرنا

چاہیے؟اس میں ایک کام یہ کرنا ہے کہ اللہ کی عبادت میں مشغول رہیں۔

حدیث میں ہے کہ جو لیلۃ القدر میں قیام کرے ایمان وثواب کی نیت کے ساتھ؛تو اس کے سارے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔(۱)

دوسرے یہ کہ چوں کہ لیلۃ القدر کب آتی ہے،اس کا علم نہیں،لہٰذا اس کو تلاش کرنے کے لیے اعتکاف کرے جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

تیسرے یہ کہ اس کا علم ہو جائے،تو اللہ سے بخشش ومعافی کا سوال کرے(۲) یہ الفاظ ہوں تو بہتر ہے:

«اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا»

(اے اللہ!تو معاف کرنے والا ہے،معافی کو پسند کرتا ہے،لہٰذا ہم کو معاف فرما۔

بعض علما نے یہ فرمایا کہ اس رات میں دعا کرنا سب سے افضل ہے۔(واللہ اعلم)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور سارے مسلمانوں کو اس عظیم دولت سے مالا مال فرمائے،آمین۔

---

(۱) البخاري:۳۴

(۲) الترمذي: ۳۴۳۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی عید کا امتیاز

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل اسلام پر جو نعمتیں ورحمتیں مقدر ومقرر ہیں، ان میں سے عیدالفطر اور عید الاضحیٰ کے دو دن بھی ہیں، جو اہل اسلام کی مسرت وخوشی اور فرحت وانبساط کے لیے عطا کیے گئے ہیں، ویسے تو ہر قوم اور ہر ملت کے پاس عید کے دن مقرر ہیں اور ان میں وہ خوشی مناتے ہیں؛ مگر اسلامی عید، ایک خاص شان کی حامل ہے، جو اس کو دیگر اقوام وملل کی عیدوں اور تہواروں سے ممتاز کرتی ہے۔

اسلامی عید کا امتیاز

اسلامی عید کا سب سے پہلا امتیاز یہ ہے کہ ساری قومیں، کھیل تماشے اور لہو ولعب کو عید قرار دیتے ہیں اور اسلامی عید میں خدا کی عبادت واطاعت اور اس کا ذکر وفکر اصل ومقصود ہے۔ چناں چہ احادیث میں ہے:

«إن النبي صلى الله عليه وسلم خرج يوم الفطر فبدأ بالصلوة. ثم خطب الناس بعد فلما فرغ فأتي النساء فذكّرهن.»(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن سب سے پہلے اللہ کے حضور دوگانہ پیش کرتے، پھر لوگوں کو دین وشریعت کے احکام سے آگاہ فرماتے، مردوں سے فارغ ہوکر آپ عورتوں کو بھی وعظ ونصیحت فرماتے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:

«إن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يكبّر يوم الفطر من حين يخرج

(۱) البخاري، ۱/۱۳۱

من بیته حتی یأتي بالمصلی.» (۱)

آپ ﷺ عید کے دن گھر سے عید گاہ جانے تک (اللہ کی بڑائی و عظمت کے مظاہرے کے لیے) ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کی تکبیر بلند فرماتے۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھیے تو اندازہ ہوگا کہ اسلامی عید نام ہے، اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جانے، اس کے احکام و اوامر کی طرف توجہ کرنے اور متوجہ کرانے اور ان کی تعمیل کے لیے کمر بستہ ہو جانے اور اس کے ذکر میں سرشار رہنے کا۔

اس کے برخلاف، جاہلی اقوام کی عید، محض کھیل تماشا اور من مانی رسومات و خرافات کا نام ہے۔

مسلمانوں کی عید اللہ کا عطیہ ہے

اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے، کہ اور لوگوں کی عیدیں اور تہوار، ان کے خود ساختہ اصول اور من مانی رسوم کی پیداوار ہیں، اس کے پیچھے کوئی خدائی حکم و ہدایت موجود نہیں؛ اس کے برعکس اہل اسلام کی عید خدا کی طرف سے مشروع و مقرر ہوئی ہے اور بہ طور عطیہ و تحفہ عطا فرمائی گئی ہے۔ چناں چہ ''ابو داؤد'' میں حدیث ہے:

«قدم رسول الله ﷺ المدینة ولهم یومان یلعبون فیهما، فقال: ما هذان الیو مان قالوا: کنا نلعب فیهما في الجا هلیة، فقال رسول اللّٰه ﷺ: إن اللّٰه أبدلکم بهما خیراً منهما یو م الأضحی و یوم الفطر».

(جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے؛ تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ دو دن عید مناتے ہیں، جن میں خوب کھیلتے اور ناچتے ہیں، آپ نے پوچھا کہ یہ

(۱) الدار قطني:۲/۴۴

دو دن کیا ہیں (جن میں تم خوشی مناتے ہو؟) انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ جاہلیت کے زمانے سے ہم ان دونوں دنوں میں (عید مناتے) اور کھیلتے ہیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے ان دو دنوں کے بدلے تم کو ان سے بہتر دن عطا فرمائے ہیں، ایک عید الاضحیٰ اور دوسرے عید الفطر۔)(۱)

اس حدیث میں غور کیجیے کہ زمانۂ جاہلیت کے ایامِ عید کی حقیقت، مدینہ والے صرف یہ بتا سکے کہ ہم جاہلیت کے زمانے ہی سے ان میں کھیلتے کودتے آرہے ہیں، یہ عید کا خلاصہ تھا، کیوں؟ اس لیے کہ یہ حکم خداوندی اور فرمان نبوی کی بنیاد پر نہ تھی، بل کہ من مانی عید تھی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے دو دن مقرر فرمائے اور اللہ کی طرف سے مقرر فرمائے اور ان ایام کو خیر و خوبی والے ایام قرار دیا، یہ اسلامی عید کی دوسری خصوصیت اور دوسرا امتیاز ہے۔

روحانی مسرت

تیسرا امتیاز یہ ہے کہ دیگر اقوام کی عید محض ظاہری مسرت وخوشی کا نام ہے، اس لیے وہ صرف کھانوں اور کپڑوں کی عمدگی ونفاست میں اپنی عید سمجھتے ہیں، اگر عمدہ کھانا نہ ہو اور عمدہ کپڑے نہ ہوں، تو ان کی عید، عید نہیں اور اہل اسلام کی عید نہ کھانوں پر موقوف اور نہ کپڑوں کی محتاج اور نہ زیب وزینت کی طالب، وجہ یہ ہے کہ ان کی عید تو روح کو خوشی ومسرت کا پیغام دیتی ہے اور یہ اللہ کی طرف سے رضا اور مغفرت کا پروانہ ملنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے:

عید گاہ جانے والوں اور عید منانے والوں کو اللہ تعالیٰ اس طرح لوٹاتے ہیں کہ اللہ ان سے راضی ہوتا ہے اور سارے گناہ بخش دیتا ہے۔ (۲)

(۱) أبو داود:۱/۱۶۱
(۲) مشکوۃ:۱۸۲

یہ ہے اصل خوشی و مسرت جو بندۂ مومن کو عید کے دن حاصل ہوتی ہے۔

اصل عید کیا ہے؟

اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عید تو اس کی ہے، جس کے روزوں کو اللہ نے قبول کرلیا اور جس کی نماز کو منظور فرمالیا اور ہر وہ دن جس میں خدا کی نافرمانی نہ کی جائے، وہ عید کا دن ہے۔(۱)

اور بعض حضرات نے عید کی اصل وحقیقت کو بڑے عمدہ اسلوب میں یوں بیان کیا ہے:

لیس العیدلمن لَبِس الجدید	إنماالعیدُلمن اَمِنَ من الوعید
لیس العید لمن تبخر بالعود	إنما العیدُ لمن تاب ولا یعود
لیس العید لمن تزیّن بزینۃ الدنیا	إنما العید لمن تزوّد بزادالتقوی
لیس العید لمن رکب المطایا	إنما العید لمن ترک الخطایا

(عید اس کی نہیں جس نے نیا لباس پہنا؛ بل کہ عید تو اس کی ہے جو، وعید و عذاب سے بچ گیا۔ اور عید اس کی نہیں جو عود کی خوشبو سے معطر ہوگیا؛ بل کہ عید اس کی ہے جس نے توبہ کیا اور پھر گناہ نہ کیا۔ اور عید اس کی نہیں جس نے دنیوی زینت سے اپنے کو مزین کرلیا؛ بل کہ عید تو اس کی ہے جس نے تقویٰ کا توشہ تیار کرلیا۔ اور عید اس کی نہیں جو سواریوں پر سوار ہوا؛ بل کہ عید اس کی ہے جو گناہوں کو ترک کردے۔)

ایک بزرگ نے اپنے شہر میں لوگوں کو عید کے دن کھیل کود کرتے اور رنگ برنگے کپڑوں میں گھومتے پھرتے دیکھا اور وہ اس حال میں بھی علام الغیوب سے

(۱) شرح نہج البلاغۃ:۹۴۳

ایک لمحہ بھی بے خبر نہ ہوتے تھے اور انھوں نے اس موقعے پر عید کی حقیقت سے متعلق یہ عجیب وغریب اشعار پڑھے:

الناس کلهم للعيد قد فرحوا   وقد فرحت أنا بالواحد الصمد
الناس كلهم للعيد قد صبغوا   وقد صبغت ثياب الذل والكمد
الناس كلهم للعيد قد غسلوا   وقد غسلت أنا بالدمع للكبد

(سارے انسان عید کی خوشی منا رہے ہیں اور میں اللہ واحد الصمد سے خوش ہوں، سارے لوگ عید کے لیے خوشبوئیں لگا کر آئے ہیں اور میں نے ذلت اور بدلی ہوئی رنگت والے کپڑوں کا رنگ لگا لیا ہے، سارے لوگ عید کے لیے غسل کر کے آئے ہیں اور میں نے دل کو آنسوؤں سے غسل دیا ہے۔(۱)

غرض یہ ہے کہ اصل عید تو ان کو حاصل ہوتی ہے جنھوں نے عید کے دن اللہ کی طرف سے مغفرت ومعافی کا پروانہ حاصل کرلیا، نہ کہ ان کو جو صرف کپڑوں کی، کھانوں کی اور زیب وزینت کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

اسلامی عید میں اتحاد کا مظاہرہ

اسلامی عید جو ہماری روحانی مسرتوں اور شادمانیوں کا سب سے بڑا موقعہ ہے، یہ ہر سال آتی اور اپنی بہار دکھا کر چلی جاتی ہے؛ مگر اس کی طرف بہ غور دیکھنے سے اور اس سلسلے کی تعلیمات پر توجہ دینے سے معلوم ہوگا کہ وہ ہمیں ان مسرتوں اور شادمانیوں کے ساتھ ایک خاص پیغام بھی دیتی ہے۔

حکم یہ ہے کہ عید کی نماز سارے شہر والے کسی ایک جگہ جمع ہو کر پڑھیں، اگرچہ ضرورت کے لیے یہ بھی جائز ہے، کہ ایک شہر میں متعدد جگہ عید ادا کی جائے، مگر یہ ایک

(۱) بحر الدموع (مترجم):۲۹

ضرورت کی بناء پر ہے، ورنہ اصل حکم یہی ہے کہ سب ایک جگہ جمع ہوں، کالے بھی اور گورے بھی، غریب بھی اور مالدار بھی، بادشاہ بھی اور محکوم بھی، اونچے طبقہ والے بھی اور نچلے طبقہ والے بھی، عالم بھی اور جاہل بھی، غرض بلا کسی تفریق واختلاف کے تمام کے تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہوں، پھر ایک اللہ کے سامنے، ایک نبی کے طریقہ پر، ایک امام کی متابعت واقتداء میں سب کے سب نماز ادا کریں، نہ کوئی بندہ رہے نہ بندہ نواز، سب کے سب ایک ہی طریقہ کی صفوں میں کھڑے ہوں۔

یہ نماز عید کا پرشکوہ وحسین منظر ایک طرف حسن ترتیب وحسن عمل کی بناء پر دعوت نظارہ دیتا ہے تو دوسری طرف اہل اسلام کے اتحاد ویکسانیت کے پرشکوہ مظاہرہ کی وجہ سے غیر اقوام کے دلوں میں رعب وہیبت پیدا کر دیتا ہے، یہ ہے عید کی مشروعیت کا ایک اہم ترین مقصد۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کا ایک مقصد مقاصد شرع میں سے یہ ہے کہ ہر ملت اپنی شان وشوکت اور اپنی کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتی ہے، اسی طرح عید کو مشروع کر کے ان کی شان وشوکت وکثرت کا مظاہرہ کرایا جاتا ہے۔ (۱)

عیدگاہ جانے اور آنے کی ایک عجیب سنت

اور یہی اتحاد وقوت وشوکت اور کثرت کا مظاہرہ ہے جس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اور سنت اختیار فرمائی اور ہمارے لیے مشروع فرمائی کہ جب عیدگاہ جاتے تو ایک راستہ اختیار کرتے اور واپس آتے تو دوسرے راستے سے آتے تھے۔ (۲)

(۱) حجة الله البالغة:۲/۳۱

(۲) البخاري:۱/۱۳۱

اس کی متعدد حکمتیں اور وجوہات علماء نے بیان کی ہیں۔

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے جو ابھی عرض کی گئی کہ جب ایک راستہ سے جائیں گے اور دوسرے سے آئیں گے تو ہر راستہ پر مسلمان ہی مسلمان نظر آئیں گے اور اس سے کفار کے قلوب پر رعب و دبدبہ قائم ہوگا اور مسلمانوں کی کثرت و شوکت اور ان کی قوت و طاقت کا مظاہرہ ہوگا۔

توجہ کے قابل

اب غور فرمایئے کہ اسلام ہماری عید کے ذریعہ ہماری قوت و طاقت کا سکہ غیر اقوام پر بٹھا دینا چاہتا ہے اور ہماری شوکت وعظمت کا مظاہرہ کرانا چاہتا ہے مگر ہم آپس کے اختلافات اور معمولی باتوں پر ایک دوسرے کی مخالفت اور اختلافی مسائل کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تفسیق وتکفیر، توہین وتذلیل کر کے اپنی ساری قوت وطاقت کو توڑنے میں مشغول ہیں اور اپنی کمزوری کا مظاہرہ کرر ہے ہیں، بلکہ بعض لوگ امت میں تفریق کرنے اور آپس میں اتحاد کو توڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اشتہارات و پمفلٹوں کے ذریعہ فتنہ پروری میں لگے ہوئے ہیں، کسی کو کافر کہہ کر، مرتد و زندیق کہہ کر لوگوں کے دلوں میں بغض وعداوت پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کبھی مباحثہ اور مناظرہ کی دعوت دے کر اور کبھی گالیوں اور دھمکیوں سے کام لے کر امت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ذرا اللہ کے لیے تو سوچو کہ یہ کام امت کو کس قدر کمزور کرر ہا ہے۔

لہٰذا عید کے اس مبارک موقعہ پر ہمیں ہماری قوت وشوکت کا، عظمت وطاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنا چاہئے۔

فسطائیت کا جواب

اور یہ تمام فسطائی قوتوں اور طاقتوں کا جواب لاجواب ہے، یہ ان کی کمر توڑ دے گا، ان کے منصوبوں پر پانی پھیر دے گا، ان کے قلوب میں دبدبہ ورعب بٹھا دے گا، آج ساری فسطائی طاقتیں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف برسر پیکار ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان کمزور ہوں، ان کے درمیان پھوٹ پڑ جائے اور ان کی طاقت ٹوٹ جائے، ایسے موقعہ پر تو ہمیں چاہیئے کہ ہماری قوت وطاقت اور اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کریں، عید کے ذریعہ ہمیں یہی سبق دیا گیا ہے ورنہ محض عبادت تو مسجدوں میں بھی ہوسکتی ہے اور گھروں میں بھی ہوسکتی ہے۔

اللہ کرے کہ ہمیں یہ سبق یاد ہوجائے اور ہم اسلام کی بلندی کی خاطر اتفاق و اتحاد کی راہ اپنائیں۔ (آمین یارب العالمین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عید کی تیاری اور ہماری بے اعتدالی

تمہید

ابتدائے آفرینش سے اب تک برابر اور تسلسل کے ساتھ روحانیت سے مادیت ٹکرانے اور اس کو مغلوب کرنے کی کوشش میں ہے اور جب تک روحانیت کے دعویدار، صرف دعویدار نہیں؛ بل کہ درحقیقت روحانیت کے علم بردار بھی رہے، مادیت کو غالب آنے کا موقعہ نہ ملا، اور وہ ہمیشہ ایسے مواقع پر ناکام اور مغلوب ہی ہوئی اور رہی؛ مگر جب روحانیت کے علم بردار یکے بعد دیگرے اپنے اصلی مقام کی طرف کوچ کر گئے اور سوائے چند کے سب کے سب صرف دعویدار رہ گئے، جن کی زبانوں پر تو روحانیت کے گیت اور ترانے ہیں مگر دل اس کی حقیقت وعظمت سے خالی، تو مادیت کو سر اٹھانے اور نہ صرف سر اٹھانے؛ بل کہ روحانیت پر چڑھ بیٹھنے کا بھی بھرپور موقع مل گیا اور پھر اس نے اس قدر غلبہ اور تسلط حاصل کرلیا، کہ لوگ مادیت ہی کو روحانیت سمجھ بیٹھے۔

میں اس کی مثال میں عنوان کی مناسبت سے ”عید“ کو پیش کرتا ہوں، کہ عید در اصل کیا تھی؟ اور آج ہم نے اس کا کیا تصور قائم کرلیا ہے، ہمارے نزدیک عید کپڑوں اور کھانوں، کھیل، تماشوں، سیر اور تفریح بازیوں کا نام ہے، جو سب کی سب مادی اور فانی چیزیں ہیں، جبکہ اسلام عید کا جو تصور پیش کرتا ہے، وہ روحانیت سے ہم کنار کرتا ہے، پھر

اس غلط تصور کے نتیجے میں کیا کیا بے اعتدالیاں اور گمراہیاں پھیل رہی ہیں؟ یہ ایک طویل الذیل داستان ہے، میں اس مختصر تحریر میں ان ہی باتوں کی طرف کچھ اشارے دینا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حقیقت کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اسلامی عید کی حقیقت

سب سے پہلے یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اسلامی عید کی حقیقت کیا ہے؟ ایک حدیث سے اس پر بہ خوبی روشنی پڑتی ہے، ایک طویل حدیث میں ہے کہ جب عید کی صبح ہوتی ہے، تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو تمام شہروں میں بھیجتے ہیں اور فرشتے اتر کر تمام گلیوں اور راستوں پر کھڑے ہو جاتے اور پکار کر کہتے ہیں کہ اے امتِ محمد یہ اس کریم رب کی درگاہ کی طرف چلو، جو بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے اور بڑے بڑے قصور معاف کر دیتا ہے، پھر جب لوگ عیدگاہ کی طرف نکلتے ہیں، تو حق تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ اس مزدور کا کیا بدلہ ہے، جس نے پورا کام کیا ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں، کہ اس کا بدلہ یہ ہے کہ اس کی مزدوری پوری دی جائے، اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے فرشتو! گواہ رہو کہ میں نے رمضان کے روزے اور تراویح کے بدلے ان لوگوں کو اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی، پھر آخر حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے فرماتے ہیں کہ اب تم بخشے بخشائے لوٹ جاؤ میں تم سے راضی ہو گیا۔(۱)

اس حدیث پر غور کیجیے کہ اس سے عید کی حقیقت کیا نکلتی ہے:

پہلی بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ فرشتے اس دن پکار کر کہتے ہیں، کہ اپنے رب کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا کرنے اور بڑے گناہوں کو بھی بخش دینے والا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ عیدگاہ جانے والوں کو اپنی رضا اور

---

(۱) مشکوۃ :۱۸۱

مغفرت کا پروانہ عطا فرماتے ہیں۔

مگر یہ سب کن لوگوں کے لیے؟ ان کے لیے جنھوں نے رمضان میں کام پورا کردیا ہو اور روزے اور تراویح کا اہتمام کیا ہو، جیسا کہ خود حدیث سے ظاہر ہے۔

ان سب باتوں کو ملانے سے پتا چلا کہ عید دراصل رمضان کی طاعتوں اور نیکیوں کا بدلہ دیئے جانے کا دن ہے اور وہ بدلہ دو چیزوں کی شکل میں ملتا ہے:

ایک یہ کہ گناہوں کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ دوسری اللہ کی رضا مندی حاصل ہوتی ہے اور اسی اللہ کی رضا مندی اور مغفرت پر خوش ہو جانے اور مسرت منانے کو عید کی خوشی کہا جاتا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ کا ارشاد

اسی حقیقت کو علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ نے بڑے بلیغ انداز میں پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

”عید خوشی اور مسرت کا نام ہے اور اہل دنیا کے نزدیک ہر قسم کا سرور و انبساط اور ہر طرح کی فرحت و ابتہاج عید کے مترادف ہے؛ لیکن شریعت مقدسہ اور ملت بیضا کی نظر میں عید اس مسرت و خوشی کو کہتے ہیں، جو نعما ربانی و کرم ہائے الٰہی کے شکر اور اس کے فضل و جود پر ادائے نیاز کے لیے کی جاتی ہے، دنیا خود فانی ہے اور اس کے باغ و بہار فانی؛ پھر اس پر کیا مسرت و انبساط؟ جس سرور کے بعد غم ہو اور جس خوشی کے بعد غم ہو، تو ایسے سرور کو عید کہنا ہی غلط ہے۔“(۱)

---

(۱) ملفوظات محدث کشمیری رحمۃ اللہ: ۳۵۲

حاصل یہ کہ اسلامی عید تو اللہ کی عظیم نعمتوں جیسے رضا و مغفرت اور پھر اس سے قبل نیکیوں کی توفیق پر خوشی اور مسرت کا نام ہے، نہ کہ دنیا کی فانی چیزوں پر خوشی و مسرت کا نام۔ جیسے: کھانوں، کپڑوں، زیب و زینت کی چیزوں، سیر و تفریح بازیوں کی خوشی، یہ اہل دنیا کی اور مادیت پرستوں کی عید ہے اور روحانیت کے علم برداروں کی عید، ان مادی و فانی چیزوں میں نہیں، رضا و مغفرت کی روحانی نعمتوں میں ہے۔

اسلامی عید کی تیاری

اس کے بعد اب اس پر توجہ دینی ہے کہ اس عظیم الشان عید کی تیاری کیا اور کیسی ہونی چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اس کی تیاری اس طرح ہونا چاہیے کہ رمضان مبارک کی نور بار گھڑیوں اور مبارک ساعتوں کو اللہ کی رضا جوئی، خوف و خشیت الٰہی، عبادت و طاعت، جود و سخاوت، ذکر و تلاوت، روزہ اور نماز، تراویح و اعتکاف میں خرچ کیا جائے اور تقویٰ و طہارت کی اسپرٹ اور روح اپنے اندر پیدا کر لی جائے؛ تا کہ عید کے دن جب درگاہِ خداوندی میں حاضری ہو، تو محنتی مزدوروں میں ہمارا شمار ہو اور ہمیں پورا پورا اجر و بدلہ یعنی رضا و مغفرت کا پروانہ مل جائے اور ہم کام چور مزدوروں میں شمار ہو کر مردود نہ ہو جائیں۔

عید محنتی مزدوروں کا بدلہ

کیوں کہ اوپر جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں یہ بات موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں:

”اس مزدور کا کیا بدلہ ہے، جس نے کام پورا کیا ہو؟“

معلوم ہوا کہ بدلہ اس مزدور کو دیا جاتا ہے، جس نے کام کیا ہو اور جس نے

لاپروائی وغفلت شعاری کا مظاہرہ کیا ہو، وہ اس قابل ہی نہیں ٹھہرتا کہ اس کو بدلہ دیا جائے، دنیا میں بھی یہی قاعدہ واصول جاری ہے، کہ محنتی مزدور کو اجرت دی جاتی ہے؛ بل کہ زیادہ محنتی ہو، تو اجرت کے علاوہ انعام بھی دیا جاتا ہے اور جو مزدور کام نہ کرے، اس کو اجرت تو کیا دی جاتی بل کہ الٹا عتاب ہوتا ہے کہ کام کیوں نہ کیا؟

اسی طرح ہم سب مزدور ہیں اللہ تعالیٰ کے، رمضان میں ہم پر کچھ ذمے داری رکھی گئی ہے، اگر اس کو پورا کیا گیا تو اجرت وانعام ملے گا؛ ورنہ عتاب وعذاب ہوگا۔

عید ہماری ذمے داری اور ڈیوٹی

رمضان میں ہم پر کیا ذمے داری عائد کی گئی ہے؟

اس میں ایک ذمے داری تو روزوں کی ہے، کہ اللہ نے روزہ کو فرض قرار دیا ہے۔ دوسری ذمے داری رات میں قیام یعنی تراویح کی ہے، جو سنت مؤکدہ ہے۔ تیسرے آخری عشرے کا اعتکاف ہے، جو علی الکفایہ سنت مؤکدہ ہے۔ ان کے علاوہ نفلی طور پر تلاوت کلام اللہ اور ذکر اللہ وغیرہ بھی ہیں۔ یہ تو کرنے کے کام ہیں۔ اور بعض کام ایسے بھی ہمارے ذمے ہیں، جو نہ کرنے کے ہیں: جھوٹ، غیبت، لڑائی وجھگڑا وغیرہ حرام وناجائز کاموں سے بچنا اور پرہیز کرنا بھی لازم وضروری اور ہماری ذمے داری ہے۔

اگر کوئی شخص ان ذمہ داریوں کو نباہتا اور پورا کرتا ہے، تو وہ ''اللہ کا محنتی مزدور'' ہے اور عید کے دن بھرپور بدلہ پانے کا مستحق ہے اور جو شخص ان ذمے داریوں کو انجام نہیں دیتا، وہ اس کا مستحق نہ ہوگا، کہ بدلہ دیا جائے کیوں کہ وہ محنتی مزدور نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد

اسی بات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، جس کو ''نهج البلاغة'' میں جو کہ

آپ کے ملفوظات و مواعظ کا مجموعہ کہا جاتا ہے، اس میں نقل کیا ہے۔

آپ نے کسی عید کے موقعے پر فرمایا:

«إنما العيدُ لمن قَبِلَ الله صيامه، و شكر قيامه، و كل يوم لايعصى الله فيه؛ فهو عيد.» (۱)

(عید تو اس کی ہے، جس کے روزوں کو اللہ نے قبول فرما لیا ہو اور اس کی نماز کو منظور کر لیا ہو اور ہر وہ دن جس میں اللہ کی نافرمانی نہ کی جائے وہ عید کا دن ہے)

معلوم ہوا کہ جس نے روزوں کا حق ادا کر کے ان کو اس قابل بنا دیا، کہ وہ خدا کی نظر میں مقبول ہوں اور نمازوں کے حقوق کی رعایت کر کے ان کو ایسا بنا دیا، کہ خداوند تعالیٰ کے یہاں شرف قبولیت سے نوازی جائیں، تو عید کا دن اس کے لیے حقیقی مسرت کا دن ہوگا، اسی طرح بندہ خدا کی معصیت و نافرمانی کر کے خدا کو ناراض نہ کرے، تو ہر ایسا دن اس کے لیے عید ہے، جس میں خدا اس سے راضی ہے؛ ورنہ خدا کو ناراض کر کے اس کو کیا خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟!

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ عید کے دن جا رہے تھے، کہ ایک جگہ چند لوگوں کو ہنستا کھیلتا دیکھا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کو گھوڑ دوڑ کے میدان کی طرح بنایا ہے تا کہ بندے طاعت و عبادت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں، پس ایک قوم آگے بڑھی اور ایک گروہ پیچھے رہ گیا۔ تعجب ہے ان پر جو ہنستے کھیلتے ہیں، اس دن میں جس میں بعض لوگ عبادت میں آگے بڑھنے کی وجہ سے کامیاب ہو گئے اور بعض لوگ پیچھے رہ جانے کی وجہ سے گھاٹے میں رہے، جب حقیقت سے پردہ اٹھے گا؛ تو

(۱) شرح نهج البلاغة :۹۴۴

مقبول لوگ خوش ہوں گے اور مردود لوگ غم میں مبتلا ہوں گے۔ (۱)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے ان جملوں سے اسی طرف اشارہ کیا ہے، کہ عید کے دن خوش تو اس کو ہونا چاہیے جس نے رمضان میں بھاگ دوڑ کی ہو اور طاعت وعبادت کر کے مقبول بندوں میں شامل ہو گیا ہو، اگر ایسا نہیں کیا؛ تو پھر عید کا دن تو اس کی محرومی کا دن ہے اور غم منانے کا دن ہے؛ اس لیے کہ وہ انعام خداوندی سے محروم ہے اور محروم کیا خوشی منائے؟

رمضان میں ہماری غفلت

حاصل یہ کہ عید اصل میں اسی کی ہے، جو رمضان میں طاعات وعبادات، ریاضات و مجاہدات میں لگ کر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے؛ مگر افسوس کہ آج ہم نے رمضان مبارک میں بھی غفلت شعاریوں اور طاعت وعبادت سے بے رغبتیوں کا وہی طریقہ اختیار کر رکھا ہے، جو غیر رمضان میں ہوتا ہے؛ بل کہ اس سے بڑھ کر یہ کہ رمضان کو دنیا میں زیادہ انہماک اور مشغولی کا مہینہ بنا لیا ہے، اس لیے دیکھا جاتا ہے، کہ لوگ رمضان میں زیادہ کمائی کی فکر کرتے ہیں، جو لوگ سال بھر روزانہ رات میں ۹/ یا ۱۰/ بجے اپنی دکانیں بند کر دیتے ہیں، وہ رمضان میں ۱۲/ بجے؛ بل کہ بعض دو تین بجے تک اس میں مشغول رہتے ہیں، رمضان کی راتیں عبادت وطاعت کے نور سے فضا کو منور کرنے آتی ہیں؛ مگر یہاں بجلی کے قمقموں سے بازاروں کی زینت کا سامان کیا جاتا ہے اور لوگ عبادات کو چھوڑ کر بازاروں کی سیر وتفریح اور وہاں خرید و فروخت میں مشغول نظر آتے ہے اور اس میں خاص طور پر عورتوں کا بڑا حصہ

(۱) کیمیائے سعادت: ۹۵، احیاء العلوم: ۱/ ۲۳۶

ہے اور یہ سب کچھ عید کی تیاری کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔

عید کے لیے ہماری تیاری کا حال

یہ تیاری کیا ہوتی ہے؟ صرف یہ کہ عمدہ لباس و پوشاک ،بہتر سے بہتر جوتے، اعلیٰ ترین کھانوں کا انتظام یا ان چیزوں کی خاطر کمانے اور زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر،بعض لوگ ہر ہر چیز نئی خریدنے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خریدنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی میں سارا مہینہ خرچ ہو جاتا ہے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، یہ عید کی تیاری نہیں ہے۔اسلام میں عید کی تیاری وہ ہے،جس کو ابھی عرض کیا کہ عبادات وریاضات سے تیاری کی جائے،نیکیوں سے تیاری کی جائے،صدقہ اور خیرات سے تیاری کی جائے اور روحانی خوشی ومسرت کا انتظام کیا جائے۔

ہاں !اس روحانی مسرت کے اظہار کے لیے ظاہری طور پر نئے لباس و پوشاک اور عمدہ کھانوں کا اہتمام،اعتدال کے ساتھ کرلیا جائے تو حرج نہیں ؛مگر اصل کی فکر کو چھوڑ کر صرف ان ہی کے پیچھے پڑ جانا کوئی عقل مندی نہیں۔

عید الفطر

احادیث وفقہ کی روشنی میں

عید الفطر، اہل اسلام کی عظیم الشان عید ہے، جو رحمتوں اور برکتوں کو لے کر وارد ہوتی ہے، اگر چہ ہر قوم وملت کے پاس کچھ دن ضرور ایسے ہوتے ہیں، جن میں وہ عید مناتے اور خوشی ومسرت کا اظہار کرتے ہیں، مگر اسلامی عید سب سے نرالی وعجیب ہوتی ہے؛ غیر اقوام کی عید بے حیائی وبے شرمی کے مظاہروں، مجرمانہ کھیل تماشوں اورغفلت شعاریوں پر مشتمل ہوتی ہے، جب کہ اسلامی عید خدا کی خوشنودی ورضا طلبی کے جذبات سے پُر ہوتی ہے، بہترین اخلاق وپاکیزہ اوصاف کے مظاہروں پر مشتمل ہوتی ہے، انابت وتوجہ الی اللہ، للہیت واخلاص، طاعت وعبادت، خشوع وخضوع کی کیفیات سے معمور ہوتی ہے اور آپسی ہم دردی وغم خواری، محبت ومودت، صلہ رحمی وحسن سلوک کی ضامن ہوتی ہے، اسی عید کے متعلق احادیث وآثار اور فقہ اسلامی کی روشنی میں چند احکامات کو مرتب کیا گیا ہے اور سرسری مطالعہ سے جو روایات سامنے آئیں ان کو لکھ دیا ہے، اگر چہ احکامات اور بھی بہت سے ہیں۔

اہل اسلام کے لیے عید کے دو دن

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو وہاں کے لوگوں کے نزدیک دو دن ایسے تھے؛ جن میں وہ کھیل تماشے میں مشغول ہوتے، آپ نے پوچھا کہ یہ دو دن کیا ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ان میں ہم زمانۂ جاہلیت سے کھیلا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

«إن الله قد أبدلكم بهما خيرا منهايوم الأضحى ويوم الفطر.» (۱)

(اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ان دو دنوں کے بدلے دوسرے دن ان سے بہتر عطا فرمائے ہیں: ایک: عید الفطر، دوسرے: عید الاضحیٰ۔)

معلوم ہوا کہ اہل اسلام کی عید کے یہ دو دن ہیں۔ ایک عید الفطر کا دن، دوسرے عید الاضحیٰ کا دن اور یہ دو دن تمام قوموں اور ملتوں کے ایام عید سے بہتر وافضل ہیں، اس میں عید کے دن کے لیے خیر کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ ان ایام میں ہر طرح کی بھلائی وخوبی خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔

عید کے دن تجمل وزینت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن لال چادر پہنتے تھے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ عید کے دن زینت وتجمل کا اختیار کرنا سنت ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن لال چادر کا اہتمام فرماتے تھے اور اس لال چادر سے مراد ایسی چادر ہے، جس میں لال لال دھاریاں ہوں، پوری لال اس سے مراد نہیں ہے، جیسا کہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں بیان فرمایا ہے۔

اور اس تاویل کی ضرورت اس لیے پڑی کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ لال لباس مرد کے لیے منع ہے مثلاً: حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ پر ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو معصفر کپڑے دیکھے، تو فرمایا کہ یہ کفار

---

(۱) ابو داود:۱/۱۶۱،نسائی:۱/۲۳۱،اس کی سند صحیح ہے،بلوغ المرام:۳۵
(۲) مجمع الزوائد:۱/۲۲۱

کے کپڑے ہیں، ان کو مت پہنا کرو! حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں ان کو دھودوں؟ فرمایا کہ نہیں بل کہ ان کو جلا دو۔(۱)

اور معصفر کپڑا عموماً لال ہی ہوتا ہے چناں چہ "فتح الباری" میں ہے:

«فإن غالب مایصبغ بالمعصفر یکون أحمر.»(۲)

بہ ہر حال حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ عید کے دن زیب و زینت کا اہتمام کرنا چاہیے، مگر اس میں غلو نہ کرے، کہ صرف کپڑوں اور جوتوں کی فکر میں پڑا رہے؛ بل کہ اپنے کپڑوں میں سے جو عمدہ ہیں، ان کو استعمال کرے جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا معمول امام بیہقی نے بہ سند صحیح نقل کیا ہے، کہ وہ عیدین میں اپنے سب سے عمدہ و بہتر کپڑے زیب تن فرماتے تھے۔(۳)

تنبیہ: عید کے دن نئے کپڑے ہی پہننا چاہیے، اس کا کوئی ذکر احادیث میں نہیں ملتا اور نہ فقہا کے کلام میں ملتا ہے، احادیث و آثار صحابہ سے؛ نیز حضرات فقہا کی عبارات سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اپنے عمدہ کپڑے پہنے، لہٰذا آج عام رواج جو ہو گیا ہے، کہ عید کے لیے نئے کپڑے ہی ضروری سمجھے جاتے ہیں، اس کی اصلاح کرنا چاہیے۔

عید کے دن غسل کا استحباب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت فاکہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«کان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یغتسل یوم الفطر و یوم الأضحی.»

---

(۱) مسلم:۲/۱۹۳

(۲) فتح الباري:۱۰/۳۰۵

(۳) فتح الباري:۲/۴۳۹

(رسول اللہ ﷺ عیدالفطر و عیدالاضحیٰ کے دنوں میں غسل فرمایا کرتے تھے۔)(۱)

فقہا کرام نے بھی لکھا ہے کہ عید کے دن غسل کرنا مستحب ہے؛ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ عید کے دن غسل فرماتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح جمعہ کے دن اجتماع ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے احادیث میں غسل کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، اسی طرح عید میں بھی اجتماع ہوتا ہے، تو عید کے دن بھی اس بنا پر پاکی صفائی کا اہتمام پسندیدہ ہے۔ (۲)

فقہا میں سے مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ، عید کے دن غسل کو مستحب قرار دیتے ہیں اور احناف میں سے بھی بعض نے اپنی کتب میں اس کو مستحب شمار کیا ہے۔ جیسے "کنز الدقائق"، "المنار" وغیرہ میں ہے اور جمہور علما حنفیہ کے نزدیک غسل عیدین سنت ہے۔ (۳)

اور اسی کے ساتھ عطر و خوشبو کا استعمال بھی مستحب ہے، جیسا کہ " الفقہ علی المذاهب" میں ہے کہ یہ مالکیہ، حنابلہ و شافعیہ کے نزدیک مستحب ہے اور حنفیہ کے نزدیک سنت ہے۔

عیدگاہ جانے سے پہلے کھجور کھانا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كان رسول الله ﷺ لايغدو يوم الفطر حتى يأكل تمرات.»

---

(۱) ابن ماجه:۹۳

(۲) قاله صاحب الهداية:۱/۱۵۳

(۳) الفقه على المذاهب الأربعة:۱/۳۵۰

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن نہیں جاتے تھے، جب تک کہ کھجور نہ کھاتے تھے۔)(۱)

اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن نہیں نکلتے تھے، جب تک کہ نہ کھا لیتے اور عید الاضحیٰ میں کھاتے نہیں تھے، جب تک کہ عید کی نماز نہ پڑھ لیتے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ عید الفطر میں عیدگاہ جانے سے قبل کچھ کھا لینا سنت ہے، بہتر یہ ہے کہ کھجور کھائیں اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین، پانچ یا سات کھجور کھاتے تھے یا اس سے کم یا زیادہ، مگر طاق عدد استعمال فرماتے تھے۔ (۳)

لہٰذا طاق عدد کھجور استعمال کیے جائیں اور بعض علما نے مطلق میٹھی چیز کو مستحب قرار دیا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بعض تابعین نے کسی بھی میٹھی چیز جیسے شہد کھانے کو پسند کیا ہے اور ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن قرۃ اور ابن سیرین وغیرہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ (۴)

اور عید الفطر میں کھا کر جانے کی حکمت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ عید کی نماز تک روزہ لازم ہے اور بعض نے یہ فرمایا کہ اس میں یہ حکمت ہے کہ روزوں کے بعد جب عید کے دن روزہ نہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا، تو یہ بات مستحب قرار پائی کہ اللہ

---

(۱) البخاري:۱/۱۳۰

(۲) الترمذي:۱/۱۲۰ بلوغ المرام:۳۴

(۳) فتح الباري:۲/۴۴۷

(۴) فتح الباري:۲/۴۴۷

کے حکم کی تعمیل میں جلدی کرتے ہوئے کچھ کھالے۔(واللہ اعلم)

انتباہ: عیدالفطر کی صبح عوام میں سویاں(شیر خورما)پکانے کا رواج ہے،اس کو ضروری خیال کرنا اور عید کے دن اس کی تخصیص والتزام کرنا غلط ہے؛حدیث سے تو کھجور کا ثبوت خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے،اگر میسر نہ آئے تو کسی اور میٹھی چیز کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔خواہ وہ شیر خورما ہو یا کچھ اور؛مگر شیر خورما ہی کو مخصوص طور پر اہتمام والتزام کے ساتھ پکانا من گھڑت بات ہے،احقر نے اس مسئلے پر اپنے رسالے ''منکرات رمضان''میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

عیدگاہ جانے سے قبل صدقۂ فطر ادا کرنا

عیدگاہ جانے سے پہلے صدقۂ فطر بھی ادا کرنا ضروری ہے،پہلے چند حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔

(۱)حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور کو صدقۂ فطر میں ہر چھوٹے اور بڑے،آزاد اور غلام پر فرض کیا ہے۔(۱)

(۲)حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تین قسم کی چیزوں سے صدقۂ فطر؛ہر چھوٹے اور بڑے،آزاد وغلام کی طرف سے نکالتے تھے،ایک صاع کھجور،ایک صاع پنیر اور ایک صاع جو،ہم اسی طرح نکالتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گیہوں کا آدھا صاع کھجور کے ایک صاع کے برابر ہے،حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:میں پہلے جیسا

(۱) البخاري:۱/۲۰۴،مسلم:۱/۳۱۷،الترمذي:۱/۱۴۵،النسائي:۱:۳۴۲

نکالتا تھا ویسا ہی نکالوں گا۔(۱)

فائدہ : پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ گھر کے ہر چھوٹے بڑے، غلام و آزاد پر صدقۂ فطر ہے، البتہ نابالغ اولاد کی طرف سے خود ان کے مال سے یا اپنے مال سے جب کہ ان کا مال نہ ہو، باپ ادا کرے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کھجور یا جو کے حساب سے ایک صاع صدقۂ فطر میں دینا چاہیے اور دوسری حدیث سے بھی اس کا علم ہوا اور دوسری حدیث سے مزید یہ معلوم ہوا کہ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے میں عام طور پر صرف تین چیزوں سے صدقۂ فطر نکالا جاتا تھا: کھجور، پنیر اور جو؛ مگر بعد میں جب گیہوں کا عام رواج ہو گیا، تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کھجور کے ایک صاع کا مقابلہ گیہوں کے آدھے صاع سے ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ گیہوں مہنگی ہے، لہٰذا اکثر صحابہ و تابعین نے اسی کو اختیار فرمایا؛ البتہ بعض صحابہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ نہیں ہم گیہوں سے بھی ایک ہی صاع دیں گے، لہٰذا یہ اختلافی مسئلہ ہے، احناف نے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل اختیار فرمایا ہے؛ لہٰذا گیہوں نصف صاع یا اس کی قیمت صدقۂ فطر میں دینا چاہیے، اب رہی یہ بات کہ نصفِ صاع آج کے حساب سے کتنے کلو ہوتے ہیں؟ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے رسالہ ''اوزانِ شرعیہ'' میں اس کی تحقیق کر کے بتایا ہے کہ نصفِ صاع پونے دو سیر کے برابر ہوتا ہے اور اس کو اگر کلو، گرام کے حساب میں تبدیل کریں تو پونے دو کلو سے کچھ کم ہوتے ہیں، اور احتیاطاً پونے دو کلو دے دینا چاہیے، جیسا کہ میرے استاذ مولانا مہربان علی صاحب زید مجدہ اپنے رسالہ ''امداد الاوزان'' میں تحقیق فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آج کل جو بعض چارٹ میں صدقۂ فطر کی

(۱) مسلم:۱/ ۳۱۸، النسائي:۱/ ۳۴۷، أبو داود:۱/ ۲۲۸، الترمذي:۱/ ۱۴۵، البخاري:۱/ ۲۰۴

مقدار سوا دو کلو یا ڈھائی کلو لکھی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، البتہ کوئی اپنی خوشی سے زیادہ دیدے تو درست ہے، مگر وجوب صرف پونے دو کلو کا ہوگا۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگوں کے نماز عید کو نکلنے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کیا جائے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ صدقۂ فطر نمازِ عید کو جانے سے پہلے ادا کر دینا چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس نے صدقۂ فطر نماز عید سے پہلے ادا کیا، تو وہ صدقۂ مقبولہ ہے اور جو بعد نماز ادا کرے تو وہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہے۔ (۲)

لہذا عیدگاہ جانے سے قبل صدقہ دے دینا چاہیے، اگر کسی نے عیدگاہ جانے سے قبل ادا نہ کیا، تو اس سے یہ معاف نہ ہوگا بلکہ بعد میں دینا پڑے گا۔ (۳)

افادہ: اگر صدقۂ فطر عید سے دو تین دن پہلے ہی دے دے تو اور اچھا ہے؛ کیوں کہ اس میں مساکین وفقرا کے لیے سہولت ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا پہلے سے انتظام کر سکیں گے، اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ ایک دو دن پہلے صدقۂ فطر ادا کر دیتے تھے، چناں چہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت نافع سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کے دور میں صدقۂ فطر ایک دو دن پہلے دے دیا جاتا تھا۔ (۴)

"فتح الباري" میں ہے کہ ابن خزیمہ کی روایت میں آیا ہے کہ ایوب رضی اللہ عنہ نے نافع سے پوچھا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ صدقۂ فطر کب تک ادا کرتے تھے؟ نافع نے فرمایا کہ جب صدقہ وصول کرنے والا عامل وصولی بند کرتا، اس وقت تک ادا کر دیتے،

---

(۱) مسلم:۱/ ۳۱۸
(۲) أبوداود:۱/ ۲۲۷، ابن ماجه:۱۳۱
(۳) الهداية:۱/ ۱۹۱
(۴) البخاري:۱/ ۲۰۵

پوچھا کہ عامل کب بند کرتا تھا؟ بتایا کہ عید سے ایک یا دو دن پہلے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ کی "موطا" میں یہ روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ وصول کرنے والوں کے پاس صدقۂ فطر عید سے دو تین دن قبل بھیج دیتے تھے۔(۱)

مسئلہ: صدقۂ فطر ہر اس مسلمان پر واجب ہے، جو آزاد ہو اور حاجت اصلیہ سے زائد نصاب کا مالک ہو اور نصاب وہی ہے، جو زکاۃ کا ہے کہ ساڑھے سات تولے (یعنی ۸۷ گرام، ۴۷۹ ملی گرام) سونا یا ساڑھے باون تولے (یعنی ۶۱۲ گرام، ۳۵ ملی گرام) چاندی ہو یا اس کے برابر روپیہ پیسہ ہو، یا زائد از ضرورت مال سامان ہو، تو اس پر صدقۂ فطر واجب ہے، اگر چہ اس پر ایک سال نہ گزرا ہو اور اگر چہ وہ مال تجارت کا بھی نہ ہو۔

صدقۂ فطر کی مقدار گرام کے حساب سے

یہ بات معلوم ہے کہ ایک سیر ۹۳۳ گرام، ۱۲۰ ملی گرام کے برابر ہوتا ہے اور ایک ماشہ ۹۷۲ ملی گرام کا ہوتا ہے، اس حساب سے پونے دو سیر تین ماشہ کو گراموں میں تبدیل کرنے سے صدقۂ فطر کی مقدار گیہوں کے حساب سے ایک کلو چھ سو پینتیس (۱۳۵) گرام آٹھ سو بہتر (۸۷۲) ملی گرام ہوتی ہے اور مزید احتیاط کے لیے بہتر ہے کہ ایک کلو سات سو پچاس (۷۵۰) گرام دے دیا جائے، یعنی پونے دو کلو گیہوں یا اس کی قیمت دے دی جائے، اگر کوئی اس سے زیادہ دے دے تو جائز ہے؛ البتہ واجب وہی مقدار ہے، جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ یہ مقدار گیہوں کے حساب سے ہے اور اگر کوئی جو یا کھجور دینا چاہے، تو اس کا دو گنا یعنی ساڑھے تین کلو دینا چاہیے اور ان مذکورہ چیزوں کے علاوہ کوئی اور چیز مثلاً: چاول دینا ہو، تو پونے دو کلو گیہوں یا ساڑھے تین کلو جو کی

(۱) فتح الباري: ۳/۳۷۶

قیمت کے برابر چاول وغیرہ دینا چاہیے۔

صدقۂ فطر کا مصرف

صدقۂ فطر ان لوگوں کو دینا چاہیے جن کو زکوۃ دی جاتی ہے جیسے فقیر مسکین وغیرہ۔
صدقۂ فطر کافر کو دینے کے بارے میں اختلاف ہے، بعض علما نے اجازت دی ہے؛
مگر فتوی اس پر ہے کہ نہ دینا چاہیے۔(۱)

پھر یہ اختلاف بھی اس کافر کے متعلق ہے، جو اسلامی حکومت کے سائے میں جزیہ دے کر زندگی گذارتا ہے، جس کو اصطلاح میں ''ذمی'' کہتے ہیں اور جو ذمی نہ ہو؛ بل کہ دار الحرب کا کافر ہو، اس کو دینا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔(۲)

سید کو صدقۂ فطر نہ دینا چاہیے البتہ یہ چوں کہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کی مدد و نصرت دوسرے نفلی صدقات اور تحائف و ہدایا کے ذریعے کرنا بہت بڑے ثواب کی بات ہے۔

عید صدقۂ فطر کی قیمت بازار کے حساب سے لگائی جائے

اس جگہ ایک اہم مسئلہ ذکر کرنا ہے، وہ یہ کہ بڑے شہروں اور قصبات میں لوگوں کی سہولت کے لیے کنٹرول ریٹ پر اناج غلہ دیا جاتا ہے اور اس رعایت کا مستحق وہ ہوتا ہے جس نے ''راشن کارڈ'' بنالیا ہو، عام بازاری قیمت کے لحاظ سے راشن کارڈ پر دیا جانے والا اناج بہت سستا ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ جو لوگ کنٹرول ریٹ کے گیہوں کھاتے ہیں، وہ صدقۂ فطر اگر قیمت کے لحاظ سے دینا چاہیں، تو کیا اسی کنٹرول

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳۵۲/۲

(۲) الدر المختار مع الشامي:۳۵۲/۲

ریٹ کے حساب سے دینا کافی ہوگا؟ اس مسئلے پر میں نے اپنی کتاب ''رمضان اور جدید مسائل'' میں کلام کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کنٹرول ریٹ گیہوں خرید کر گیہوں ہی پونے دو کلو دے دے تو درست ہے؛ لیکن اگر صدقۂ فطر قیمت سے دینا ہو، تو عام بازاری قیمت کا اعتبار ہوگا؛ کنٹرول ریٹ کا اعتبار نہیں؛ کیوں کہ فقیر آدمی اگر اس رقم سے پونے دو کلو گیہوں بازار سے خریدنا چاہے، تو نہیں خرید سکتا؛ بل کہ پونے دو کلو سے کم گیہوں آئیں گے اور ہر آدمی کے پاس راشن کارڈ ہونا ضروری نہیں؛ اس لیے عام بازار کی قیمت دینا چاہیے؛ تاکہ اگر وہ فقیر آدمی بازار سے پونے دو کلو گیہوں خریدنا چاہے، تو اس رقم سے خرید سکے۔ (واللہ اعلم)

عیدگاہ جاتے ہوئے تکبیر پڑھنا

حضرت زہری رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر میں نکلتے تھے اور اپنے گھر سے نکلنے کے وقت سے عیدگاہ جانے تک تکبیر پڑھتے تھے۔ (۱)

"إعلاء السنن" میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ ''ابن ابی شیبہ'' کی سند مرسل ہونے کے ساتھ صحیح ہے اور مرسل روایت (جس میں صحابی کا واسطہ متروک ہوتا ہے) ہمارے نزدیک حجت ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک بھی حجت ہے، جب کہ دوسرے طریق سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ (۲)

ائمہ احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ عیدگاہ کے راستے میں تکبیر کہتے

(۱) التلخیص الحبیر :۱/۴۳

(۲) إعلاء السنن:۸/۹۷

ہوئے جانا چاہیے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بھی یہی تھا جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ نے بہ روایت دار قطنی و بیہقی نقل فرمایا ہے۔(۱)

عیدگاہ جانا اور نماز عید میں جلدی کرنا

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ لوگوں کے ساتھ عیدگاہ تشریف لے گئے عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ کا موقعہ تھا، امام نے تاخیر کردی، تو فرمایا کہ ہم تو اس وقت تک فارغ ہوجایا کرتے تھے اور یہ تسبیح (یعنی نفل نماز) کا وقت تھا۔(۲)

علما نے لکھا ہے کہ عیدالاضحیٰ میں عیدالفطر کی بہ نسبت جلدی جانا چاہیے، عیدالفطر میں اس وقت جائے، جب کہ سورج دو نیزے کی بہ قدر بلند ہو جائے اور عیدالاضحیٰ میں اس وقت جب کہ سورج ایک نیزہ بلند ہو۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ نے حضرت جندب رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول بتایا ہے اور اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ ابن حجر نے ''التلخیص'' میں اس کو ذکر کیا ہے اور اس پر کلام نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ اس باب میں سب سے اچھی روایت ہے۔(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے علاقوں میں جو عام طور پر عیدالفطر کی نماز بہت تاخیر سے پڑھتے ہیں، یہ اچھا نہیں ہے اور عیدالاضحیٰ کو تاخیر سے پڑھنا تو اور بُرا ہے۔

نماز عید سے پہلے نفل نماز نہیں ہے

اصحاب صحاح اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

---

(۱) الدرایة مع الهدایة:۱/۱۵۳

(۲) ابو داود:۱/۱۶۱

(۳) نیل الأوطار:۳/۳۱۰

«أنّ النبی ﷺ صلی یوم العید رکعتین لم یصل قبلهما ولا بعدهما.»

(رسول اللہ ﷺ نے عید کے دن دو رکعتیں (عید کی) پڑھیں اور ان سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھی اور نہ بعد میں پڑھی۔)(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عیدگاہ میں صرف دو رکعت عید کی نماز پڑھی جائے گی، کوئی اور نماز نہ اس سے پہلے ہے نہ اس کے بعد، اسی طرح گھر میں بھی عید سے پہلے کوئی نماز نفل نہیں پڑھنا چاہیے، البتہ عیدگاہ سے آنے کے بعد چاہے، تو نفل گھر پر پڑھنے کی اجازت ہے، حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے: البتہ جب گھر لوٹ جاتے تو دو رکعت پڑھتے، ابن حجر رحمہ اللہ نے "بلوغ المرام" میں اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (۲)

نماز عید کے لیے عیدگاہ جانا چاہیے

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ کی طرف نکلتے تھے الخ۔ (۳)

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث سے عیدگاہ جانے کے استحباب پر استدلال کیا گیا ہے اور اس پر کہ عید کی نماز عیدگاہ میں جا کر پڑھنا، مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔ (۴)

---

(۱) بلوغ المرام:۸۴

(۲) بلوغ المرام:۸۴

(۳) البخاري:۱/۱۳۱

(۴) فتح الباري:۲/۴۵۰

البتہ کوئی عذر ہو، تو مسجد میں بھی عید کی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أنهم أصابهم مطرفي يوم عيد، فصلى بهم النبي صلى الله عليه وسلم صلاة العيد في المسجد».

(ایک دفعہ بارش ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز مسجد میں پڑھائی۔)(۱)

صاحب "عون المعبود" نے لکھا ہے کہ اس روایت پر ابوداؤد اور امام منذری دونوں نے سکوت کیا ہے۔(۲)

لہذا روایت قابل اعتبار اور کم از کم حسن ہوگی، جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ حضرات سکوت اسی وقت کرتے ہیں جب کہ ان کے نزدیک روایت کم از کم حسن ہو، لہذا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو "بلوغ المرام" میں اس کی "تضعیف" کی ہے، یہ مضر نہیں۔

عیدگاہ پیدل جانا سنت ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

من السنة أن يخرج إلى العيد ما شياً .

(سنت یہ ہے کہ عید کے لیے پیدل جائے اور جانے سے پہلے کچھ کھا لے۔)(۳)

اسی طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بھی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے لیے پیدل جاتے تھے۔(۴)

---

(۱) أبو داود:۱/۱۶۴

(۲) إعلاء السنن:۸/۹۱

(۳) الترمذی:۱/۱۱۹

(۴) ابن ماجه:۹۳

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے، کہ وہ عیدگاہ کو پیدل جانا مستحب فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سواری پر نہ جائے اِلَّا یہ کہ کوئی عذر ہو۔

لہٰذا بلا عذر سواری پر نہ جانا چاہیے؛ تا کہ سنت سے محرومی نہ ہو جائے، ہاں کوئی عذر ہو مثلاً کوئی بیمار ہے، جو چلنے سے معذور ہے؛ تو اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ سواری کرلے، اسی طرح جو بہت دور سے آئے تو اس کے لیے بھی گنجائش ہے، علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایسے اعذار والوں کو فقہا نے مستثنیٰ رکھا ہے۔(۱)

ایک راستہ سے جانا اور دوسرے راستہ سے آنا

حدیث میں آیا ہے:

«كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا كان يوم العيد خالف الطريق».

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کو ایک راستے سے جاتے اور دوسرے راستے سے واپس ہوتے)۔

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے (۱/۱۳۴) امام ترمذی رحمہ اللہ نے سنن (۱/۱۲۰) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور امام ابوداودؒ نے سنن (۱/۱۶۳) میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

اس میں کیا حکمت ہے؟ ابن حجر رحمہ اللہ نے علما سے بیس سے زائد اقوال اس سلسلے میں ذکر کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہل اسلام کی شان و شوکت بتانے کے لیے ایسا فرمایا، کہ لوگ جب دیکھیں گے کہ مسلمان ادھر کے راستہ پر بھی تھے، اب یہاں بھی ہیں، تو کثرت سے مرعوب ہوں گے، ایک حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ راستہ

(۱) معارف السنن شرح الترمذی:۴/۲۴۶

گواہ بن جائے، جہاں جہاں سے اللہ کے لیے گزرنا ہوگا وہ راستہ چلنے والے کے حق میں گواہی دے گا۔ (واللہ اعلم)

عید کی مبارک بادی دینا

ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت جبیر بن نفیر سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب عید کے دن ملاقات کرتے، تو آپس میں ایک دوسرے کو یوں کہتے: تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْکَ . (اللہ ہمارے اور تمہارے اعمال کو قبول کرے۔)(۱) یہ روایت حسن ہے۔

معلوم ہوا کہ صحابہ آپس میں دعا دیتے تھے، اسی کو اختیار کرنا چاہیے یہی بڑی مبارک بادی ہے۔

(۱) فتح الباري :۲/۴۴۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نماز عید

نماز عید کا وجوب

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک نماز عیدین واجب ہے اور دیگر بعض ائمہ کے نزدیک سنت ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جب شوال کا چاند نظر آجائے تو مسلمانوں پر حق (واجب) ہے کہ وہ اللہ کی تکبیر یعنی بڑائی کا اظہار کریں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰه﴾ کہ اللہ کی تکبیر بیان کرو۔(۱)

نیز اللہ کے نبی علیہ السلام نے نماز عید پر ہمیشہ پابندی کی ہے جو اس کے واجب ہونے کی دلیل ہے، صاحب ہدایہ نے اسی سے نماز عید کے وجوب پر استدلال کیا ہے اور اللہ کے نبی علیہ السلام کا اس کی پابندی فرمانا احادیث سے معلوم و مسلّم ہے، صاحب'' نصب الرایہ'' علامہ زیلعی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ بات معروف ہے۔(۲)

کیا عورتوں پر نماز عید ہے؟

کیا نماز عید عورتوں پر بھی واجب ہے؟ اس بارے میں علما کے مختلف اقوال ہیں۔علامہ شوکانی رحمۃ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں عورت پر نماز عید کے متعلق علما کے

---

(۱) تفسیر الطبري:۲/۱۶۴
(۲) نصب الراية:۲/۲۱۶

پانچ اقوال ذکر فرمائے ہیں:

(۱) عورتوں پر نماز عید مستحب ہے، چاہے عورت جوان ہو یا بوڑھی۔

(۲) بوڑھی عورت پر مستحب ہے، جوان پر نہیں، جمہور شوافع کا یہی قول ہے۔

(۳) عورتوں کے لیے نماز عید صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

(۴) عورتوں کے لیے نمازِ عید مکروہ ہے، امام ترمذی نے سفیان ثوری اور ابن المبارک رحمہم اللہ سے یہی قول نقل کیا ہے اور امام مالک وابو یوسف رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے اور ابن قدامہ نے امام نخعی اور یحییٰ بن سعید رحمہم اللہ سے بھی اسی کو نقل کیا ہے۔

(۵) عورتوں پر نماز عید کے لیے عیدگاہ جانا واجب ہے، قاضی عیاض رحمہ اللہ نے حضرت ابو بکر، علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے یہی قول نقل کیا ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اکثر علما عورتوں پر نمازِ عید کے وجوب کے قائل نہیں ہیں اور جن احادیث میں یہ آیا کہ عورتوں کو عیدگاہ جانے کا حکم دیا جاتا تھا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ومسعود دور کی بات ہے، بعد میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جلیل القدر حضرات نے عورتوں کو جماعت میں حاضر ہونے سے منع فرمادیا، جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان (بے پردگی و بے حیائی کی) باتوں کو دیکھتے، جو عورتوں نے پیدا کرلی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مسجد میں آنے سے ضرور منع کردیتے، جیسے بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کردیا گیا تھا۔''(۲)

اور جیسے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہ ایک دفعہ انھوں نے جمعہ میں عورتوں کو مسجد

(۱) نيل الأوطار:۳/۳۰۵

(۲) مسلم:۱/۱۸۳، أبو داود:۱/۸۴

سے نکلتے دیکھا تو فرمایا کہ تم اپنے گھروں کی طرف جاؤ، یہ بہتر ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ ﷺ کے زمانے میں نئے نئے اسلام میں آنے والے لوگوں میں ایسی باتیں پیدا ہوگئی تھیں؛ جن کی بنا پر صحابہ کرام نے عورتوں کو مسجد اور جماعت میں حاضر ہونے سے منع فرمایا، لہذا عورت کا عیدگاہ جانا معیوب ہے، جب اُس زمانے کی یہ حالت ہے، تو موجودہ دور میں بھلا یہ کیسے معیوب نہ ہوگا؟!!

نمازِ عید میں زائد تکبیرات

نمازِ عید میں عام نمازوں کے اعتبار سے کچھ تکبیرات زائد ہوتی ہیں، یہ تکبیریں کتنی ہیں؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پہلی رکعت میں زائد تین تکبیریں ہیں اور دوسری میں بھی زائد تین تکبیریں ہیں، چناں چہ حدیث میں ہے کہ سعید ابن العاص، ابوموسیٰ اشعری اور حذیفہ بن الیمان ﷺ سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں تکبیر کس طرح کہتے تھے؟ تو حضرت ابوموسیٰ ﷺ نے فرمایا چار تکبیریں کہتے تھے جیسا جنازے کی نماز میں آپ کی تکبیر ہوتی تھی۔(۲)

اس حدیث کو امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے روایت کر کے سکوت فرمایا ہے، اسی طرح منذری رحمہ اللہ نے بھی سکوت فرمایا ہے، بعض حضرات نے اس کے ایک راوی ابو عائشہ کو مجہول اور دوسرے راوی عبدالرحمان بن ثوبان کو ضعیف قرار دیا ہے؛ لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں اس لیے کہ ابو عائشہ سے مکحول اور خالد بن معدان نے روایت کی ہے اور جس سے دو راوی روایت کریں، وہ مجہول نہیں ہوتا اور ابن حجر

(۱) مجمع الزوائد:۱/۱۵۶

(۲) أبو داود:۱/۱۶۳، أحمد:۴/۴۱۶، الطحاوي:۲/۳۳۳، البیهقي:۵/۶۹

رحمۃ اللہ نے ''التقریب'' میں ان کو مقبول قرار دیا ہے، رہے عبدالرحمان بن ثوبان: تو ان کو متعدد ائمہ فن نے ثقہ قرار دیا ہے، لہٰذا یہ مختلف فیہ راوی ہیں، جن کی حدیث حسن سے کم نہ ہوگی۔(۱)

نیز امام طحاوی رحمۃ اللہ نے حضرت قاسم سے روایت کی، انھوں نے فرمایا: مجھ سے بعض صحابہ نے بیان فرمایا کہ ہم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھائی، تو چار چار تکبیریں کہی، پھر نماز کے بعد ہماری طرف پھر کر فرمایا کہ بھول نہ جانا، یہ جنازے کی تکبیر کی طرح ہے، پھر اپنے انگوٹھے کو بند کر کے چار انگلیوں سے اشارہ فرمایا، امام طحاوی رحمۃ اللہ نے فرمایا اس کی سند حسن ہے۔(۲)

اِن احادیث سے معلوم ہوا کہ عید میں پہلی رکعت میں چار تکبیریں اور دوسری میں چار تکبیریں ہوتی ہیں، جن میں سے ایک ایک تو اصل ہے اور تین تین زائد، نیز حضرات صحابہ سے بھی مروی ہے، کہ عید میں تکبیریں چار ہوتی ہیں، چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تکبیریں چار ہیں، جیسا کہ نماز جنازہ میں۔(۳)

نماز عید کے لیے اذان واقامت نہیں ہے

نماز عید کے لیے نہ اذان ہے اور نہ اقامت، چناں چہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہا نماز عیدین پڑھی ہے، جو اذان واقامت کے بغیر ہوتی تھی۔(۴)

(۱) تهذيب التهذيب:۶/۱۵۰
(۲) الطحاوي:۲/۳۴۳
(۳) مجمع الزوائد:۱/۲۲۳
(۴) مسلم:۱/۲۹۰

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عیدین میں نہ اذان ہے اور نہ اقامت ہے۔(۱)

نماز عید پہلے اور خطبہ بعد میں ہو

نماز عید پہلے پھر اس کے بعد خطبہ ہونا چاہیے، یہی سنت ہے، چناں چہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے۔(۲)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ عید میں حاضر ہوا، یہ سب حضرات خطبہ سے پہلے نماز عید پڑھتے تھے۔(۳)

نماز عیدین کی مسنون سورتیں

نماز عیدین میں جو سورت چاہے پڑھی جا سکتی ہے، البتہ بعض سورتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونے کی وجہ سے مستحب ہیں۔

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی﴾ اور ﴿هَلْ اَتَاکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ﴾ پڑھتے تھے۔(۴)

اور حضرت ابو واقد لیثی فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان

(۱) کنز العمال:۴/۳۱۵

(۲) المسلم:۱/۲۹۰،البخاري:۱/۱۳۱

(۳) مسلم:۱/۲۸۹،بخاری:۱/۱۳۱

(۴) مجمع الزوائد:۱/۴۲۲

سورتوں کے بارے میں پوچھا جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عید میں پڑھتے تھے، میں نے کہا کہ ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ اور ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ﴾ (۱)

تکبیرات عیدین میں ہاتھ اٹھانا چاہیے

امام طحاوی رحمہ اللہ نے ابراھیم نخعی رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سات جگہ ہاتھ اٹھائے جائیں، ان میں سے ایک تکبیرات عیدین کا موقعہ ذکر کیا ہے۔ (۲)

یہ اگرچہ ایک تابعی بزرگ کا قول ہے؛ مگر اس کی تائید حضرت عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے ہوتی ہے، چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آیا ہے کہ وہ تکبیرات میں ہاتھ اٹھاتے تھے، اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (۳)

اس میں اگرچہ یہ نہیں ہے کہ یہ کون سی تکبیرات کا قصہ ہے؛ تاہم ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کو عیدین کے باب میں ذکر کیا ہے اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہر تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے تھے۔ (۴)

نماز عید کا طریقہ

نماز عید کا طریقہ یہ ہے کہ اول دل سے نیت کرے، کہ میں دو رکعت عید الفطر کی واجب نماز امام کی اقتدا میں ادا کرتا ہوں چھ زائد تکبیرات کے ساتھ؛ مگر نیت کو زبان

(۱) مسلم:۱/۲۹۱

(۲) الطحاوي:۱/۳۹۱، اس کی سند صحیح ہے، إعلاء السنن:۸/۱۱۵

(۳) التلخيص الحبير:۱/۱۴۵

(۴) زاد المعاد:۱/۳۴۳

سے کہنا ضروری نہیں اور حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت بھی نہیں ہے؛ اس لیے صرف دل سے نیت کرنا کافی ہے، زبان سے کہہ لے تو حرج نہیں۔

اس کے بعد پہلی تکبیر (جس کو تکبیر تحریمہ کہتے ہیں) کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کانوں تک اٹھا کر باندھ لیں، جیسے کہ عام نمازوں میں باندھتے ہیں اور حسب معمول ثنا پڑھیں، پھر دوسری تکبیر کہتے ہوئے ہاتھ کانوں تک اٹھائیں اور چھوڑ دیں، اسی طرح تیسری تکبیر پر بھی ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دیں؛ پھر چوتھی تکبیر پر ہاتھ اٹھا کر ناف کے نیچے حسب معمول باندھ لیں، پھر قرأت کریں جس میں ﴿سُوْرَةُ الْفَاتِحَة﴾ اور کوئی سورت پڑھیں، پھر حسب معمول رکوع وسجدہ کر کے دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوں اور قرأت کریں، جب ﴿سُوْرَةُ الْفَاتِحَة﴾ اور کوئی سورت پڑھ چکیں تو اب رکوع میں نہ جائیں بل کہ تکبیر کہتے ہوئے ہاتھ اٹھائیں اور کانوں تک لے جا کر چھوڑ دیں، اسی طرح دوسری و تیسری تکبیر پر بھی کریں کہ ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دیں اور چوتھی تکبیر پر رکوع میں چلے جائیں اور حسب معمول نماز پوری کریں، یہ ہے نماز عید کا طریقہ۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

انحطاط و پریشانیوں کے اسباب اور راہِ عمل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

الحمد للّٰہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین.

امابعد: آج امت مسلمہ کی زبوں حالی و پریشانی، اس پر یہود ونصاری، کفار ومشرکین کی جانب سے ظلم وتشدد، اپنی انتہاء کو پہنچ رہا ہے۔ دنیا بھر میں اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا گیا ہے، اسی کے ساتھ پولس جس کو محافظ ہونا چاہئے تھا وہ بھی ظالموں کا ساتھ دیتی اور مظلوموں پر مزید ظلم ڈھاتی ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے اور دوسری طرف امت بحیثیت مجموعی انتہائی کمزور، بے بس اور نہتی نظر آتی ہے، جس کے پاس اپنے اوپر ہونے والے مظالم ومصائب کے دفعیہ کا کوئی سامان نہیں، وہ اپنا دفاع بھی کرے تو اس کو ظالم قرار دیا جاتا ہے۔

ہمارا ماضی اور حال

دورِ رسالت وصحابہ سے تقریباً ایک ہزار برس تک اہل اسلام کو جو عروج واقبال نصیب ہوا ہے اور اسلام کے زیر سایہ ان کی حکومت کو جو آب وتاب اور شان وشوکت حاصل ہوئی اور تقریباً پوری دنیا پر ان کا جو رعب ودبدبہ اور اقتدار قائم تھا، یہ سب ایک ایسی حقیقت ہے جس کی گواہی اپنے ہی نہیں غیر بھی دیتے ہیں۔

لیکن (سنہ: ۱۷۰۰ء مطابق: ۱۱۰۰ھ کے) بعد سے مسلمانوں میں جو انحطاط

اور کمزوری پیدا ہوئی وہ مسلسل بڑھتی ہی چلی گئی اور بڑھتی ہی جارہی ہے، اور ان کا یہ انحطاط زندگی کے تمام شعبوں میں رونما ہوا ہے عملی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی ہر شعبہ اس سے متاثر ہے اور اس نے بڑھتے بڑھتے ہم کو اس پوزیشن اور حیثیت میں لا کھڑا کیا ہے کہ ہماری کوئی شان بان تو ایک طرف رہی، رعب ودبدبہ تو ایک طرف رہا، الٹے دوسروں سے مرعوب بل کہ خوفزدہ ہیں، عروج واقبال تو کجا نزول وادبار کی زد میں ہیں اور ہلاکت وتباہی کے مہیب غاروں میں ڈھکیلے جارہے ہیں اور نکبت وذلت کے خطرناک اندھیروں میں گھیرے جارہے ہیں۔ ہمارے اس شاندار ماضی کے ساتھ اس تاریک حال کا موازنہ ومقابلہ کرتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا اس کے اسباب وجوہ کیا ہیں؟ اور اس صورت حال میں امت مسلمہ کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟

اسباب عروج - قرآن کی نظر میں

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں پہلے قرآن وحدیث میں عروج واقبال کے اسباب معلوم کرنا چاہیے تاکہ اسی سے معلوم ہوجائے کہ اسباب عروج واقبال سے اعراض وروگردانی اور ان سے تہی دامنی ہی پستی اور ذلت، انحطاط وہلاکت کے اسباب ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے، ایک جگہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور : ۵۵)

(اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اورانہوں نے نیک عمل اختیار کیے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت دے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اوران کے لیے ان کے دین کو جما دے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اورانہیں خوف کے بدلے میں امن عطا کرے گا، وہ لوگ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں گے اور جو ناشکری کرے گا اس کے بعد تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ روئے زمین کی خلافت اوروراثت ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو ایمان وعمل صالح اختیار کریں گے۔

ایک جگہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (آل عمران : ۱۳۹)

(اورتم ہمت نہ ہارواوررنج نہ کرواورتم ہی غالب رہوگے اگرتم پورے اور سچے ایمان والے ہو۔)

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کی مدد ونصرت اورغلبہ وکامرانی ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان ویقین میں مضبوط اورکامل ہوں اوراس پر پوری طرح جمے ہوئے ہوں۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ

فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً ، وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (النحل : ۹۷)

(جوکوئی مرد وعورت نیک کام کرے بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو (دنیا میں بھی) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کا ان کو بدلہ دیں گے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح سے دنیا کی زندگی میں بھی لطف وراحت میسر آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دیگر مفسرین نے اس آیت میں اس سے دنیوی زندگی ہی مراد لی ہے جیسا کہ بیہقی، حاکم، ابن ابی حاتم وغیرہ نے ابن عباس سے یہی تفسیر نقل کی ہے اور روح المعاني میں ہے کہ بہت سے مفسرین نے یہی مراد لیا ہے۔(۱)

قرآن کریم کہتا ہے:

﴿ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَأَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (الأعراف : ۹۶)

(اگر قریہ والے ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین وآسمان سے برکات کھولدیتے، لیکن انہوں نے جھٹلایا، پس ہم نے ان کے کرتوت کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا)۔

اس آیت سے بتادیا کہ انسانوں پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول ایمان اور تقوی کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اس کے بجائے اگر تکذیب وانکار اور اعراض ہو تو اللہ کی پکڑ ہوتی ہے۔

(۱) روح المعاني :۱۴/ ۲۲۷

ایک آیت میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (المنافقون: ۸)

(اللہ اور اس کے رسول اور ان لوگوں کے لیے عزت ہے جو ایمان والے ہیں، لیکن منافق لوگ اس کو جانتے نہیں ہیں۔)

معلوم ہوا کہ عزت و سربلندی ایمان کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔

ایک جگہ کہا گیا:

﴿إِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰئِكَةِ أَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، سَأُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ، فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾

(الأنفال: ۱۲)

(اس وقت کو یاد کرو جب کہ آپ کا رب حکم دیتا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارا ساتھی ہوں، تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ، میں ابھی کفار کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں، لہٰذا گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور کو کاٹ دو۔)

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان والوں کی مدد و نصرت فرشتوں کے ذریعہ کرائی جاتی ہے اور اہل اسلام کا رعب کافروں کے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ مدار ایمان و عمل پر ہے۔

ایک حدیث

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

« إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ فِيْ قُرَيْشٍ ، لَا يُعَادِيْهِمْ أَحَدٌ إِلَّا كَبَّهُ اللّٰهُ عَلىٰ وَجْهِهٖ مَا أَقَامُوْا الدِّيْنَ . »

(یہ امر خلافت وسلطنت ہمیشہ قریش میں رہے گی جو شخص ان سے مخالفت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو منہ کے بل گرادے گا جب تک کہ وہ لوگ دین کو قائم رکھیں۔(۱)

ان تمام دلائل سے یہ واضح ہوا کہ زمین کی وراثت وخلافت، دنیا کی بالطف ومزیدار زندگی، عزت وعظمت فتح وکامرانی، غلبہ واقتدار، رحمت وبرکت ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان وعمل صالح، تقوی وخشیت سے مالا مال ہوں، بس یہی چیزیں عروج واقبال کے اسباب ہیں۔

اسباب انحطاط- قرآن کی نظر میں

اس کے برخلاف جب کسی قوم میں کفر ومعصیت، بے عملی وبدعملی، جہالت وجاہلیت، سرکشی وبغاوت، خدائی احکامات وفرامین سے اعراض وروگردانی، انبیاء کے بتائے ہوئے لائحہ عمل ونمونہ زندگی سے غفلت، بے خوفی وبدعہدی وغیرہ روحانی امراض پیدا ہوتے ہیں تو اس کو ذلت ونکبت، زوال وانحطاط کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے اللہ کی مدد ونصرت ہٹالی جاتی ہے اور برکت ورحمت کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ یہاں چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

بنی اسرائیل کے تذکرے میں کہا گیا ہے:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْا بِغَضَبٍ

(۱) بخاري:۳۲۳۹، احمد:۱۶۲۴۹، دارمي:۲۴۰۹

مِّنَ اللّٰهِ ، ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ، ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ. ﴾

(البقرة : ٦١)

(اور جم گئی ان پر ذلت و پستی اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے اور یہ اس وجہ سے کہ لوگ احکام الٰہیہ کے منکر ہو جاتے تھے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ (اطاعت) سے نکل جاتے تھے۔)

معلوم ہوا کہ اطاعت سے گریز، احکام الٰہی کا انکار، انبیاء سے بدسلوکی، ذلت و پستی کے اسباب ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

﴿وَکَمْ اَهْلَکْنَا مِنْ قَرْیَةٍ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهَا،فَتِلْکَ مَسٰکِنُهُمْ لَمْ تُسْکَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِیْلاً﴾ (القصص : ٥٧)

(اور ہم بہت سی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامان عیش پر نازاں تھے سو یہ ان کے گھر ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لیے۔)

معلوم ہوا کہ اپنے سامان عیش پر ناز اور اس کی بنا پر خدا فراموشی و غفلت ایسی چیزیں ہیں جن کی بنا پر ہلاکت و تباہی، ہلاکت و بربادی کے فیصلے ہوتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الرُّعْبَ بِمَا اَشْرَکُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰناً،وَمَاْوٰهُمُ النَّارُ،وَبِئْسَ مَثْوٰی

الظّٰلِمِیْنَ﴾ (آل عمران : ۱۵۱)

(ہم ابھی کافروں کے دلوں میں رعب اور ہیبت ڈالے دیتے ہیں اس سبب سے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ایسی چیز کو قرار دیا ہے جس پر کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں کی، اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ ظالموں کا برا ٹھکانا ہے۔)

ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (الشوریٰ : ۳۰)

(اور جو تمہیں مصیبت پہنچی تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے کی وجہ سے ہے، اور وہ اللہ بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔)

ایک قابل عبرت حدیث

امت کی پریشانیوں اور مصائب کی وجوہات پر ایک حدیث سے بخوبی روشنی پڑتی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

« خَمْسٌ إِذَا ابْتُلِيْتُمْ بِهِنَّ ،وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ تُدْرِكُوْهُنَّ، لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعْلِنُوْا بِهَا إِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ، وَالْأَوْجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِيْ أَسْلَافِهِمُ الَّذِيْنَ مَضَوْا، وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ إِلَّا أُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمَئُوْنَةِ وَ جَوْرِ السُّلْطَانِ ،وَلَمْ يَمْنَعُوْا زَكَاةَ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَاءِ ، وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ

لَمْ يُمْطَرُوْا، وَلَمْ يَنْقُضُوا عَهْدَ اللّٰهِ وَ عَهْدَ رَسُوْلِهٖ إِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِّنْ غَيْرِهِمْ ، فَأَخَذُوْا بَعْضَ مَا فِيْ أَيْدِيْهِمْ، وَمَا لَمْ تَحْكُمْ أَئِمَّتُهُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَ يَتَخَيَّرُوْا مِمَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ .»

(پانچ باتیں ہیں جب تم ان میں مبتلا ہو جاؤ (تو یہ عذابات پیش آئیں گے)، اور میں اللہ کی اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ تم ان کو پاؤ، جب کسی قوم میں بے حیائی علی الاعلان ہونے لگے تو ان میں طاعون اور ایسی ایسی بیماریاں پھیل جائیں گی جو ان کے اسلاف میں نہیں تھیں اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرے گی تو اس کو قحط سالی و تنگی اور بادشاہ کے ظلم میں گرفتار کیا جائے گا اور جب کوئی قوم زکاۃ کو روکے گی تو اس سے بارش روک دی جائے گی اور اگر جانور نہ ہوتے تو اس پر کبھی بارش نہ ہوتی اور جب اللہ و رسول کے عہد کو توڑے گی تو اس پر غیر قوم میں سے کوئی دشمن مسلط کیا جائے گا جو اس سے ان کے مال چھین لے گا اور جب ان کے ائمہ اللہ کی کتاب سے فیصلہ نہیں کریں گے اور اللہ کے نازل کردہ احکام میں سے اپنی مرضی کے مطابق لے لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں لڑائی ڈال دیں گے)(۱)

غرض یہ ذلت وپستی، انحطاط وکمزوری، ہلاکت وتباہی اس وقت آتی ہے جب کہ انسان اللہ کے احکام اور نبی کی سنت وسیرت سے گریز، انبیاء کرام کے ساتھ

---

(۱) ابن ماجہ:۴۰۰۹

بدسلوکی اور ان کی توہین، دنیوی ساز وسامان اور عیش و عشرت پر ناز و فخر اور آخرت سے غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ہمارے اسلاف کی زندگیاں

اس کے بعد تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھ لیجئے کہ ہر دور میں ہر قوم وملت کے ساتھ اسی اصول کو برتا گیا، اسی کے مطابق فیصلے ہوتے رہے، جس قوم نے اسباب عروج واقبال کو اختیار کیا وہ عروج واقبال کی منزلیں طے کرتی رہی اور اس کو دنیا میں عزت وعظمت، فتح وکامرانی، غلبہ واقتدار سے بھرپور حصہ دیا گیا اور جس نے اسباب نزول وادبار کو اختیار کیا اس کو نزول وادبار، انحطاط وپستی میں مبتلا کیا گیا۔

چنانچہ ہمارے اسلاف کی پوری تاریخ پڑھتے جاؤ، ان کو عظمت کے میناروں پر، عزت کے محلوں میں، فتح وکامرانی کے پرچم کو لہراتے، غلبہ واقتدار کے تختوں پر دیکھوگے، اور ان کے زمانے میں ان چیزوں کے وہی تنہا اجارہ دار نظر آئیں گے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں تھا، اور یہ سب کچھ ان کے ایمان باللہ وتوکل واعتماد علی اللہ، تقوی وپرہیزگاری، خوف وخشیت، تعلق مع اللہ اور اتباع سنت وسیرت کی وجہ سے تھا۔

اب ہمارے لیے راہ عمل کیا ہے؟

اب تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آج امتِ مسلمہ پر ادبار وانحطاط کے مہیب سائے، ذلت ونکبت کی پھٹکار، خدائی عقاب وعتاب کی سنگ باریاں، پریشانیوں اور مصائب کے طوفان، صرف اسی وجہ سے ہیں کہ ہم سے دین سے دوری، عمل میں سستی، تعلق مع اللہ میں غفلت، گناہوں میں انہماک، خدا سے

بغاوت، رسول کے طریقے سے کدورت، غیروں سے مشابہت ومناسبت وغیرہ افعال شنیعہ صادر ہورہے ہیں، لہٰذا اب اپنی اصلاح کا کوئی نظام بنانا چاہئے، یہاں میں اس سلسلہ میں چند اہم امور کی جانب نشاندہی کرنا چاہتا ہوں:

آزمائش وابتلاء کیوں؟

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم اس پر غور کریں کہ مسلمانوں پر یہ مظالم کیوں ہیں؟ اس کا جواب ہمیں قرآن میں بڑے واضح انداز میں ملتا ہے، وہ یہ کہ یہ سب دراصل اللہ کی جانب سے ہماری آزمائش ہے۔

ایک موقعہ پر ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ، مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ، أَلَاۤ إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ (البقرۃ: ۲۱۴)

(کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالاں کہ تم پر ایسے حالات نہیں آئے جیسے تم سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں پر آئے کہ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور انہیں ہلا کے رکھدیا گیا یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے کہہ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، سن لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔)

معلوم ہوا کہ مومنوں اور مسلمانوں کی اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے، اور اس کے بغیر چارہ کار نہیں اور جنت میں داخلہ کا خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب کہ ہم اس دور ابتلاء وآزمائش سے گزریں۔

اور اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب خود اللہ جل وعز نے یہ دیا کہ یہ آزمائش دراصل سچوں اور جھوٹوں میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے، جیسے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿الٓمّٓ،اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ، فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ﴾ (العنکبوت : ۱-۳)

(الٓمّٓ (اس کا معنیٰ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں) کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے چھوڑ دیے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی، اور ہم نے ان لوگوں کو بھی آزمایا ہے جو ان سے پہلے گذرے ہیں کہ اللہ سچوں کو معلوم کرے اور وہ جھوٹوں کو معلوم کرے۔)

جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ مظالم و مصائب اور آلام و آفات دراصل ہماری آزمائش کے لیے ہوتے ہیں تو ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس آزمائش میں کھرے ثابت ہوں، کھوٹے نہ نکلیں، اللہ پر ایمان میں سچے ثابت ہوں، جھوٹے نہ ظاہر ہوں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اللہ کے احکام اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعلیمات کا ہر موقعہ پر لحاظ رکھیں، جس طرح شادی و خوشی میں اس کا لحاظ ہو، اسی طرح غم و مصیبت میں بھی اس کا دھیان ہو، اور کوئی کام اس کے خلاف نہ کریں۔

توبہ و استغفار

یہ بات سامنے آچکی ہے کہ ہماری تمام پریشانیاں دراصل اللہ و رسول کی مخالفت اور گناہوں کی وجہ سے ہیں، لہذا اس کا علاج یہی ہے کہ اللہ کی جناب میں گڑگڑا کر

توبہ اور استغفار کیا جائے، اگر اللہ نے معاف کردیا تو ہمارا سارا مسئلہ حل ہوگیا، اسی لیے استغفار پر اللہ نے بڑے وعدے فرمائے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّاراً، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَاراً وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهَاراً.﴾ (نوح: ۱۰ ـ ۱۲)

(اپنے رب سے استغفار کرو، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر بہتی بارش کرے گا، اور تمہارے مالوں اور اولاد کو زیادہ کرے گا اور تمہارے لیے باغات مقرر کرے گا اور نہریں مقرر کرے گا۔)

اس سے معلوم ہوا کہ استغفار وتوبہ کا ثمرہ وفائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بارشیں برساتے ہیں، مال واولاد میں اضافہ کرتے ہیں اور باغات ونہروں کا انتظام فرماتے ہیں، اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں بارش کا قحط ہوگیا تو آپ لوگوں کو لیکر نماز استسقاء کے لیے نکلے اور وہاں صرف استغفار کر کے واپس چلے آئے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے صرف استغفار کیا اور بارش طلب نہیں کی؟ تو فرمایا کہ میں نے تو آسمان کے پچھتروں سے جہاں سے کہ بارش ہوتی ہے پانی طلب کیا ہے، پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (۱)

حضرت حسن بصری کے پاس ایک شخص نے قحط کی شکایت کی تو فرمایا کہ استغفار کرو، ایک اور نے فقر وفاقہ کی شکایت کی تو فرمایا کہ استغفار کرو، ایک تیسرے آدمی

(۱) سنن سعید بن منصور: ۳۵۳/۵، سنن بیهقی: ۳۵۱/۳، ابن ابی شیبه: ۶۱/۶، مصنف عبد الرزاق: ۸۷/۳، تفسیر طبری: ۹۳/۲۹، تفسیر القرطبی: ۳۰۲/۱۸

نے عرض کیا کہ میرے لیے اولاد کی دعاء کیجئے، تو فرمایا کہ استغفار کرو، ایک اور شخص نے اپنے باغ کے سوکھ جانے کی شکایت کی تو فرمایا کہ استغفار کرو، حضرت صبیح کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے اس سلسلہ میں پوچھا کہ آپ نے سب کا ایک ہی جواب دیا، تو فرمایا کہ یہ میں نے اپنی جانب سے نہیں کہا ہے بل کہ اللہ تعالیٰ سورہ نوح میں یہ فرماتے ہیں۔(۱)

اور ایک حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ لَزِمَ الِاسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجاً ، وَمِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجاً ، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ.»

(جو استغفار کو لازم پکڑ لے اللہ اس کے لیے ہر غم دور ہونے کا راستہ بناتے ہیں اور ہر تنگی سے نکلنے کی سبیل کرتے ہیں اور وہاں سے اسے رزق عطا کرتے ہیں جہاں سے اسے کوئی گمان بھی نہیں ہوتا۔)(۲)

الغرض ہمارا سب سے اہم کام یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے گناہوں پر روئیں، گڑگڑائیں اور اللہ سے معافی مانگیں اور آئندہ کے لیے عہد کریں کہ گناہوں کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔

صبر و تقویٰ

ایک بات یہ ہے کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں

---

(۱) تفسیر قرطبی:۳۹۲/۱۸

(۲) أبو داؤد ، سنن بیهقی: ۳۵۱/۳،معجم اوسط:۲۴۰/۶،سنن کبری للنسائی: ۱۱۸/۶، ابن ماجه، مسند احمد، مستدرک حاکم:۲۹۱/۴،قال الحاکم: صحیح الاسناد

اللہ تعالیٰ کا منشاء ومرضی یہ ہے کہ ہم صبر وتقوی کا خصوصی اہتمام کریں، کیونکہ یہ سب -جیسا کہ عرض کیا گیا- اللہ کی جانب سے ہماری آزمائش وابتلاء کے طور پر ہے، اور اس سلسلہ میں اسی کا حکم دیا ہے کہ صبر وتقوی اختیار کرو، ایک جگہ فرمایا کہ:

﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَ أَنْفُسِكُمْ ، وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوْا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا أَذًى كَثِيْراً ، وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾

(آل عمران: ۱۸۶)

(تم ضرور بالضرور تمہاری جانوں اور مالوں کے بارے میں آزمائے جاؤ گے اور تم ان لوگوں کی جانب سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور مشرکین کی جانب سے بہت کچھ تکلیف دہ باتیں سنو گے، اور اگر تم نے صبر کیا اور تقوی اختیار کیا تو یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔)

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا:

﴿إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ، وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لاَ يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ (آل عمران: ۱۲۰)

(اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو یہ بری لگتی ہے اور اگر تمہیں برائی پہنچتی ہے تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں، اور اگر تم لوگ صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو تمہیں ان کی سازش کچھ بھی نقصان نہ دے سکے گی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے سب کرتوتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔)

ان آیات میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ صبر وتقوی میں ہماری کامیابی ہے اور

ان کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی کا کید و مکر و سازش کچھ بھی نقصان نہیں دے سکتی۔ یہ اللہ کا پاکیزہ و مقدس کلام ہے جس کی صداقت وسچائی میں کسی ادنی سے ادنی مسلمان کو بھی شک وشبہ نہیں ہوسکتا، اس نے یہ راز ہمارے لیے فاش کیا کہ ان حالات میں فتح وکامیابی، نجات وکامرانی کا راستہ صبر وتقوی ہے۔

صبر وتقوی کی حقیقت

اب یہ دیکھنا ہے کہ صبر کیا ہے اور تقوی کس کو کہتے ہیں؟ صبر کے معنے نفس کو اس کے خلاف پیش آنے والی باتوں پر کنٹرول کرنے کے ہیں، لہذا نفس کو خواہشات سے بچانا اور اللہ کے حکموں پر لگانا ہی صبر ہے اور تقوی اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنے کا نام ہے، لہذا جو شخص اپنے کو خواہشات سے بچاتا ہو اور اللہ کی مرضیات پر چلتا ہو اور اس سے ڈر کر زندگی گزارتا ہو اس کو کسی کا مکر وفریب اور اس کے خلاف کوئی کوشش وسازش نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

مشہور مفسرِ قرآن علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: اے مؤمنو! اگر تم اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی اتباع اور منع کردہ باتوں سے اجتناب پر صبر کرو یعنی اس پر جم جاؤ جیسے یہود کو اپنا دوست بنانے وغیرہ سے بچتے رہو اور جو باتیں تم پر اس نے لازم کی ہیں اور اپنے رسول کے حقوق واجب کئے ہیں ان میں حد سے تجاوز نہ کرو تو تم کو ان یہود کی سازش نقصان نہ دے گی''۔(۱)

---

(۱) تفسیر طبری: ۴/۲۱۳

اور علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ”روح المعاني“ میں فرماتے ہیں:

”تمہیں صبر و تقوی کی برکت سے ان (کفار) کی سازش سے، نہ زیادہ نہ کم، کسی طرح کا نقصان نہ ہوگا کیونکہ یہ دونوں محاسنِ طاعات و مکارمِ اخلاق میں سے ہیں، اور جو ان سے متصف ہوتا ہے وہ اللہ کے سایہ اور اس کی حمایت میں ہوتا ہے اس بات سے کہ دشمن کی سازش اس کو نقصان دے“۔ (۱)

معلوم ہوا کہ شریعت پر جماؤ اور استقامت کے بغیر مؤمن کی کامیابی کا کوئی تصور نہیں، اگر کامیابی و کامرانی چاہئے تو ضروری طور پر ہمیں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

ایک رومی سپہ سالار کا حیرت انگیز انکشاف:

علامہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ ”البدایہ والنہایہ“ میں یہ عجیب وغریب واقعہ بیان کیا ہے کہ ہرقل کے زمانے میں ایک رومی فوج کا مسلمانوں سے مقابلہ ہوا اور رومی فوج کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا، یہ شکست خوردہ رومی فوج جب واپسی کے موقع پر ہرقل سے ملتی ہے جب کہ ہرقل مقام انطاکیہ میں مقیم تھا، تو وہ ان رومیوں کی شکست کی خبر سن کر سوال کرتا ہے۔

أخبروني عن هؤلاء القوم الذين يقاتلونكم ،أليسوا بشراً مثلكم؟

(مجھے اس قوم کے بارے میں بتاؤ جس کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہوا ہے، کیا وہ تم ہی جیسے انسان نہیں تھے؟)

فوجیوں نے اس کے جواب میں کہا کہ: ہاں! وہ ہم ہی جیسے انسان تھے جن سے ہمارا مقابلہ ہوا۔

---

(۱) روح المعاني: ۴۱/۴

اس پر ہرقل دوسرا اور بامعنی سوال کرتا ہے کہ: اچھا بتاؤ کہ تعداد میں وہ زیادہ تھے یا تم؟"
فوجیوں نے کہا کہ: ہم زیادہ تھے۔
ہرقل تیسرا سوال یہ کرتا ہے کہ: جب وہ تم جیسے انسان تھے اور تعداد میں تم سے کم تھے تو پھر تمہاری شکست کھا جانے کی کیا وجہ ہے؟
اس کا جواب اس رومی سپہ سالار نے بڑا عجیب دیا، اس نے کہا:

" من أجل أنهم يقومون الليل و يصومون النهار ويوفون بالعهد و يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و يتناصفون بينهم "

(ان (مسلمانوں) کی فتح اس وجہ سے ہوئی کہ وہ راتوں میں کھڑے ہوکر نماز پڑھتے ہیں اوردن میں روزہ رکھتے ہیں، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں، عہد پورا کرتے ہیں اور آپس میں انصاف کرتے ہیں۔)

اور کہا کہ:

"من أجل أنا نشرب الخمر و نزني و نركب الحرام و ننقض العهد و نغضب و نظلم و نأمر بالسخط و ننهى عما يرضي الله و نفسد في الأرض "

(ہماری شکست اس وجہ سے ہوئی کہ ہم شرابیں پیتے، زنا کرتے، عہد کو توڑتے، حرام چیزوں کو اختیار کرتے، برائی کو پھیلاتے اور اللہ کی مرضیات سے روکتے، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔)

یہ سن کر رومی بادشاہ ہرقل نے کہا کہ تم نے سچ کہا۔ (۱)

(۱) البدایہ والنہایہ : ۷/۱۵

یہ جواب دینے والا کوئی مسجد کا ملا اور (لوگوں کی اصطلاح کے مطابق) مدرسہ کا بانی نہیں بل کہ وہ تو مسلمان بھی نہیں؛ مگر جس چیز کو اس نے دیکھا بھلا وہ اس کی تکذیب کیسے کرسکتا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ یہ فتح وکامرانی جو مسلمانوں کو ہوئی اس کے لیے نہ ان کے پاس ایسی فوجی تعداد وطاقت تھی نہ اس کے لیے دیگر اسباب وآلات اور ہتھیار موجود تھے اس کو دیکھ کر اس ایرانی سپہ سالار کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ ان کی فتح ان صفات مقدسہ واوصاف قدسیہ کا نتیجہ ہے اور ان پاکیزہ اعمال واخلاق کی سحر کاری ہے۔

اندلس کی فتح اور اہل اسلام کا ایمان وتوکل

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کے ایسے واقعات تاریخ وسیر کے سیکڑوں صفحات بل کہ ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، اور صحابہ کے دور کے بعد بھی جب تک مسلمانوں میں ایمان وتوکل علی اللہ اور تعلق مع اللہ کی صفات موجود تھیں، ایسے واقعات کی کمی نہیں تھی۔

خلیفۃ المسلمین ولید بن عبدالملک کے دور میں طارق بن زیاد جب اندلس کو فتح کرنے سات ہزار کی مختصر فوج لے کر چار بڑی بڑی کشتیوں میں سوار اندلس کے ساحلی علاقہ ''جبل الطارق'' پر اترتا ہے تو باوجود مختصر سی فوج کے اس ساحلی پٹی کو بغیر کسی مزاحمت کے فتح کرتا چلا جاتا ہے، اس وقت اندلس پر جس بادشاہ کی حکومت تھی وہ عیسائی تھا اور عربی تاریخوں میں اس کا نام ''لزریق'' لکھا ہے اور انگریزی تواریخ اس کو ''راڈرک'' کے نام سے یاد کرتی ہیں، جب بادشاہ نے یہ دیکھا تو اپنے سپہ سالار تدمیر کے ساتھ تیس ہزار کی فوج کو تمام ساز وسامان اور ہتھیاروں سے آراستہ کرکے میدان میں بھیجا اور دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوتا رہا اور پے در پے کئی لڑائیاں ہوئیں

اور ہر موقعہ پر تدمیر اور اس کی فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور ان ہزیمتوں نے ان کے حوصلے پست کر دیئے، آخر کار تنگ آ کر تدمیر نے اپنے بادشاہ راڈرک کو لکھا کہ یہ قوم جس سے ہمیں سابقہ پڑا ہے وہ معلوم نہیں کہاں سے آئی ہے آسمان سے نازل ہوئی ہے یا زمین سے ابلی ہے، لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ خود اس کی سرکوبی کے لیے آئیں۔

بادشاہ راڈرک نے ستر ہزار کی فوج کے ساتھ اس طرف رخ کیا، اور پہلی فوج کے ساتھ ملکر اس کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہوگئی، جو تمام ہتھیارات سے لیس تھی، اور دوسری طرف مسلمانوں کی فوج ہے جو نہ پورے طور پر ہتھیارات سے لیس ہے اور نہ تعداد میں ان سے کوئی نسبت رکھتی ہے، طارق کے ساتھ سات ہزار افراد آئے تھے، پھر خلیفہ کی طرف سے اور پانچ ہزار کی فوج آکر ان سے مل گئی، اس طرح کل بارہ ہزار کی فوج ہوئی۔ اور دونوں فوجیں وادی لکہ کے مقام پر اُتریں، اور پھر مقابلہ ہوا اور مسلسل آٹھ دن یہ جنگ چلتی رہی، اور بالآخیر فتح و کامیابی مسلمانوں کے حصہ میں آئی اور عیسائی فوج رسوا و پسپا ہوئی اور خود راڈرک بھی قتل ہوگیا۔ (۱)

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ طارق بن زیاد جب ساحل اندلس پر اُترا تو اس نے اپنی فوج کو سب سے پہلے یہ حکم دیا ہے کہ ان کشتیوں کو جلا دو، پھر فوج سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ اس لیے یہ حکم میں نے دیا ہے کہ تم کو معلوم ہوجائے کہ تمہارے پیچھے سمندر ہے اور آگے طاقتور دشمن ہے، نہ تم آگے جاسکتے ہو، نہ فرار ہونے کے لیے پیچھے جاسکتے ہو، اب صرف خدا کے بھروسہ جہاد کرو اور یہاں اندلس میں اسلام کا پرچم لہراؤ۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھو: الکامل لابن الاثیر: ۴/۱۷۶-۱۷۷، تاریخ طبری: ۴/۱۱، خلافت اندلس از نواب ذوالقدر جنگ بہادر، ص: ۶۸-۷۶

علامہ اقبال نے اسی کو اپنے اشعار میں کہا ہے:

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطا ست

(طارق نے جب اندلس کے ساحل پر کشتی جلادی، تو لوگوں نے کہا کہ عقلمند کی نگاہ میں یہ غلط ہے)

دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم؟
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا روا ست

(ہم اپنے وطن سے دور ہیں، واپس کیسے جائیں گے؟ اسباب کا ترک کرنا شریعت میں کہاں جائز ہے؟)

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ما ست کہ ملک خدائے ما ست

(طارق ہنسا اور اپنی تلوار پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ ہر ملک ہمارا ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کا ملک ہے)

غور کرنا چاہئے کہ یہ کونسی طاقت تھی جس نے مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا اور ان کو سربلندی اور عزت عطا کی؟ یہ صرف ایمانی قوت وطاقت تھی اللہ پر اعتماد وتوکل کی برکت تھی اور تعلق مع اللہ کی کرشمہ سازی تھی۔

دین کے بارے میں ہماری افسوس ناک حالت:

مگر جب ہم سے یہ صفات وخصوصیات اور یہ قدسی اوصاف وکمالات رخصت ہوگئے اور ہم خدائی احکامات سے روگردانی، سیرت وسنت رسول اللہ سے بغاوت و سرکشی، نیکیوں سے غفلت ولاپروائی، منکرات ومحرمات میں انہماک ومشغولی اور نفس

وشیطان کی اطاعت وپیروی کے عادی ہوگئے تو ہم پر خدائی اصول وقانون اور تقدیر الٰہی کے فیصلہ کے مطابق ذلت ونکبت، ضعف وکمزوری، نزول وادبار اور انحطاط وپستی لائی گئی ہے اور ہر قوم کے سامنے ذلیل وخوار پست ہمت ہو چکے ہیں۔

نماز کی اہمیت اور ہماری غفلت

نماز اسلام کا ایک ایسا رکن وستون ہے جس کے بارے میں اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جس نے اس کو ڈھایا اس نے اسلام کو ڈھادیا۔

مگر آج ہم مسلمانوں میں نماز سے کس قدر غفلت ہے بل کہ اس کو کیسا لا یعنی وفضول کام سمجھ رکھا ہے یہ سب کو معلوم ہے۔ غور فرمایئے کہ آج ہماری مسجدوں میں پانچ فی صد مسلمان بھی نہیں آتے اور مسجدیں ویران ہیں۔ اس کے باوجود ہم پر رحمت ہی کے فیصلے ہوں گے؟ یا ذلت ونکبت کے اور انحطاط وپستی کے؟

ظاہر ہے کہ ہم اسلاف کے ستون کو اور خود اسلام کو ڈھا کر فتح ونصرت، رحمت وعزت کے طالب ہوں گے تو ہماری سنی نہیں جائے گی، مسلمان کی دنیوی عزت اور فتح وکامیابی بھی اسلام کے حکموں پر چلنے میں ہے اور نماز ان میں سے اہم ترین حکم ہے۔

حجاج بن یوسف کا ایک مکتوب

حجاج بن یوسف جو اسلامی سربراہوں اور حاکموں میں سب سے زیادہ ظالم اور ناعاقبت اندیش مشہور ہے، اس نے سندھ کے گورنر محمد بن قاسم فاتح سندھ کے نام ایک خط لکھا جب کہ محمد بن قاسم کا راجہ داہر کی زبردست ہاتھیوں کی فوج سے مقابلہ ٹھن گیا تھا اس خط کو مولانا اکبر شاہ مورخ اسلام کی کتاب ''آئینہ حقیقت نما'' کے حوالہ سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے حیاۃ المسلمین کے مقدمہ کی شرح میں نقل کیا ہے۔ حجاج کے خط کا مضمون یہ ہے:

’’ پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ کرو، تکبیر و قرأت، قیام وقعود اور رکوع وسجود میں اللہ تعالیٰ کے روبرو تضرع وزاری کیا کرو، زبان پر ہر وقت ذکر الٰہی جاری رکھو، کسی شخص کو شوکت وقوت خدا تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی، اگر تم خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھو گے تو یقیناً مظفر ومنصور ہو گے۔ (۱)

اس خط کو نقل کر کے حضرت مفتی شفیع صاحب نے لکھا ہے۔

یہ کسی حجرہ نشین ملا کی تلقین یا کسی خانقاہ کی تعلیم نہیں ہے، ایک رعب وداب والے با اختیار امیر (وائسرائے) کا فرمان ہے اور امیر بھی وہ کوئی خلفاء راشدین میں سے نہیں، صلحاء ومتقین میں سے نہیں، سب سے زیادہ بدنام امیر ہے، مگر خدا ترسی نہ سہی دنیا طلبی اور حکومت وسلطنت کی خواہش ہی کے سبب سہی، اتنی بات پر وہ بھی کامل یقین رکھتا ہے اور اپنے ماتحت حکام کو اس کا فرمان بھیجتا ہے کہ یہ ہماری عبادت نماز، روزہ اور دیگر احکام قرآنیہ کی اطاعت ہی ہمارے فتح وظفر کی روح ہے اور ہماری ہر دینی ودنیوی کامیابی اس میں مضمر ہے۔ (۲)

غرض یہ کہ نماز بہت اہم عبادت ہے، اس میں کوتاہی تباہی وہلاکت کا باعث اور انحطاط وذلت کا سبب ہے، مگر امت کا بیشتر حصہ اس سے اس طرح غافل ہے جیسے کوئی معمولی بات ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکام کے نام خط

حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسلامی مملکت کے تمام عمال وحکام کے نام ایک خط جاری فرمایا تھا، اس میں وہ فرماتے ہیں:

(۱) مقدمہ حیاۃ المسلمین:۳۴

(۲) مقدمہ حیاۃ المسلمین:۳۵

’’ إن أهمّ أمرِكُم عِندِيْ الصَّلاةُ ، فَمَنْ حَفِظَهَا وحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَه وَ مَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ‘‘

(میرے نزدیک تمہارے تمام امور میں سب سے اہم کام نماز ہے، جس نے اس کی حفاظت کی اور اس کی پابندی کی اس نے اپنے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کیا وہ دوسرے کاموں کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔)(۱)

ایک صحابی کا حیرت انگیز حال

صحابہ میں نماز کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب کیا اور فرمایا کہ خالد بن سفیان الھذلی میرے خلاف لوگوں کو جمع کر رہا ہے تا کہ مجھ سے لڑے ،لہذا تم جاکر اس کو قتل کردو، حضرت عبداللہ بن انیس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ذرا اس کی نشانی بیان کیجئے تا کہ میں اس کو پہچان سکوں، آپ نے فرمایا کہ جب تم اس کو پاؤ تو اس پر کپکپی دیکھو گے، وہ فرماتے ہیں کہ میں تلوار سے اپنے کو لیس کیا اور نکلا ، جب وہاں پہنچا تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، میں نے سوچا کہ اگر میں اس سے ملوں گا تو ہوسکتا ہے کہ نماز چھوٹ جائے لہٰذا میں نے چلتے چلتے ہی نماز شروع کردی اور رکوع وسجدہ کا اشارہ کرتا رہا، پھر آگے کا واقعہ بیان کیا ہے۔(۲)

اللہ اکبر! کیا حال تھا ان حضرات کا کہ اس سخت ترین حالت میں بھی سب سے

(۱) مؤطا امام مالک:۵

(۲) مسند ابو یعلی:۲/۲۰۲،موارد الظمآن :۱/۱۵۵، ابن ابی شیبہ:۲/۲۲۳،تاریخ طبری :۲/۲۰۸،سیرت ابن ہشام:۶/۲۱

پہلے نماز کا اہتمام فرماتے ہیں، اس خیال سے کہ کہیں لڑائی میں نماز نہ چلی جائے۔
اس سے ہم کو عبرت لینے کی ضرورت ہے، آج نوجوان لوگ بالخصوص نماز سے جس قدر غافل ہیں، وہ واضح ہے، اس کے باوجود وہ جہاد کی باتیں کرتے ہیں۔

زکوۃ میں کوتاہی کا وبال

اسی طرح زکوۃ میں کوتاہی، ذلت ورسوائی اور ہلاکت وتباہی کا سبب ہے، جیسا کہ اوپر حدیث گزری ہے کہ جب کوئی قوم زکوۃ دینا بند کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بارانِ رحمت بند کرے گا۔ (۱)

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے لوگوں کے مال کو تباہ وہلاک کر دیا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں باغ والوں کا قصہ نقل کیا گیا ہے۔
جس کا خلاصۂ تفسیر یہ ہے:

ملک یمن کا حبشہ میں ایک شخص کا باغ تھا وہ اس باغ کے پھل کا ایک بڑا حصہ غریبوں مسکینوں میں صرف کرتا تھا۔ جب وہ مر گیا اور اس کی اولاد اس کی وارث ہوئی تو ان لوگوں نے کہا کہ ہمارا باپ احمق تھا کہ اس قدر آمدنی مسکینوں کو دیدیتا تھا اگر یہ سب باقی رہے تو کس قدر فراغت ہوگی۔ چنانچہ ایک مرتبہ قسم کھا کر یہ کہنے لگے کہ کل صبح چل کر باغ کا پھل ضرور توڑ لیں گے۔ انشاء اللہ بھی نہ کہا، اور سو گئے، صبح اٹھ کر ایک دوسرے کو چلنے کے لیے پکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو، اگر تم کو پھل توڑنا ہے پھر آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے چلے آئے کہ تم تک کوئی مسکین نہ آنے پائے جب باغ کے پاس پہنچے اور یہ دیکھا کہ باغ تو پورا صاف ہو گیا تھا اور کوئی چیز موجود نہیں ہے جیسے کھیت کو کاٹ لینے کے بعد جلا کر صاف کر دیا جاتا ہے تو کہنے لگے ہم راستہ بھول کر

(۱) ابن ماجہ:۴۰۰۹

کسی اور جگہ آ گئے ہیں، پھر جب غور کرنے کے بعد یقین ہوا کہ یہی ہمارے باغ کی جگہ ہے ہم بھولے نہیں ہیں تو کہنے لگے کہ " بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ" کہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی ہے، پھر آپس میں ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگے۔(۱)

علماء نے تصریح کی ہے کہ ان پر یہ عذاب اسی لیے آیا کہ انہوں نے مساکین کا حق جو اللہ نے فرض کیا ہے وہ ادا نہیں کیا۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں یہ سزا اس سبب سے ہوئی ہے کہ انہوں نے مساکین (کا حق دینے سے) انکار کا ارادہ کیا تھا۔(۲)

حاصل یہ ہے کہ ہمارے اموال کی تباہی اور دوسروں کا ان پر قبضہ کر لینا یہ سب اس سبب سے ہوتا ہے کہ زکوۃ جیسا اہم فریضہ ہماری کوتاہی وغفلت کی نذر ہو جاتا ہے۔

صدقہ گناہ کو اور اللہ کے غصہ کو بجھا دیتا ہے

اور اس کے بالمقابل جب آدمی اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے، زکوۃ و صدقات کا اہتمام کرتا ہے تو اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا غصہ و غضب بجھ جاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ . »

(صدقہ خطاء کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔)(۳)

(۱) القلم: ۱۷-۳۲، تفسیر قرطبي: ۲۰/۲۴۰، روح المعاني: ۲۹/۲۳-۲۴، معارف القرآن: ۸/۵۲۶

(۲) قرطبي: ۲۰/۲۴۰

(۳) ترمذی: ۵۵۸، ابن ماجہ: ۳۹۶۳، احمد: ۱۳۹۱۹

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ عَنْ مِيتَةِ السُّوْءِ.»

(بلا شبہ صدقہ رب کے غصہ کو بجھاتا ہے اور بری موت کو دفع کرتا ہے۔)(۱)

جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا غضب وغصہ بجھ جائیگا اور اللہ تعالیٰ گناہوں وخطاؤں کو معاف کردے گا تو ظاہر ہے کہ عذابات کا سلسلہ بھی بند وختم ہو جائے گا، بل کہ اس کے بجائے نعمتوں کا سلسلہ جاری ہو جائے گا۔

ایک انگریز کا واقعہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے آپ بیتی میں اپنے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحب رَحِمَہُ اللہُ اور بعض لوگوں کے حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے جو نہایت ہی حیرت انگیز اور قابل عبرت ہے، وہ یہ کہ ضلع سہارنپور میں ''بہٹ'' سے آگے انگریزوں کی کچھ کوٹھیاں تھیں، اس کے قرب وجوار میں بہت سی کوٹھیاں کاروباری تھیں جن میں ان انگریزوں کے کاروبار ہوتے تھے اور ان کے مسلمان ملازم کام کیا کرتے تھے اور وہ انگریز دہلی، کلکتہ وغیرہ بڑے شہروں میں رہتے تھے، کبھی کبھی معائنہ کے طور پر آکر اپنے کاروبار کو دیکھ جاتے تھے، ایک دفعہ اس جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری کوٹھیاں جل گئیں ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز آقا کے پاس دہلی بھاگا ہوا گیا اور جا کر واقعہ سنایا کہ ''حضور! سب کی کوٹھیاں جل گئیں اور آپ کی بھی جل گئی'' وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا، نہایت اطمینان سے لکھتا رہا

---

(۱) ترمذي:٦٦٠

اس نے التفات بھی نہیں کیا۔ ملازم نے دوبارہ زور سے کہا کہ ''حضور! سب جل گیا'' اس نے دوسری دفعہ بھی لاپرواہی سے جواب دے دیا کہ میری کوٹھی نہیں جلی اور بے فکر لکھتا رہا، ملازم نے جب تیسری دفعہ کہا تو انگریز نے کہا ''میں مسلمانوں کے طریقہ پر زکوۃ ادا کرتا ہوں اس لیے میرے مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا'' وہ ملازم تو جواب دہی کے خوف کے مارے بھاگا ہوا گیا تھا کہ صاحب کہیں گے کہ ہمیں خبر بھی نہیں کی، وہ انگریز کے اس لاپرواہی سے جواب کو سن کر واپس آ گیا، آ کر دیکھا تو واقع میں سب کوٹھیاں جل چکی تھیں مگر اس انگریز کی کوٹھی باقی تھی۔ (۱)

ایک اور حیرت انگیز واقعہ

ایک واقعہ اسی نوع کا حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحب رحمۃ اللہ نے انہی کے ایک متعلق کا نہایت حیرت انگیز بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''مظاہر علوم سہارنپور کے ابتدائی محسنین میں سے ایک صاحب حافظ فضل حق تھے، ان کا تکیہ کلام تھا'' اللہ کے فضل سے، ہر بات میں یہی کہا کرتے تھے کہ اللہ کے فضل سے یہ ہوا، اللہ کے فضل سے وہ ہوا، ایک مرتبہ انہوں نے حضرت مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ سے صبح کو یہ عرض کیا کہ حضرت جی! رات تو اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب ہو گیا، حضرت بھی یہ فقرہ سن کے ہنس پڑے، اور دریافت کیا کہ حافظ جی! اللہ کے فضل سے اللہ کا کیا غضب ہو گیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ رات میں سو رہا تھا اور مکان میں میں اکیلا ہی تھا، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تین چار آدمی میرے کوٹھے کے کواڑوں کو چمٹ رہے ہیں، میں نے ان سے بیٹھ کر پوچھا کہ ابے تم چور ہو؟ کہنے لگے ہاں ہم چور ہیں، میں نے کہا کہ سنو، میں شہر کے رؤساء میں سے ہوں اور مدرسہ کا خزانہ بھی میرے پاس

(۱) آپ بیتی: ۸۰/۲

ہے، اور سارا کا سارا اسی کوٹھے میں ہے، اور یہ تالا جو اس کو لگ رہا ہے چھ پیسہ کا ہے، تمہارے باپ دادا سے بھی نہیں ٹوٹنے کا، تم تو تین چار ہو دس بارہ کو اور بلا لو، اور اس تالے کو ٹھوکتے رہو، یہ ٹوٹنے کا نہیں، میں نے حضرت جی (حضرت مولانا مظہر صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ) سے سن رکھا ہے کہ جس مال کی زکاۃ دے دی جائے وہ اللہ کی حفاظت میں ہو جاتا ہے، میں نے اس مال کی زکوۃ جتنی واجب ہے اس سے زیادہ دے دی ہے، اس لیے مجھے اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں، اللہ میاں اپنے آپ حفاظت کریں گے۔ حضرت جی! اللہ کے فضل سے میں تو یہ کہہ کر سو گیا، میں جب پچھلے پہر کو اُٹھا تو وہ لپٹ رہے تھے، میں نے کہا کہ ارے میں نے تو کہہ دیا تھا کہ دس بارہ کو اور بلا لو، تو اللہ کے فضل سے ٹوٹنے کا نہیں، حضرت جی! یہ کہہ کر میں تو اللہ کے فضل سے نماز میں لگ گیا اور جب اذان ہو گئی تو میں ان سے یہ کہہ کر کہ میں تو نماز کو جا رہا ہوں، تم اس کو لپٹتے رہو۔
پھر حضرت جی! اللہ کے فضل سے وہ سب بھاگ گئے۔ (۱)

گناہوں سے کلی اجتناب

ہمارے لیے ایک بہت اہم کام یہ ہے کہ تمام گناہوں کو ترک کر دیں اور ان سے کلی اجتناب کریں، کیوں کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کا غصہ بھڑک اُٹھتا ہے، لہٰذا اس کی رضا و خوشنودی کے لیے ہمیں چاہئے کہ تمام گناہوں کو چھوڑ دیں اور ان سے بچیں، بالخصوص وہ گناہ جن پر اللہ کا غضب زیادہ بھڑکتا ہے۔ میں یہاں ہمارے حالات کے لحاظ سے چند کی جانب اشارہ کرتا ہوں:

گانے بجانے کی لعنت

مسلم معاشرے کی تباہی اور انحطاط کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گانا

(۱) آپ بیتی: ۲/ ۷۸-۷۹

بجانا ان میں عام ہو گیا ہے اور اس سلسلہ میں ان میں اور غیر قوموں میں بظاہر کوئی امتیاز نہیں نظر آتا، حالانکہ اس کی حرمت پر بے شمار دلائل ہیں، اور اس پر سخت ترین وعیدیں بھی ہیں۔ مثلاً:

« عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ﷺ مَرْفُوْعًا: يُمْسَخُ قَوْمٌ مِّنْ أُمَّتِيْ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَيَشْهَدُوْنَ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَأَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، قَالَ: نَعَمْ وَيُصَلُّوْنَ وَيَصُوْمُوْنَ وَيَحُجُّوْنَ، قَالُوْا: فَمَا بَالُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: اِتَّخَذُوا الْمَعَازِفَ وَالْقَيْنَاتِ وَالدُّفُوْفَ وَيَشْرَبُوْنَ هٰذِهِ الْأَشْرِبَةَ فَبَاتُوْا عَلٰى لَهْوِهِمْ، فَأَصْبَحُوْا قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ. » (1)

(حضرت ابوہریرہ ﷺ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آخری زمانہ میں میری امت کے کچھ لوگ بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ ہو جائیں گے، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہوں گے؟ فرمایا: ہاں، وہ (برائے نام) نماز، روزہ، اور حج بھی کریں گے، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! پھر ان کا یہ حال کیوں ہوگا؟ فرمایا: وہ آلاتِ موسیقی، رقاصہ عورتوں اور طبلہ اور سارنگی وغیرہ کے رسیا ہوں گے اور شرابیں پیا کریں گے (بالآخر) وہ رات بھر مصروفِ لہو ولعب رہیں گے اور صبح ہو گی تو بندر اور خنزیروں کی شکل میں مسخ ہو چکے ہوں گے۔ (معاذ اللہ)

---

(۱) أبو نعيم في حلية الأولياء: ۱۱۹/۳، ابن ابی الدنیا فی ذم الملاهی: ۷۹/۱، سعید بن منصور فی السنن کما فی المحلیٰ لابن حزم الظاهری: ۵۶۴/۷

اس حدیث میں ان مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو بظاہر نمازی بھی ہوں گے، روزہ کے پابند بھی ہوں گے اور حج پر حج بھی کریں گے، مگر اسی کے ساتھ گانے بجانے، ناچنے نچانے اور ڈھول باجے اور میوزک و موسیقی کے دلدادہ اور شراب کے عادی اور رسیا ہوں گے، ان کو اللہ تعالیٰ خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیں گے، یہ لوگ رات بھر مصروفِ لہو ولعب رہ کر سوئیں گے اور جو صبح اٹھیں گے تو مسخ شدہ اٹھیں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

«عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: يَبِيْتُ قَوْمٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى طَعَامٍ وَ شَرَابٍ وَ لَهْوٍ، فَيُصْبِحُوْنَ قَدْ مُسِخُوْا قِرَدَةً وَ خَنَازِيْرَ، وَلَيُصِيْبَنَّهُمْ خَسْفٌ وَ قَذْفٌ حَتّٰى يُصْبِحَ النَّاسُ فَيَقُوْلُوْنَ: خُسِفَ اللَّيْلَةَ فُلَانٌ أَوْ خُسِفَ اللَّيْلَةَ بِبَنِيْ فُلَانٍ، وَلَيُرْسِلَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ الَّتِيْ أَهْلَكَتْ عَاداً بِشُرْبِهِمُ الْخَمْرَ وَأَكْلِهِمُ الرِّبَا وَاتِّخَاذِهِمُ الْقَيْنَاتِ وَلُبْسِهِمُ الْحَرِيْرَ وَ قَطِيْعَتِهِمُ الرَّحِمَ.» (۱)

(حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت میں سے ایک قوم حرام کھانے، شراب اور لہو ولعب میں رات گزارے گی، پس صبح کریں گے تو بندروں اور سوروں کی شکل میں مسخ ہو چکے ہوں گے، اور ان کو زمین میں دھنسایا جائے گا

(۱) ذم الملاهي لابن ابي الدنيا: ۱/ ۶۸

اور اوپر سے ان پر پتھر برسائے جائیں گے، یہاں تک کہ لوگ صبح میں کہیں گے کہ رات فلاں کو، فلاں کے بچوں کو زمین میں دھنسا دیا گیا، اور ان لوگوں پر ان کے شراب پینے، سود کھانے، گانے بجانے والیوں کو رکھنے، ریشم پہننے اور رشتہ توڑنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ وہ سخت ہوا چھوڑے گا جس نے قوم عاد کو ہلاک کیا تھا۔)

ان حدیثوں سے گانے بجانے کی حرمت صاف طور پر ثابت ہوتی ہے، لہٰذا ولیمہ یا شادی یا کسی اور تقریب کے موقعہ پر یا بلا تقریب یوں ہی گانا بجانا حرام و ناجائز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں گانا بجانا، رقص و ناچ حرام ہے۔ افسوس کہ آج بہت سے دیندار کہلانے والے اور نمازوں اور روزوں کے پابند اور حج پر حج کرنے والے اور عمرے پر عمرے کرنے والے لوگ بھی اپنے گھروں میں ٹی وی رکھ کر اس کا استعمال گانے بجانے اور فلموں اور ناچ و رقص دیکھنے کیلئے کرتے ہیں اور تقریبات، شادیوں اور ولیموں کے موقعہ پر بلا روک ٹوک یہ ساری برائیاں عام ہو چکی ہیں، اور اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ موبائیل فون میں بھی گانے بجانے کی سہولت نے نیک کہلانے والوں کو بھی اس میں ملوث کر دیئے ہے، حتیٰ کہ اس کی وجہ سے مساجد بھی گانے بجانے کی آواز سے محفوظ نہیں رہے۔

اس صورت حال میں ہم اللہ سے مدد و نصرت اور عافیت و راحت کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں جب کہ ہمارے کام ایسے ہیں جو اللہ کے عذاب و قہر کو دعوت دے رہے ہیں؟

بے حیائی، فحاشی، عریانی اور خدائی عذابات

ایک اور خاص بات جس میں آج بہت زیادہ غفلت برتی جارہی ہے یہ ہے کہ

بے حیائی، عریانی اور فحاشی عام ہوگئی ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس سے خدا کا غضب بھڑک اٹھتا ہے اور خدا کی غیرت کو جوش آتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس قوم میں بے حیائی عام ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس میں طاعون پھیلا دیتے ہیں۔ (۱)

محدث ابن ابی الدنیا نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک شخص نے کہا کہ زلزلہ کے بارے میں بیان فرمایئے، تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ جب لوگ زنا کو مباح کام کی طرح بے باکی سے کرنے لگتے ہیں اور شرابیں پیتے ہیں اور معازف (باجے) بجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو آسمان پر غیرت آتی ہے اور زمین کو حکم فرماتے ہیں کہ ان کو ہلا ڈال۔ (۲)

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں زلزلہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اے لوگو! یہ کیا ہے؟ تم نے کس قدر جلدی نئی نئی باتیں ایجاد کر لی ہیں؟ اگر دوبارہ ایسا ہوا تو میں تمہارے درمیان نہیں رہوں گا۔ (۳)

اور جعفر بن برقان کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے (تمام شہروں میں) لکھ بھیجا:

”إن هذا الرجف يعاقب الله به العباد ، وقد كتبت إلى الأمصار أن يخرجوا يوم كذا من شهر كذا ،فمن كان عنده شيء فليتصدق“

(یہ زلزلہ اللہ کا عقاب ہے جس سے وہ بندوں کو سزا دیتا ہے، میں نے تمام شہروں میں لکھ بھیجا ہے کہ وہ فلاں دن فلاں مہینہ میں (دعاء

(۱) الکبائر: ۳۵
(۲) العقوبات لابن ابی الدنیا: ۲۹
(۳) العقوبات لابن ابی الدنیا: ۳۱

کے لیے)نکلیں اور جس کے پاس کچھ ہو وہ صدقہ بھی دے)(۱)

بے حیائی کا تباہ کن نتیجہ ایڈز اور سوزاک اور آتشک

مذکورہ بالا حدیث کے مطابق بے حیائی اور فحاشی کے نتیجہ میں ایسی ایسی بیماریاں جنم لے رہی ہیں جن کا پہلے لوگوں کو کوئی علم نہ تھا یا ایسی بیماریاں وجود میں آرہی ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ بے حیائی کے نتیجہ میں سوزاک جیسی مہلک بیماری میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار سوازک ہمیشہ کے لیے سوزاک ہے۔ یہ پیشاب کی نالی کا ایک زخم ہے جو کبھی سوکھنے کا نام نہیں لیتا بل کہ ڈاکٹروں کے بقول یہ متعدی امراض میں سے ہے۔ اسی طرح آتشک بھی ہے، ڈاکٹر ہوکر اپنی کتاب (LAWS OF SEX) جنسی قوانین میں لکھتا ہے کہ تیس اور چالیس ہزار کے درمیان میں بچوں کی اموات صرف موروثی آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ دق کے سوا تمام امراض سے جتنی موتیں واقع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ تعداد ان اموات کی ہے جو آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ سوزاک کے متعلق ماہرین کا کم سے کم تخمینہ یہ ہے کہ ۶۰ فیصدی جوان اشخاص اس مرض میں مبتلا ہیں جن میں شادی شدہ بھی ہیں اور غیر شادی شدہ بھی۔ امراض نسوان کے ماہرین کا متفقہ بیان ہے کہ شادی شدہ عورتوں کے اعضاء جنسی پر جتنے آپریشن کیے جاتے ہیں ان میں ۷۵ فیصدی ایسی نکلتی ہیں کہ جن میں سوزاک کا اثر پایا جاتا ہے۔ (۲)

یہ سب حالات کیوں اور کس وجہ سے ہیں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ بے حیائی اور فحاشی کی وجہ سے ہے جیسا کہ خود ڈاکٹروں اور ماہرین کا فیصلہ ہے۔

---

(۱) العقوبات: ۳۲

(۲) بحوالہ ماسونیت کیا ہے تالیف ڈاکٹر عبدالرحمان عمیرہ، ترجمہ اسعد الاعظمی: ۷۸

اسی طرح ایڈز جیسی مہلک وخطرناک بیماری کے متعلق ماہرین طب کا نظریہ بل کہ فیصلہ یہ ہے کہ اس کا بڑا اسبب رگوں سے نشہ آور چیزوں کا استعمال اور جنسی اختلاط وکثرت ہے، خواہ یہ ہم جنسی کی شکل میں ہو یا بلا امتیاز ہر قسم کی عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرنے کی شکل میں ہو۔ اسی طرح عورتوں کو بھی یہ بیماری لاحق ہوتی ہے جب کہ زیادہ مردوں سے جنسی تعلق قائم کریں۔

امریکی ڈاکٹروں کے مطابق امریکہ میں (جہاں بے حیائی وفحاشی اپنے عروج کو پہنچی ہوئی ہے) تیس ہزار سے زیادہ افراد ایڈز کے مرض میں مبتلا ہیں، اور امریکی محکمۂ صحت کا اندازہ ہے کہ اس وقت امریکہ میں دس لاکھ سے زیادہ افراد ایڈز کے جراثیم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، افریقہ میں بیس لاکھ سے پچاس لاکھ تک کی تعداد ایڈز میں مبتلا ہے امریکہ کے محکمۂ صحت کے سکریٹری اوٹس باون کا کہنا ہے کہ اگر ہم بیماری کی روک تھام میں کوئی موثر پیش رفت نہ کر سکے تو آئندہ دس سال کے اندر دنیا کے کروڑوں افراد کے لیے ایک عالم گیر پیغام موت کا خوف ناک اندیشہ پیدا ہو گیا ہے اور اس کا اب تک کوئی کامیاب علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ (۱)

ان بیانات پر نظر ڈالیے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ ایک خدائی عذاب نہیں ہے جو فحاشی وعریانی اور بے حیائی کی بدولت لوگوں پر آیا ہے۔

ہندوستان میں بھی بہت سے لوگوں میں یہ مرض تشخیص ہوا ہے اس سے ڈرنا چاہئے اور اس بے حیائی سے باز آنا چاہئے۔

عورتوں کی بے پردگی

اور اس میں زیادہ دخل عورتوں کی بے پردگی کو ہے۔ آج ہمارے اندر سے پردہ

(۱) امریکی رسالہ ٹائم مورخہ ۶ فروری ۱۹۸۷ بحوالہ البلاغ کراچی رجب ۱۴۰۷

بالکل رخصت ہو گیا ہے اور ہے بھی تو وہ اسلامی و شرعی پردہ نہیں بل کہ ایک فیشن ہے جس سے اسلام کا مقصد قطعاً پورا نہیں ہوتا، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں جس قدر بے حیائی و بے پردگی میں مبتلا ہیں وہ کہنے کے لائق نہیں، اور نہ اس کے کہنے کی ضرورت ہے، اور حد یہ ہے کہ اس بے حیائی کا نام خوش اخلاقی و بلند خیالی اور روشن دماغی رکھا گیا ہے۔

اس کے ساتھ خدا سے یہ شکوہ بھی ہے کہ ہم پر رحمت و نصرت نہیں کی جاتی اور ہمیں عزت و سربلندی سے ہمکنار نہیں کیا جاتا؟ غور کیجیے اس حالت کے ساتھ رحمت و نصرت کے سلامتی و امن کے عزت و سربلندی کے فیصلے کیسے ہو سکتے ہیں؟

ٹیلی ویژن کے خطرناک جراثیم

اس بے حیائی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں ٹیلی ویژن کا سب سے زیادہ دخل ہے ،اس کی تصویروں اور خطرناک پروگراموں نے چند سالوں میں وہ کچھ کر کے دکھایا ہے جو سیکڑوں سالوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا،لوگ شرم و حیاء، غیرت و وقار کھو بیٹھے، عفت و پاک دامنی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور حیا سوز، اخلاق سوز، انسانیت سوز افعال و حرکات علی الاعلان کرنے میں بھی کوئی باک نہ رہا۔ ان چیزوں کی وجہ سے یورپی ممالک کا حال کیا ہوا؟ اس کا کچھ اندازہ درجہ ذیل بیانات سے ہو سکتا ہے جج بن لنڈ سے لکھتا ہے: امریکہ میں بچے از وقت بالغ ہونے لگتے ہیں اور بہت کچی عمر میں ان کے اندر صنفی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں۔ (۱)

امیلپورلیسی (EMILE POURCISY) اپنی ایک رپورٹ میں لکھتا ہے:

(۱) ماسونیت کیا ہے: ۴۷

''یہ گندے فوٹوگراف لوگوں کے حواس میں شدید ہیجان واختلال برپا کرتے ہیں اور اپنے بد قسمت خریداروں کو ایسے ایسے جرائم پر اکساتے ہیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں لڑکوں اور لڑکیوں پر انکا تباہ کن اثر حد بیان سے زیادہ ہے بہت سے مدرسے اور کالج انہی کی بدولت اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے برباد ہوچکے ہیں خصوصاً لڑکیوں کے لیے کوئی چیز اس سے زیادہ غارت نہیں ہوسکتی''۔ (۱)

جج بن لنڈ سے کہتا ہے:

''ہائی اسکولوں کی کم عمر والی ۴۹۵ لڑکیاں جنہوں نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ ان کو لڑکوں سے صنفی تعلقات کا تجربہ ہوچکا ہے کہ ان میں صرف ۱۲۵ ایسی تھیں جن کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ باقیوں میں سے بعض اتفاقاً بچ گئی تھیں لیکن اکثر کو منع حمل کی موثر تدابیر کا کافی علم تھا۔ یہ واقفیت ان میں اتنی عام ہوچکی ہے کہ لوگوں کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے''۔ (۲)

یہ حالت تصویر کا نتیجہ قرار دی گئی ہے اور ٹیلی ویژن کا معاملہ تو اس سے بھی آگے ہے اس کو اس پر قیاس کر کے دیکھ لیں۔

غرض یہ کہ ٹیلی ویژن کے خطرناک جراثیم لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو خراب کرچکے ہیں جس سے فحش و بے حیائی عام ہوتی جارہی ہے مگر افسوس کہ آج مسلمان بھی یہ کہتے نہیں شرماتا کہ ٹیلی ویژن سے ہماری زندگی وابستہ ہے۔ اس کے باجود رحمت کی امید، سراسر حماقت اور دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے۔

---

(۱) ایضاً ۷۵

(۲) ماسونیت کیا ہے ۷۶

عیش پرستی کا نتیجہ

ہماری تباہی وانحطاط کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم اپنے دنیا میں آنے کا سب سے بڑا اور عظیم مقصد عیش وراحت کی دنیوی زندگی کو قرار دے چکے ہیں، لہٰذا ہم زندگی کی آسانیوں، سامان راحت میں واشگافیوں اوران میں نازک خیالوں کے پیچھے پڑگئے ہیں اوران میں ترقی، ہرقسم کی نفاست میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنااورایک دوسرے پرفخر کرنا ہمارا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ دنیا کی فانی چیزوں میں بہترین صناعی اور سامان آرائش وراحت میں نزاکتیں تلاش کرنا ہمارا اہم ترین کام ہوگیا ہے مختلف تراش خراش اور نئے نئے فیشن کی چیزوں کے لیے اسفار کرنا، بازاروں کے متعدد گشت کرنااوراس کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنا ہمارا سب سے بڑا فخراور ہماری عزت کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگیا ہے۔ کھانے پینے کی مختلف قسموں کی فکر، انواع واقسام کے کپڑوں کا خیال، اوراچھے اچھے گھر، اونچے اونچے کوٹھوں اور نفیس بنگلوں پرنظرہی ہمارااوڑھنااور بچھونا بن گیا ہے، ہم میں سے معمولی وادنی آدمی بھی اس شخص کوعزت نہیں دیتا جس کے پاس اچھا گھر، خوش خوراک، بہترین سواری، کھانے پینے کے تکلفات اورلباس وپوشاک میں نزاکت وتجمل نہ ہو، غرض یہ کہ ہم پورے طور پرعیش پرستی اور فانی لذت اندوزی میں خطرناک حدتک ملوث ہوچکے ہیں اوراس کی وجہ سے آخرت سے غفلت، خدااوررسول کی تعلیمات سے بے پروائی میں مبتلا اور حلال وحرام کی تمیز سے خالی وعاری ہوچکے ہیں۔ یہ وہ خطرناک حد ہے جس پر پہنچتے ہی پہلے بڑی بڑی قوموں کو ہلاک وتباہ کردیا گیا تھا یہ آیت ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں:

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا، فَتِلْكَ

مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلاً﴾ (القصص: ۵۸)

(اور ہم بہت سی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامان عیش پر نازاں تھے سو یہ ان کے گھر ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لیے۔)

ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيراً﴾ (الإسراء: ۱۶)

(اور جب ہم کسی قریہ والوں کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پسند لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پس وہ اس میں گناہ کرتے ہیں، پھر ان پر اللہ کا قول ثابت ہو جاتا ہے، پس ہم ان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔)

لہٰذا اس سے دور ہو کر خدا کے حضور توبہ کرنا چاہئے تاکہ ہم کو ذلت و رسوائی، پستی وانحطاط کے مہیب غار سے نکال کر عزت و سر بلندی عطا کی جائے۔

اتفاق واتحاد

قرآن وحدیث سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا قرآن وسنت کی بنیاد پر آپسی اتفاق واتحاد ان کی کامیابی کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿يٰأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيراً لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا، إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ﴾

(الأنفال: ۴۵-۴۶)

(ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم دشمن کی جماعت سے مقابل ہوتو ثابت قدم رہو، اور کثرت سے اللہ کا ذکر کروتا کہ تم کامیاب ہو، اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں اختلاف مت کرو ورنہ تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، اور صبر سے رہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

نیز فرمایا گیا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾

(آل عمران: ۱۰۳)

(اور تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور آپس میں اختلاف نہ کرو۔)

اور احادیث میں بھی یہ مضمون وضاحت کے ساتھ آیا ہے، چند احادیث پیش کرتا ہوں:

(۱) ایک حدیث حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى عُضْواً تَدَاعىٰ لَهٗ سَائِرُ جَسَدِهٖ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى.»

(تو مسلمانوں کو دیکھے گا کہ وہ آپس میں محبت کرنے، رحم کرنے اور شفقت کرنے میں ایسے ہیں جیسے جسم کہ اسکے ایک عضو میں تکلیف ہوتو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں اسکا ساتھ دیتے ہیں۔)(۱)

(۱) بخاري:۵۵۵۲، مسلم:۴۶۷۵، مسند احمد:۱۷۶۴۸

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

« اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا . »

(ایک مسلمان دوسرے کے لیے ایسا ہے جیسے عمارت کہ اسکا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے)، یہ کہکر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا۔)(۱)

پہلی حدیث میں امت مسلمہ کو ایک جسم کی طرح قرار دیا ہے اور اس کے افراد کو بدن کے اعضاء کی طرح فرمایا ہے اور بتایا کہ جس طرح جسم کا ایک عضو دکھ اور درد محسوس کرتا ہے تو دوسرے اعضاء بھی بے چین ہوتے اور بے خوابی اور بخار میں سب اسکا ساتھ دیتے ہیں۔ اسی طرح امت مسلمہ کا حال ہے کہ اس کا ایک فرد بھی دکھ و درد میں مبتلا ہو تو دوسرے افرادِ امت بھی بے چین ہو جاتے ہیں یہ اتحاد کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

اسی دوسری حدیث میں امت مسلمہ کو ایک دیوار یا عمارت کے مانند قرار دیا ہے اور اس کی اینٹوں سے امت کے افراد کو تشبیہ دی ہے کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط دیوار بن جاتی ہے اسی طرح امت کے افراد جب متحد و متفق ہوں تو سیسہ پلائی دیوار کی طرح مضبوط ہوتے ہیں، لہٰذا افرادِ امت کو اس طرح ایک دوسرے کا تعاون کرنا اور ایک دوسرے کی تقویت کا ذریعہ بننا چاہیے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دینی رشتہ خونی رشتہ سے بھی مضبوط ہوتا ہے، چنانچہ اسلام نے مختلف خاندانوں اور قبیلوں کو مختلف ممالک اور مختلف زبانوں اور مختلف رنگ کے لوگوں کو دین اسلام کے ایک ایسے مضبوط رشتہ میں جوڑ دیا جو تمام رشتوں وتعلقات پر بھاری ہے اور سب سے زیادہ مضبوط بھی۔

---

(۱) بخاري:۵۵۶۷، مسلم :۴۶۸۴، ترمذي:۱۸۵۱، نسائي:۲۵۱۳، احمد:۱۸۷۹۸

اس لیے اسلام کو ماننے والے تمام لوگوں میں آپس میں محبت ومؤدت ہونا چاہئے ، آپس میں اتفاق واتحاد ہونا چاہئے ، ایک دوسرے سے ہمدردی وغمخواری کا جذبہ ہونا چاہئے ، خواہ رنگ ونسل میں ، حسب ونسب میں ، جغرافیائی وعلاقائی اعتبار سے وہ مختلف کیوں نہ ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اتفاق واتحاد کے بغیر دشمن پر ہم اثر انداز نہیں ہو سکتے ، اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اس امت کی شیرازہ بندی اور اس کا اتفاق واتحاد سب سے بڑی ضرورت ہے ، لہذا مختلف مکاتب فکر کے لوگ اگر اپنے اپنے نظریات پر قائم رہتے ہوئے اسلام کی تقویت اور ملت اسلامیہ کی جمعیت کی خاطر اتفاق واتحاد قائم کرلیں تو یہ قوت اتنی زبردست قوت ہوگی جس کا صحیح اندازہ امت کی صفوں کے اندر موجود انتشار وپراگندی کی اس فضا میں نہیں کیا جاسکتا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

ہمارے مسائل میں روز بروز اضافہ اور مصائب و بلیات میں دن بدن کثرت کی ایک وجہ یہ ہے کہ آج امت بحیثیت امت ایک اہم ترین فریضہ کو بھلا کر اس سے غفلت کے بدترین جرم کا ارتکاب کر رہی ہے ، اور وہ ہے دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام ، ہاں کہیں کہیں اللہ کے بندے اس کام میں لگے ہوئے ہیں ، جو آٹے میں نمک کے برابر ہوں گے ، الغرض ہم اس اہم کام سے غفلت ولاپروائی کے مجرم ہیں ، اور منجملہ اسباب مصائب ، ایک سبب احادیث میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ امت امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ بیٹھے۔

(۱) حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

« سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى أَنْ يُغَيِّرُوْا عَلَيْهِ، وَلَا يُغَيِّرُوْنَ إِلَّا أَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ أَنْ يَمُوْتُوْا . »

(اگر کسی قوم میں کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور وہ قوم اس کو روکنے پر قدرت بھی رکھتی ہے مگر اس کو روکتی نہیں تو اللہ ان پر دنیا ہی میں مرنے سے پہلے عذاب بھیج دیتا ہے۔)(۱)

(۲) حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَاباً مِّنْ عِنْدِهٖ، ثُمَّ لَتَدْعُوْنَهٗ فَلَا يَسْتَجِيْبُ لَكُمْ . »

(قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ یا تو تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو، یا عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیج دے گا، پھر تم دعائیں بھی مانگو تو وہ قبول نہ کرے گا۔)(۲)

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک دن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، تو میں نے آپ کے چہرہ پر محسوس کیا کہ آپ کو کوئی

(۱) صحیح ابن حبان: ۱/۵۳۷، موارد الظمآن: ۱/۴۵۵، ابوداؤد: ۴۳۷۶، السنن الواردة فی الفتن: ۳/۶۹۴)

(۲) ترمذی: ۲۰۹۵، سنن بیہقی: ۱۰/۹۳، شعب الایمان: ۶/۸۴، مسند احمد: ۵/۳۸۸، السنن الواردة فی الفتن: ۳/۶۹۵

پریشانی پیش آئی ہے، آپ نے وضو کیا اور کسی سے کوئی بات نہیں کی اور مسجد میں منبر پر تشریف فرما ہوئے، میں حجرے کی دیوار سے لگ کے سننے لگی کہ کیا فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ:

«يَآ أَيُّهَا النَّاسُ ! إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ لَكُمْ : مُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ قَبْلَ أَنْ تَدْعُوْنِيْ فَلاَ أُجِيْبُ لَكُمْ وَ تَسْأَلُوْنِيْ فَلاَ أُعْطِيْكُمْ وَتَسْتَنْصِرُوْنِيْ فَلاَ أَنْصُرُكُمْ .»

(اے لوگو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو اس سے پہلے کہ تم مجھ سے دعائیں کرو اور میں قبول نہ کروں، اور تم مجھ سے مانگو اور میں تم کو نہ دوں، اور تم مجھ سے مدد چاہو اور میں تمہاری مدد نہ کروں۔)(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اس سے زیادہ آپ نے کچھ نہیں فرمایا، پھر منبر سے اُتر گئے۔

ان احادیث سے واضح طریقہ پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک کردینا ایک ایسی سخت ترین غلطی اور بڑا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنی مدد و نصرت کے دروازے امت پر بند فرما دیتے ہیں، اور دعاؤں کی قبولیت موقوف ہوجاتی ہے، اور حاجت کا سوال بھی رد کردیا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ہماری مصیبتوں کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ترک کردیا ہے، لہٰذا اب تو اس پر توجہ دینے کی کوشش ہونی چاہئے، آج اس میں کیا شبہ وشک کی گنجائش ہے کہ ہم اپنے ہی گھروں اور اپنے لوگوں میں دین کو

(۱) صحیح ابن حبان:۱/۵۲۶، موارد الظمآن:۱/۴۵۵، مسند احمد:۶/۱۵۹، الترغیب:۳/۱۶۴

پامال ہوتے اور اسکی توہین وتنقیص ہوتے خود ہی مشاہدہ کرتے ہیں، نمازوں، روزوں، اور دیگر اسلامی احکامات کا کھلواڑ کیا جاتا ہے اور ہم بلا کسی ادنی سے تغیر کے بل کہ بڑی خوش دلی کے ساتھ ان لوگوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے رہتے ہیں اور ہمیں کوئی غیرت اللہ کے دین کے سلسلہ میں نہیں آتی، کیا اس کے باوجود اللہ کی مدد ونصرت اور اللہ کے انعامات ورحمتیں ہماری جانب متوجہ ہوسکتی ہیں؟

نیز اسی امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں بدرجہ اولی یہ بھی داخل ہے کہ غیر مسلم بھائیوں اور برادران وطن کو بھی اسلام سے روشناس کرانے اور اسلام کے بارے میں ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے تا کہ ان کی غلط فہمیاں دور ہوں اور اسلام کی صحیح وسچی تصویر ان کے سامنے آئے، اور وہ اس کو قبول کرسکیں۔

تدبیر وحکمت

تیسری بات یہ کہ انسان پر پیش آنے والے مصائب وحالات دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن کا تدارک ومقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی سبیل وتدبیر ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن میں ہمارے پاس کوئی سبیل وتدبیر نہیں ہوتی، جن حالات کے دفعیہ کے لیے ہمارے پاس کوئی سبیل وراستہ ہو اس میں حکم یہ ہے کہ ہم اس سبیل وتدبیر وحکمت کو اختیار کریں اور اسی کے ساتھ ساتھ تدبیر وحکمت میں کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعاء والتجاء کریں۔ مثلاً بیماری ہے تو علاج کرائے، بھوک لگی ہے تو کھانا کھائے، پیاس میں پانی پیئے، دشمن کے حملہ کے وقت اس کا مقابلہ کرے، وغیرہ، اللہ کے پیدا کردہ اسباب کو اختیار نہ کرنا اور ترک اسباب کے ساتھ محض توکل ودعاء کرنا شریعت وسنت کے خلاف ہے، کیوں کہ نبی کریم نے صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے بنائے ہوئے

اسباب کوضرورت پراختیار کیا ہے، ہاں اسی کے ساتھ اللہ سے دعائیں بھی کرنا بھی سنت ہے۔

یہ مسئلہ قرآن وحدیث کی تعلیمات سے واضح ہے، مثلاً فرمایا:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَّ مِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِينَ مِن دُونِهِمْ، لَاتَعْلَمُونَهُمْ، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (الأنفال: ٦٠)

(اوران سے مقابلے کے واسطے جس قدر ہو سکے قوت اور پلے ہوئے گھوڑوں میں سے جمع کروتا کہ اس سے دھاک بٹھاؤ اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اور دوسروں پر جن کوتم نہیں جانتے اور اللہ ان کو جانتا ہے۔)

اس آیت میں اہل اسلام کوتدبیر کرتے ہوئے اپنی قوت کومضبوط ومجتمع کرنے کا حکم دیا گیا ہے تا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جا سکے، اوراپنی دفاعی پوزیشن مضبوط کی جا سکے۔

مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''سامان جنگ کی تیاری کرو کفار کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے اس میں سامان جنگ کی تیاری کے ساتھ '' ما استطعتم'' کی قید لگا کر یہ اشارہ فرمادیا کہ تمہاری کامیابی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جیسا اور جتنا سامان ہے تم بھی اُتنا ہی حاصل کرلو، بل کہ اتنا کافی ہے کہ اپنی مقدور بھر جو سامان ہو سکے وہ جمع کرلو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد تمہارے ساتھ ہوگی، اس کے بعد اس سامان کی کچھ تفصیل اس طرح فرمائی'' من قوۃ '' یعنی مقابلہ کی قوت جمع کرو، اس

میں تمام جنگی سامان، اسلحہ، سواری وغیرہ بھی داخل ہیں اور اپنے بدن کی ورزش فنون جنگ کا سیکھنا بھی، قرآن کریم نے اس جگہ اس زمانے کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں فرمایا بل کہ قوت کا عام لفظ اختیار فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ قوت ہر زمانہ اور ہر ملک و مقام کے اعتبار سے مختلف ہوسکتی ہے، اس زمانے کے اسلحہ تیر، تلوار، نیزے تھے، اس کے بعد بندوق توپ کا زمانہ آیا، پھر بموں اور راکٹوں کا وقت آگیا، لفظ قوت اب سب کو شامل ہے۔ اس لئے آج کے مسلمانوں کو بقدرِ استطاعت ایٹمی قوت، ٹینک، اور لڑاکا طیارے آب دوز کشتیاں جمع کرنا چاہئے کیونکہ یہ سب اسی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور اس کے لیے جس علم وفن کو سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اسی نیت سے ہو کہ اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کا اور کفار کے مقابلہ کا کام لیا جائے گا تو وہ بھی جہاد کے حکم میں ہے۔(۱)

مگر اس سلسلہ میں ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ یہ کام عوام الناس کا نہیں کہ وہ اس سلسلہ میں قوت کو جمع کریں، کیونکہ یہ بات ان کے اختیار سے باہر ہے، کوئی ملک اپنی رعایا کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ یہ اسباب جمع کریں، حتی کہ اسلامی ملک بھی اس کی عوام کو اجازت نہیں دیتا، اور بالخصوص موجودہ دور میں اس کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا کہ عوام الناس یہ کام کریں، لہذا اس آیت کا تعلق اسلامی حکومتوں اور اس کے ذمہ داروں اور سیاسی عہدے داروں سے ہونا چاہئے۔

ہاں البتہ حفاظت خود اختیاری کا سامان اور اس کے لیے مشق وتربیت ہر انسان کا

---

(۱) معارف القرآن: ۴/۲۷۲

ایک فطری حق ہے،اور خود ہر ملک کے قوانین میں اس کی اجازت بھی ہے،قوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کو اختیار کیا جائے،لہذا اس کا اہتمام کرنا بھی ہمارا حق وفرض ہے۔

بہر حال ان تدابیر کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع بھی ضروری ہے تاکہ تدبیر میں جان پڑ جائے اور وہ کامیاب ہو،اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا إِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوْا اللّٰهَ كَثِيْراً لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، وَأَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلاَ تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ،إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. ﴾

(الأنفال: ۴۵-۴۶)

(اے ایمان والو! جب تم دشمن کی جماعت سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو،اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرو تاکہ تم کامیاب ہو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں اختلاف مت کرو ورنہ تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر سے رہو،بلا شبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

اس آیت میں ایک طرف اگر یہ حکم دیا گیا ہے کہ کفار کے مقابلے کے وقت ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو اور یہ کہ آپسی اختلاف نہ کرو تو دوسری جانب یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ کو یاد کرو،اور اللہ ورسول کی اطاعت کرو تاکہ تم کو کامیابی ملے،اور یہ ثابت قدمی کا مظاہرہ اور اختلاف سے بچنا ظاہری تدابیر ہیں۔معلوم ہوا کہ تدبیر اختیار کرنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے اور اللہ سے تعلق اور اس کی جانب رجوع وانابت کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

نبی علیہ السلام کا اسوہ

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک مختصر اور چھوٹی سی ۳۱۳ افراد پر مشتمل جماعت کو لیکر غزوۂ بدر میں تشریف لے گئے تو وہاں میدان جنگ میں ایک کنارے پر آپ اللہ سے مناجات و دعاء میں مشغول ہو گئے، اور قبلہ رو ہو کر اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر یہ دعاء فرما رہے تھے "اے اللہ آپ نے جو مجھ سے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا کر دیجئے، اے اللہ! اگر مسلمانوں کی اس جماعت کو آپ نے ہلاک کر دیا تو پھر اس زمین پر کوئی آپ کی عبادت کرنے والا نہیں رہیگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دعاء میں مشغول تھے کہ آپ کے کندھوں سے چادر گر پڑی، یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کو چادر اُڑھا دی اور پیچھے سے آپ کو چمٹ گئے اور عرض کیا کہ اے نبی اللہ! اپنے رب سے یہ مناجات بس کیجئے، اللہ آپ کا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ (۱)

دیکھئے ایک طرف آپ میدان میں آئے ہیں اور دوسری جانب آپ اللہ کی طرف متوجہ ہیں اور دعائیں فرماتے ہوئے التجائیں کر رہے ہیں اور اللہ سے اپنا وعدہ پورا فرمانے کی درخواست کر رہے ہیں۔

یہی مومن کی شان ہے کہ وہ صرف اسباب پر بھروسہ نہیں کرتا، بل کہ مسبب الاسباب پر اعتماد وتوکل کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسباب میں کوئی طاقت نہیں، طاقت تو اللہ کے پاس ہے۔

رجوع الی اللہ اور ذکر و دعاء کا اہتمام

اور جن حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی تدبیر نہ ہو یا ہم اس

(۱) بخاری:۳۳۰۹، ترمذی:۳۰۰۶

تدبیر پر اختیار نہ رکھتے ہوں وہاں تو بدرجہ اولی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اللہ کی طرف رجوع وانابت اور اس سے دعاء والتجاء کریں۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے فرعون کے مظالم سے نجات حاصل کرنا چاہی تو یہی کام کیا تھا، قرآن میں ان کے قصے میں آیا ہے کہ:

"حضرت موسی علیہ السلام پر شروع میں ان کی قوم کے تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے کیونکہ فرعون اور حکام کا ان کو ڈر تھا، اور فرعون اس ملک میں زور دار تھا اور ظلم بھی کرتا تھا، لہذا حضرت موسی نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر تم سچے مؤمن ہو تو اللہ ہی پر توکل کرو، لوگوں نے جواب میں کہا کہ ہم اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں، پھر اللہ سے دعاء کی کہ یا پروردگار! ہم کو ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنا، اور ہم کو اپنی رحمت سے کافروں سے نجات دے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے لیے گھروں میں نماز کا نظام کردو اور یہ کہ یہ سب لوگ نماز کی پابندی کیا کریں، حضرت موسی نے دعاء کی کہ اے اللہ! آپ نے فرعون کو جو مال و دولت دی ہے جس سے وہ لوگوں کو آپ کے راستے سے گمراہ کرتا ہے، ان کو نیست و نابود کردے اور ان کے دلوں کو سخت کردے، تاکہ وہ ایمان ہی نہ لاسکیں اور عذاب سے ہمکنار ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری دعاء قبول کرلی گئی ہے لہذا تم استقامت سے رہو اور جاہلوں کے راستے کی پیروی نہ کرو"۔

اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے توکل علی اللہ اور نماز کا حکم دیا، اور حضرت موسی علیہ السلام نے بھی بنی

اسرائیل کو اسی کا حکم دیا کہ اللہ پر توکل و اعتماد کرو، کیونکہ فرعون کی طاقت کا مقابلہ کرنے کی بظاہر اسباب ان کے پاس کوئی تدبیر و سبیل نہیں تھی۔

آج مسلمانوں کی حالت بہت سے ملکوں میں اسی کے مشابہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ عوام مسلمان بظاہر کسی قسم کی طاقت وقوت نہیں رکھتے اور نہ ان کے لیے موجودہ حالات میں بظاہر اس کا امکان ہے، لہذا ان کو بھی لامحالہ یہی کرنا چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ سے دعاء والتجاء اور اس کی طرف رجوع وانابت تو ہمارے لیے ہر صورت میں ضروری ہے خواہ ہمارے پاس کوئی تدبیر ہو یا نہ ہو، فرق ہے تو صرف یہ کہ تدبیر ہونے کی صورت میں تدبیر بھی اختیار کی جائیگی اور اسی کے ساتھ دعاء والتجاء بھی کی جائیگی، اور تدبیر نہ ہونے کی صورت میں صرف ایک کام کیا جائے گا اور وہ اللہ تعالی سے دعاء والتجاء ہے۔

دعاء وذکر کی طاقت

مگر افسوس کہ آج مسلم معاشرہ اس سے بھی غافل وجاہل ہے کہ اللہ کے ذکر میں اور اس سے لولگانے میں اور اس سے دعائیں کرنے میں کیا طاقت ہے، اب اس کے پاس نہ ظاہری طاقت ہے اور نہ باطنی قوت، دونوں سے خالی و عاری ہو کر وہ اپنے طاقت ور اور مضبوط دشمن کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے، بھلا کیسے کامیابی ہو سکتی ہے؟ یا تو اس کے پاس ظاہری قوت ہونا چاہئے یا باطنی طاقت ہونا چاہئے۔

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے مختلف مصائب و آفات و بلیات میں مختلف اذکار و دعائیں بتائی ہیں جن میں عجیب وغریب تاثیر موجود ہے، ان کو استعمال کرنے اور فائدہ اُٹھانے کی ضرورت ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں جس کو کوئی بھی

مصیبت زدہ پڑھے تو اللہ اس کو اس مصیبت سے نکال دیتا ہے۔ یہ میرے بھائی یونس علیہ السلام کا کلمہ ہے جو انہوں نے اندھیریوں میں پکارا تھا، وہ یہ ہے:

﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾

(ترجمہ: کوئی معبود نہیں سوائے تیرے، بلاشبہ میں ظلم کرنے والوں میں سے ہوں۔)(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جب بھی کسی معاملہ نے پریشان کیا تو جبرئیل نے آکر مجھ سے کہا کہ آپ یہ پڑھیں:

﴿ تَوَکَّلْتُ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَایَمُوْتُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَداً وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ، وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْراً. ﴾

(میں اس زندہ ذات پر توکل و اعتماد کرتا ہوں جس کو کبھی موت نہیں، تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو نہ بیٹا رکھتا ہے، اور نہ سلطنت میں اس کا کوئی شریک ہے، اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا مددگار رہے، اور تو اس کی بڑائی بیان کر۔)(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ و توجہ الی اللہ و رجوع الی اللہ میں بڑے دوررس اور گہرے اثرات ہوتے ہیں، اور ان کی وجہ سے پریشانیاں دور ہوتی اور مسائل حل ہوتے اور حاجات پوری ہوتی ہیں۔ لہذا ان کا اہتمام کرنے کا عہد کیا جائے اور اللہ سے لو لگائی جائے۔

---

(۱) ابن عدی فی الکامل: ۱۵۰/۵، کنز العمال: ۵۴/۲، حدیث: ۳۴۲۴

(۲) الجامع الصغیر: کنز العمال: حدیث: ۳۴۲۱

ہماری پریشانیاں ومسائل

آج ہمیں جو مسائل ومشکلات درپیش ہیں ان سے سب واقف ہیں، دشمنوں کی ایذاء رسانیاں، ظلم وتشدد، سازشوں کا جال، جادو منتر، شیاطین وجنات کے حملے، جان و مال عزت وآبرو کا نقصان، بیماریاں اور حوادثات وغیرہ، ان سارے ہی حالات ومسائل میں ہمیں اللہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ وہی قادر مطلق وقاضی الحاجات ودافع البلیات ومشکل کشا وحاجت روا ہے، اور اس کے بغیر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہیں، تدبیر موجود ہو تو تدبیر کرتے ہوئے اور اگر کوئی تدبیر نہ ہو تو بلا تدبیر صرف اسی کو پکارا جائے اور اس سے التجائیں کی جائیں اور اللہ کی قدرت کا کرشمہ دیکھا جائے۔

دشمن سے جان و مال کی حفاظت کا نسخہ

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض صاجزادیوں سے فرمایا کہ جب تو صبح کرے تو یہ دعاء پڑھ لینا، کیوں کہ جو بھی اس کو صبح میں پڑھتا ہے شام تک اس کی حفاظت کی جاتی ہے اور جو شام میں پڑھتا ہے صبح تک اس کی حفاظت کی جاتی ہے، وہ دعاء یہ ہے:

﴿ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ، مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ ، أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْماً . ﴾

(میں اللہ کی پاکی اس کی حمد کے ساتھ بیان کرتا ہوں اور کوئی قوت وطاقت نہیں ہے مگر اللہ ہی سے، جو اللہ چاہیں وہی ہوتا ہے اور

وہ جو نہ چاہیں وہ نہیں ہوسکتا، میں جانتا ہوں کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں اور یہ کہ اللہ ہر چیز کو اپنے علم سے احاطہ کئے ہو ئے ہیں۔)(۱)

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا حیرت انگیز واقعہ

ذکر اللہ کی برکت سے جان و مال کی حفاظت کس طرح ہوتی ہے؟ اس کا اس واقعہ سے اندازہ کیجئے، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ معروف صحابی ہیں، بڑے فضائل و مناقب کے حامل ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے خبر دی کہ آپ کا گھر جل گیا، آپ نے کہا کہ نہیں جلا، پھر دوسرا آدمی آیا اور کہا کہ اے ابودرداء! آگ بھڑک اُٹھی تھی لیکن جب آپ کے گھر تک پہنچی تو بجھ گئی، آپ نے کہا کہ میں جانتا تھا کہ اللہ ایسا نہیں کرے گا۔ لوگوں نے کہا کہ اے ابودرداء! ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کی کونسی بات زیادہ تعجب خیز ہے؟ آپ کی یہ بات کہ گھر نہیں جلا یا یہ بات کہ اللہ ایسا نہیں کرے گا، آپ نے فرمایا کہ یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند کلمات سنے تھے کہ جو ان کو صبح میں پڑھتا ہے اس کو شام تک کوئی مصیبت نہیں پہنچتی اور جو شام میں پڑھتا ہے اس کو صبح تک کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، وہ یہ ہیں:

﴿ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّیْ لاَ إِلٰـهَ إِلَّا أَنْتَ عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ، مَا شَاءَ اللّٰهُ کَانَ وَ مَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ، أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْماً، أَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ

(۱) سنن کبری للنسائی: ۶/۲،عمل الیوم و اللیلۃ للنسائی: ۱/۱۴۰، کنز العمال: ۳۴۹۳

نَفْسِيْ وَمِنْ دَابَّةٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ.

(اے اللہ! آپ ہی میرے رب ہیں، آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ ہی پر میں توکل کرتا ہوں، اور آپ ہی عرش عظیم کے رب ہیں، جو اللہ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے اور جو وہ نہ چاہیں وہ نہیں ہوسکتا، میں جانتا ہوں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کو اپنے علم سے احاطہ کیے ہوئے ہیں، اے اللہ! میں میرے نفس کے شر سے اور ہر مخلوق جس کی پیشانی آپ کے قبضہ میں ہے اس کے شر سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔)(۱)

غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پاکیزہ کلمات کی برکت سے کس طرح حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے مکان کی حفاظت فرمائی، پہلے تو آگ بھڑک اُٹھی، اور پھیلتے ہوئے آگے تک چلی گئی حتی کہ لوگ پریشان ہوکر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے مکان کے متعلق بھی خدشہ کرنے لگے اور ان کو ان کے مکان کے بارے میں خطرے سے آگاہ کیا، مگر لوگوں نے یہ حیرت انگیز واقعہ اور قدرت خداوندی کا کرشمہ دیکھا کہ وہ آگ جب حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے مکان تک پہنچی تو اچانک بجھ گئی۔ کیا یہ حیرت انگیز واقعہ نہیں ہے، اور ان کلمات کی برکت کا اثر نہیں ہے؟

ظالم بادشاہ وسیاسی لیڈروں کا خوف ہو تو

حکومت اور اس کے کارندوں اور سیاسی لیڈروں کی جانب سے ظلم و زیادتیاں

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۴۷/۳۴ و مختصر تاریخ دمشق: ۳۶۸۸/۱، التدوین فی اخبار قزوین: ۵۳/۴، کنز العمال: حدیث: ۴۹۶۰

پیش آتی رہتی ہیں اور اس کی وجہ سے لوگ پریشان ہوتے ہیں، مگر افسوس یہ کہ افسوس تو کرتے ہیں اور اس پر تبصرے اور تبادلۂ خیالات تو کرتے ہیں مگر اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے، جب کہ اس سلسلہ میں بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اذکار و دعائیں سکھائی ہیں، چناں چہ ظالم بادشاہ یا اور کوئی ظالم پریشان کرے تو اس سے محفوظ رہنے کے لیے یہ دعاء حدیث میں تعلیم کی گئی ہے:

﴿ لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ ،سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ،لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاءُكَ وَلَاإِلٰهَ غَيْرُكَ. ﴾(۱)

ایک حدیث میں آپ نے اس سلسلہ میں ایک اور دعاء سکھائی ہے، حضرت عمرو حضرت علی رضی اللہ عنہما سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کو بادشاہ یا شیطان پریشان کرے تو یہ پڑھو:

﴿ يَا مَنْ يَكْفِيْ كُلَّ أَحَدٍ، وَلَا يَكْفِيْ مِنْهُ أَحَدٌ، يَا أَحَدَ مَنْ لَا أَحَدَ لَهُ، وَيَا سَنَدَ مَنْ لَاسَنَدَ لَهُ ، انْقَطَعَ الرَّجَاءُ إِلَّا مِنْكَ ، فَكُفَّنِيْ مِمَّا أَنَا فِيْهِ وَأَعِنِّيْ عَلٰى مَا أَنَا عَلَيْهِ مِمَّا قَدْ نَزَلَ بِيْ بِجَاهِ وَجْهِكَ الْكَرِيْمِ وَبِحَقِّ مُحَمَّدٍ عَلَيْكَ . آمین﴾

(اے وہ ذات جو سب کے لیے کافی ہے اور اس کے عوض کوئی کافی نہیں، اے بیکسوں کے ایک، اے بے سہاروں کے سہارے، سب سے امید ختم ہوگئی سوائے تیرے، پس تو میری کفایت کر اس (پریشانی) میں جس میں میں ہوں اور میری مدد کر نازل شدہ بلا میں، اپنی پاک ذات کے طفیل

(۱) مسند الفردوس:۱/۲۸۱، کنز العمال:۳۴۱۴

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حق کے طفیل جو تجھ پر ہے، آمین)(۱)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تو کسی بادشاہ کے پاس جائے اور تجھے خوف ہو کہ وہ تجھ پر ظلم کرے گا تو تین بار یہ پڑھ لینا:

﴿ اَللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ ،اللّٰهُ أَعَزُّ مِنْ خَلْقِهٖ جَمِيْعاً، اللّٰهُ أَعَزُّ مِمَّا أَخَافُ وَأَحْذَرُ، أَعُوْذُ بِاللّٰهِ الَّذِيْ لَاإِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ أَنْ يَقَعْنَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّابِإِذْنِهٖ مِنْ شَرِّ عَبْدِهٖ فُلَانٍ (یہاں دشمن وظالم کا نام لے یا اس کا تصور کرے) وَجُنُوْدِهٖ وَأَتْبَاعِهٖ وَأَشْيَاعِهٖ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ. اَللّٰهُمَّ كُنْ لِّيْ جَارًا مِنْ شَرِّهِمْ، جَلَّ ثَنَاءُكَ وَعَزَّ جَارُكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَلَاإِلٰهَ غَيْرُكَ. ﴾

(اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ اپنی تمام مخلوق سے زیادہ زبردست ہے، اللہ ان سب چیزوں سے زیادہ زبردست ہے جن سے میں خوف کھاتا اور ڈرتا ہوں، میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو ساتوں آسمانوں کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے فلاں بندے کے شر سے اور انسانوں اور جنات میں سے اس کے جتھے اور ماتحتوں اور چاہنے والوں کے شر سے، اے اللہ! تو ان کے شر سے میرا نگہبان بن جا، تیری تعریف بڑی ہے اور تیرا پناہ دیا ہوا محفوظ ہے اور تیرا نام بابرکت ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔)(۲)

(۱) مسند الفردوس: ۱/۳۲۴، کنز العمال: ۳۴۲۵

(۲) ابن ابی شیبہ: ۶/۲۳، الادب المفرد: ۱/۲۴۸، معجم کبیر: ۱۰/۲۵۸، حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۲۲، کنز العمال: ۵۰۰۶

حضرت انس کا حجاج بن یوسف کے ساتھ واقعہ

حضرت انس بن مالک ﷛ ایک موقعہ پر حجاج بن یوسف جو ایک ظالم بادشاہ تھا، اس کے پاس گئے، تو اس نے ان کو بہت سے گھوڑے دکھائے اور گستاخانہ کہا کہ کیا تمہارے صاحب (یعنی نبی کریم ﷺ) کے پاس تم نے اس جیسا دیکھا ہے؟ حضرت انس نے کہا کہ میں نے آپ کے پاس اس سے عمدہ چیز دیکھی ہے، میں نے آپ ﷺ سے سنا کہ گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ کہ آدمی اس کو اللہ کے راستہ کے لیے پالتا ہے، اس قسم کے گھوڑے کے بال، اس کا پیشاب اس کا خون اور گوشت سب قیامت کے دن اس آدمی کے ترازو میں رکھا جائے گا، دوسرا یہ کہ آدمی محض اپنے پیٹ کے لیے گھوڑا پالتا ہے اور تیسرے یہ کہ وہ ریاء وشہرت کے لیے پالتا ہے، پھر حجاج سے کہا کہ تیرے یہ گھوڑے اسی ریاء وشہرت کے لیے ہیں۔

اس پر حجاج نہایت غضبناک ہوا اور کہنے لگا کہ اگر تم نے نبی ﷺ کی خدمت نہ کی ہوتی تو میں تم کو ایسا اور ایسا کر دیتا (یعنی مارتا یا قتل ہی کر دیتا)، حضرت انس نے فرمایا کہ " **كَلَّا، لَقَدِ احْتَرَزْتُ مِنْكَ بِكَلِمَاتٍ لَا أَخَافُ مِنْ سُلْطَانٍ سَطْوَتَهُ وَلَا مِنْ شَيْطَانٍ عُتُوَّتَهُ** " (تو ہرگز کچھ نہیں کر سکتا، کیونکہ میں چند کلمات کے ذریعہ تیرے شر سے محفوظ ہو چکا ہوں، میں نہ کسی سلطان کی طاقت سے ڈرتا ہوں اور نہ کسی شیطان کی سرکشی سے) یہ سن کے وہ ذرا ٹھنڈا ہوا، اور کہنے لگا کہ اے ابوحمزہ! ہمیں بھی وہ کلمات سکھا دو، آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں تجھے اس کا اہل نہیں دیکھتا، پھر ایک زمانے کے بعد جب حضرت انس ﷛ مرض الوفات میں مبتلا ہوئے تو ان کے خادم حضرت ابان نے عرض کیا کہ حضرت! آپ

سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں، فرمایا کہ جو چاہو پوچھو، کہا کہ وہ کیا کلمات ہیں جن کا حجاج نے آپ سے مطالبہ کیا تھا؟ فرمایا کہ ہاں میں تم کو اس کا اہل دیکھتا ہوں، میں نے اللہ کے رسول کی دس برس خدمت کی اور آپ میرے سے راضی ہو کر دنیا سے گئے، اور تم نے بھی میری دس سال خدمت کی ہے اور میں دنیا سے جارہا ہوں جب کہ میں تم سے راضی ہوں، جب تم صبح کرو یا شام کرو تو یہ پڑھ لیا کرو:

﴿ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى نَفْسِيْ وَدِيْنِيْ ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى أَهْلِيْ وَمَالِيْ ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ أَعْطَانِيْ رَبِّيْ ، بِسْمِ اللّٰهِ خَيْرِ الْأَسْمَاءِ ، بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَايَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ دَاءٌ، بِسْمِ اللّٰهِ افْتَتَحْتُ وَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ، لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ، لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ، لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ ،اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ ،لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ، تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَرَبُّ الْأَرَضِيْنَ وَمَا بَيْنَهُمَا ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاءُكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ ، اِجْعَلْنِيْ فِيْ جِوَارِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ وَّمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ، إِنَّ وَلِـيِّ يَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا إِلٰـهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ .﴾ (۱)

(۱) کنز العمال:۵۰۲۱،التدوین فی اخبار قزوین: ۱/۱۲۴

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ذکر اور اس کی تسبیح میں بڑی طاقت ہے اور اللہ اس کی برکت سے ظالم کے ظلم سے حفاظت فرماتے ہیں، اگر چہ وہ بادشاہ وامیر ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ کیا ہم کو اللہ سے اس قسم کے تعلق کی ضرورت اپنے دشمنوں اور ظالم بادشاہوں اور سیاسی لیڈروں کے مظالم سے بچنے کے لیے نہیں ہے؟

ایک اور عبرت خیز واقعہ

ایسے واقعات صحابہ کے ساتھ خاص نہیں، بل کہ جب بھی کسی نے اللہ پر اعتماد و توکل کرتے ہوئے اللہ کے نام اور کلام اور حدیث کی دعاؤں کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہی تو ضرور اللہ نے اس کی مدد کی ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ نے آپ بیتی میں تقسیم ہند کے وقت کی سازشوں اور فتنوں اور قتل و غارت گریوں کے تذکرہ میں اپنے ایک متعلق الحاج بابو ایاز صاحب رحمۃ اللہ کا ایک حیرت انگیز واقعہ اسی قسم کا لکھا ہے، وہ یہ کہ اس دور میں ان فتنوں کی وجہ سے دہلی سے نظام الدین کو آنا جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا، راشن بھی بازار جا کر لانا سخت خطرناک و مصیبت عظمیٰ تھا، سارے راستے مخدوش و مسدود تھے، راشن سبزی منڈی میں ملتا تھا جہاں سکھ ہی سکھ تھے، کسی کی ہمت وہاں جانے کی نہیں ہوتی تھی، مگر الحاج بابو ایاز صاحب رحمۃ اللہ اسی حال میں وہاں سے راشن لایا کرتے تھے، ان کے اس طرح جانے سے لوگ حیرت کرتے تھے، ایک دفعہ وہ سبزی منڈی سے راشن لے کر نظام الدین آرہے تھے، وہاں سے ایک تانگہ لیا، اس میں ایک بابو جی اور تین سکھ سوار تھے، دلی سے باہر نکل کر ان سکھوں نے یہ کہا کہ تو ہمارے بیچ میں کیسے بیٹھ گیا اور اگر ہم تجھ کو ختم کر دیں تو پھر کیا ہو؟ انہوں نے نہایت جوش اور جرأت و بے باکی سے کہا

کہ تم مجھ کو ہرگز نہیں مار سکتے ، اور ہمت ہو تو مار کر دکھلاؤ۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئے ، آپس میں کچھ اشارے کنائے بھی ہوئے اور آستینیں سونت کر کہنے لگے کہ ہم کیوں نہیں مار سکتے ؟ انہوں نے اس سے زیادہ جوش سے کہا کہ میرے پاس ایک چیز ہے تم میرے مارنے پر قادر ہی نہیں ہو سکتے ، وہ اللہ کے فضل سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ نظام الدین تک سوچتے ہی رہے ، اور اشارے بھی کرتے رہے۔ ان سے اُترتے وقت پوچھا کہ تم وہ چیز بتلا دو کیا ہے؟ بابو جی نے کہا کہ وہ چیز بتلانے کی نہیں ہے اور باقی تم دیکھ چکے ہو کہ تم لوگ باوجود ارادے کے مجھے مار نہ سکے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا بات تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ ہی نے مجھے ایک دعاء بتلائی ہے، اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِيْ نُحُوْرِھِمْ وَ نَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ ، میں یہ پڑھتا تھا۔ (۱)

جادو کا علاج اور کعب احبار کا ارشاد

ہماری پریشانیوں میں سے ایک پریشانی یہ ہے کہ دشمنوں کی جانب سے جادو منتر کا ڈر لگا ہوا ہے، اس کا علاج بھی قرآن کی آیات اور حدیث کی دعاؤں سے کیا جا سکتا ہے، مگر لوگ اس سلسلہ میں بھی کفریہ وشرکیہ کاموں سے بھی گریز نہیں کرتے اور ان کے ذریعہ اللہ کو ناراض کرتے ہیں، بھلا اللہ کی ناراضی کے ساتھ کونسا علاج کامیاب ہوسکتا ہے؟ علاج تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، نہ کہ مخلوق کے، لہٰذا اس میں بھی اس کا دھیان ہونا چاہئے کہ ہمارا کوئی کام بھی اللہ ورسول کے خلاف نہ جائے۔

حضرت کعب احبار جو پہلے یہود کے بڑے علماء میں سے تھے، پھر اسلام میں داخل ہو گئے تھے، انہوں نے بیان کیا کہ اگر میں یہ چند کلمات نہ پڑھا کرتا تو یہود

(۱) آپ بیتی: ۱/۵۴۰

جادو سے مجھے گدھا بنا دیتے اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ مجھے رینگنے والے گدھوں میں بہت چیخنے والا گدھا اور بھونکنے والے کتوں میں سے زیادہ بھونکنے والا کتا بنا دیتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مجھے جب آپ سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کلمات ہیں تو فرمایا کہ:

﴿ أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ وَ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّ لَا فَاجِرٌ، وَبِأَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَ مَا لَمْ أَعْلَمْ مِّنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَأَ وَذَرَأَ . ﴾

(میں اللہ کی ذات سے پناہ پکڑتا ہوں جو عظمت والی ہے، اس سے زیادہ عظمت والی کوئی چیز نہیں، اور میں اللہ کے کلمات تامات کے ذریعہ پناہ پکڑتا ہوں جن سے آگے کوئی نیک و بد نہیں جا سکتا، اور میں پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے ان تمام بہترین ناموں کے ذریعہ جن کو میں جانتا ہوں اور ان سے بھی جن کو میں نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا، وجود دیا اور پھیلایا)(۱)

شیاطین و جنات سے حفاظت

ہماری پریشانیوں میں سے ایک پریشانی یہ ہے کہ اللہ کی دوسری مخلوقات میں سے جنات و شیاطین کی جانب سے انسان کو پریشان کیا جاتا ہے، اور اس سلسلہ میں بھی اللہ کی مدد کی سخت ترین ضرورت ہوتی ہے، مگر لوگ اس کو چھوڑ کر خواہ مخواہ کی باتوں میں مبتلا ہوتے اور بعض اوقات اپنا ایمان کھو بیٹھتے ہیں، بعض لوگ عاملوں کے

---

(۱) موطا مالک: حدیث: ۱۴۹۹، و اللفظ له ، ابن ابی شیبه : ۶/۷۷، جامع معمر: ۱۱/۳۶، کتاب الدعاء: ۱/۳۶

چکر میں اور بعض ان سے بھی آگے سادھوؤں اور پجاریوں کے چکر میں ملوث ہوجاتے ہیں اور بے ایمانی کی باتیں اور کفریہ وشرکیہ افعال واعمال کرتے ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ لوگ اللہ سے اپنا تعلق مضبوط کرتے اور اس کے لیے دعاؤں کی تاثیرات سے فائدہ اُٹھاتے۔

لٰہذا جنات وشیاطین کا خوف ہو یا کسی کو وہ پریشان کرتے ہوں تو ان سے حفاظت کے لیے بھی اوراد اورادعیہ کا اہتمام والتزام کرنا بہت ہی نفع بخش ہے، بالخصوص آیۃ الکرسی اور سورۃ البقرہ کا پڑھنا اس کے لیے اکسیر اعظم ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ (و في رواية) يَفِرُّ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِيْ تُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ .»

(شیطان اس گھر سے نفرت کرتا ہے جس میں سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ پڑھی جاتی ہے، ایک روایت میں ہے کہ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔)(۱)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

" إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ تُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ لَا يَدْخُلُهُ الشَّيْطَانُ"(وفي رواية عند ابن عدي في الكامل)" إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَخْرُجُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِيْ تُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ "

(جس گھر میں سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ پڑھی جاتی ہے اس میں شیطان داخل نہیں ہوتا، اور ابن عدی کی "کامل" میں ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے)(۲)

(۱) مسلم:۱۳۰۰، احمد:۷۴۸۷، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: ۵۳۵/۱

(۲) ترمذی:۲۸۰۲، احمد:۸۵۶۰، الکامل لابن عدی:۲۰۶/۶

آیۃ الکرسی کا کرشمہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زکاۃ کے مال پر نگران مقرر فرمایا، ایک شخص آیا اور مٹھی بھر کر جانے لگا، انہوں نے اس کو پکڑ لیا، تو عذر کیا کہ میں محتاج ہوں، میرے ذمہ اہل وعیال ہیں، اور میں سخت حاجت مند ہوں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو چھوڑ دیا، صبح ہوئی تو اللہ کے نبی نے ان سے پوچھا کہ وہ تمہارا قیدی کیا ہوا، انہوں نے کہا کہ اس نے حاجت بتائی تو میں نے اس کو چھوڑ دیا، آپ نے فرمایا کہ وہ دوبارہ آئے گا، چنانچہ وہ دوسری رات بھی آیا اور مٹھی بھر کر جانے لگا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پھر اس کو پکڑ لیا، اس نے پھر وہی اپنی حاجت وضرورت کا اظہار کیا تو انہوں نے چھوڑ دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح پھر پوچھا، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا، آپ نے پھر فرمایا کہ وہ پھر آئے گا، اور اسی طرح پھر تیسری رات بھی وہ آیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اب اس کو پکڑ لیا اور فرمایا کہ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، تو بار بار وعدہ کرتا ہے کہ نہیں آؤں گا مگر پھر وہی حرکت کرتا ہے، میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کروں گا، اس پر اس نے کہا کہ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تم کو کچھ کلمات سکھاتا ہوں جو تم کو نفع دیں گے، حضرت ابو ہریرہ نے پوچھا کہ وہ کیا ہیں؟ تو کہا کہ جب تم اپنے بستر پر جاؤ تو آیۃ الکرسی پڑھ لو، تمہارے لیے اللہ کی جانب سے ایک محافظ مقرر ہو جاتا ہے اور صبح ہونے تک شیطان تمہارے قریب نہیں آسکتا، حضرت ابو ہریرہ نے اس کو چھوڑ دیا اور جب صبح ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قصہ سنایا، آپ نے فرمایا کہ اس نے سچ کہا اگرچہ کہ وہ جھوٹا

ہے، کیا جانتے ہو کہ وہ کون تھا؟ حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ نہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ شیطان تھا۔ (۱)

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت ابوایوب انصاری کو بھی پیش آیا کہ ان کے گھر میں ایک طاقچہ تھا جس میں چھوارے رکھے جاتے تھے، پس جن آتا اور اس میں سے اُٹھالے جاتا، انہوں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ جب تم اس کو دیکھو تو یوں کہنا کہ " بسم الله أجيبي رسول الله، چنانچہ انہوں نے اس کو پکڑا اور قسم لی کہ آئندہ نہیں آئے گا اور اسی طرح تین مرتبہ ہوتا رہا کہ وعدہ کرتا پھر بھی آتا، تیسری دفعہ کہا کہ میں تم کو ایک بات بتاتا ہوں کہ آیۃ الکرسی گھر میں پڑھ لو تو شیطان تمہارے قریب بھی نہ آئے گا، حضرت ابوایوب نے جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو فرمایا کہ اس نے صحیح بات کہی، اگر چہ وہ جھوٹا ہے۔ (۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر شیاطین کے حملہ کا واقعہ

حدیث میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ آیا ہے، حضرت ابوالتیاح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد الرحمٰن بن حبیش رضی اللہ عنہ سے جو کہ بہت بوڑھے تھے، پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، میں نے کہا کہ جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شیاطین نے پکڑلیا تھا تو آپ نے کیا کیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ شیاطین وادیوں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے، اور آپ پر پہاڑ کو ڈھکیل دیا، اور ایک شیطان کے ساتھ آگ کا ایک شعلہ تھا اس نے آپ کو جلانے کا ارادہ کیا، آپ

(۱) بخاري:۱/۱۳۰
(۲) ترمذي:۲۸۰۵، احمد:۲۲۴۸۸

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ڈر گئے اور پیچھے کی طرف ہٹ گئے۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور کہا کہ اے محمد! پڑھیے، آپ نے کہا کہ کیا پڑھوں؟ کہا کہ یہ پڑھیے، جب آپ نے یہ پڑھا تو شیاطین کی وہ آگ بجھ گئی اور اللہ نے ان کو ہزیمت دیدی، وہ دعاء یہ ہے:

﴿أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَايُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّ لَا فَاجِرٌ مِّنْ شَرِّ مَاخَلَقَ وَذَرَأَوَبَرَأَ ، وَمِنْ شَرِّمَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا، وَمِنْ شَرِّ مَا ذَرَأَ فِي الْأَرْضِ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا،وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَمِنْ شَرِّ كُلِّ طَارِقٍ إِلَّاطَارِقاً يَّطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ﴾

(میں اللہ کے کلمات تامات کے ذریعہ جن سے کوئی نیک یا بد آگے نہیں جاسکتا پناہ پکڑتا ہوں، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا، وجود دیا، اور پھیلایا ہے، اور اس چیز کے شر سے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور اس سے جو اس میں چڑھتی ہے اور اس سے جو زمین میں پھیلتی ہے اور اس سے جو اس سے نکلتی ہے، اور اس رات و دن کے فتنوں کے شر سے بھی اور ہر رات میں آنے والے کے شر سے بھی، سوائے اس کے جو خیر لے کر آئے، اے رحمٰن!)(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی بعینہ اسی طرح کا قصہ مروی ہے۔(۲)

(۱) ابن ابی شیبہ:۵/۵۱،مسند احمد:۳/۴۱۹، کنز العمال:۱۸/۵۰۱۸ الترغیب والترھیب: ۲/۳۰۳، اس حدیث کو امام منذری نے الترغیب میں ذکر کرکے فرمایا کہ امام احمد وامام ابویعلی کی سندیں جید ہیں

(۲) دیکھو:السنن الکبری للنسائی: ۶/۲۳۷،معجم اوسط للطبرانی: ۱/۱۸،عمل الیوم اللیلة للنسائی: ۱/۵۳۰

حضرت عروہ بن الزبیر کا ایک عجیب واقعہ

اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ سنئے، حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ، حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا کے صاحبزادہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں، ان کا ایک عجیب وحیرت انگیز واقعہ کتابوں میں لکھا ہے، وہ یہ کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ خلیفہ بننے سے پہلے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی چھت پر سویا ہوا تھا کہ راستہ پر آوازیں محسوس کیا، اور جھانک کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیاطین جوق در جوق آرہے ہیں یہاں تک کہ میرے مکان کے پیچھے ایک کھنڈر میں جمع ہوگئے پھر ابلیس بھی آگیا اور اس نے چیخ کر کہا کہ " من لی بعروۃ بن الزبیر؟" (کون میرے پاس عروہ بن الزبیر کو لائے گا) ایک جماعت کھڑی ہوئی اور کہا کہ ہم لائیں گے، پس گئے اور واپس چلے آئے اور کہا کہ ہم ان پر قادر نہ ہوسکے ،ابلیس نے پھر چیخ کر کہا کہ" من لی بعروۃ بن الزبیر؟" (کون میرے پاس عروہ بن الزبیر کو لائے گا) تو ایک اور جماعت اُٹھی اور کہا کہ ہم لائیں گے،اور یہ جماعت بھی جا کر واپس آگئی ،اور کہا کہ ہم ان پر قادر نہیں ہوسکے،اس پر وہ پھر بہت زور سے چیخا، حتی کہ میں یہ سمجھا کہ زمین شق ہوگئی،اور چیخ کر کہا کہ" من لی بعروۃ بن الزبیر؟" (کون میرے پاس عروہ بن الزبیر کو لائے گا) تو ایک تیسری جماعت اُٹھی اور کہا کہ ہم لائیں گے،اور یہ جماعت بھی جا کر بہت دیر میں واپس آگئی ،اور کہا کہ ہم ان پر قادر نہیں ہوسکے،اس پر ابلیس غضبناک ہوکر چلا گیا اور شیاطین بھی اس کے پیچھے ہوگئے ،حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ یہ واقعہ دیکھ کر حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور یہ سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا کہ میرے والد

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا کہ جو بھی شخص صبح یا شام اس دعاء کو پڑھتا ہے اللہ اس کو ابلیس اور اس کے لشکر سے محفوظ رکھتے ہیں، وہ دعاء یہ ہے:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ذِيْ الشَّأنِ، عَظِيْمِ الْبُرْهَانِ، شَدِيْدِ السُّلْطَانِ، مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ، أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ﴾

(اللہ کے نام سے جو شان والا ہے، بڑی دلیل والا ہے، زبردست سلطنت والا ہے، جو اللہ چاہے وہ ہوتا ہے، میں شیطان سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔)(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ابلیس اور اس کا پورا لشکر حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ پر اس دعاء کی برکت سے قادر نہ ہو سکا، جو انہیں اپنے والد کے واسطے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی تھی۔

ضرورت کی چند مزید دعائیں

یہاں چند مزید دعائیں لکھتا ہوں، جو مختلف قسم کی پریشانیوں میں کام آتی ہیں:

(۱) اگر کسی آدمی کی طرف سے خوف ہو تو یہ دعاء پڑھ لیا کرے:

﴿ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰاتِ السَّبْعِ، وَمَا فِيْهِنَّ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، وَرَبَّ جِبْرَئِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ، كُنْ لِّيْ جَاراً مِّنْ فلان (یہاں دشمن کا نام لے یا تصور کرے) وَأَشْيَاعِهِ أَنْ يَفْرُطُوْا عَلَيَّ أَوْ أَنْ يَطْغَوْا عَلَيَّ أَبَداً، عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ

(۱) تاریخ ابن عساکر: ۴۰/ ۲۶۷، مختصر تاریخ دمشق: ۱/ ۲۲۷۶، کنز العمال: ۲/ ۲۸۱ حدیث: ۵۰۱۷

ثَنَاءُکَ وَلَا إِلٰـهَ إِلَّا أَنْتَ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّابِکَ.﴾

(اے اللہ، اے ساتوں آسمانوں کے اور ان کے درمیان کی چیزوں کے رب، اور اے عرش عظیم کے پروردگار اور جبرئیل و میکائیل و اسرافیل کے پروردگار! تو میرا نگہبان ہو جا فلاں (دشمن) سے اور اس کے ساتھیوں سے کہ کبھی بھی وہ مجھ پر ظلم کریں یا مجھ پر حد سے بڑھیں، تیرا پناہ دیا ہوا محفوظ ہے، اور تیری تعریف بڑی ہے، اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں، اور تیری توفیق کے بغیر نہ کسی میں قوت ہے نہ طاقت۔)(۱)

(۲) نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ جس کو کوئی غم اور پریشانی پیش آئے اور وہ اس دعاء کو پڑھے تو اللہ اس کا سارا غم دور کر دیتے ہیں اور اس کے عوض خوشی عطاء فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُکَ وَابْنُ عَبْدِکَ وَابْنُ أَمَتِکَ، نَاصِيَتِيْ بِيَدِکَ، مَاضٍ فِيَّ حُکْمُکَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُکَ، أَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ هُوَلَکَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَکَ، أَوْ أَنْزَلْتَهٗ فِيْ کِتَابِکَ، أَوْ عَلَّمْتَهٗ أَحَداً مِّنْ خَلْقِکَ، أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَکَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ بَصَرِيْ وَجَلَاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ.﴾

(یا اللہ! میں تیرا غلام ہوں، اور تیرے غلام کا بیٹا ہوں اور تیری باندی کا بیٹا ہوں، ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں، تیرا حکم میرے بارے میں نافذ

(۱) کنز العمال: ۳۴۲۶، وبعضه عند ابن ابی شیبة فی مصنفه: ۲۲/۶، وعند الضبی فی کتاب الدعاء: ۲۰۸/۱، ۲۱۰

ہے، تیرا فیصلہ میرے بارے میں عین انصاف ہے، میں تجھ سے تیرے نام کے حق سے جس سے تو نے اپنے کو موسوم کیا ہے، یا اس کو اپنی کتاب میں اُتارا ہے، یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یا اپنے علم غیب ہی میں اس کو رہنے دیا ہے، میں یہ مانگتا ہوں کہ تو قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار اور میری آنکھ کا نور، اور میرے غم کی کشائش اور میرے فکر کا دفعیہ بنا دے۔)(۱)

(۳) اچانک مصیبت سے بچاؤ کے لیے یہ دعاء تعلیم فرمائی گئی ہے، نیز فرمایا گیا کہ جو اس کو صبح وشام پڑھ لیتا ہے اس کو کوئی چیز نقصان وتکلیف نہیں دے سکتی:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَايَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيْ السَّمَاءِ وَهُوَا لسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ . ﴾

(اللہ کے نام سے جس کے نام کے ساتھ کوئی چیز نہ زمین میں نقصان وتکلیف پہنچا سکتی ہے اور نہ آسمان میں، اور وہ بہت سننے والا بہت جاننے والا ہے۔)(۲)

(۴) زہریلے جانوروں اور تکلیف دہ چیزوں سے حفاظت کے لیے تین مرتبہ یہ دعاء پڑھ لیا کرے:

﴿ أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ ﴾

(میں اللہ کے مکمل کلمات کے ذریعہ تمام مخلوق کے شر سے پناہ

---

(۱) صحیح ابن حبان: ۲۵۳/۳، موارد الظمآن: ۵۸۹/۱، ابن ابی شیبہ: ۴۰/۶، مسند بزار: ۳۶۳/۵، مسند احمد: ۳۹۱/۱، کنز العمال: ۳۴۳۴

(۱) احمد: ۶۲/۱، ۶۶، سنن کبری للنسائي: ۹۴/۶، عمل اليوم والليلة للنسائی: ۲۹۱/۱، بخاري في الأدب المفرد: ۲۳۰/۱، ابن حبان: ۱۳۲/۳، حاکم: ۶۹۵/۱، ایضاً: ۳۴۸۶ و ۳۴۹۵

لیتا ہوں)(۱)

(۵) ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی کہ مجھے جان و مال واہل وعیال پر خوف محسوس ہوتا ہے تو آپ نے یہ دعاء تلقین فرمائی کہ صبح وشام یہ پڑھا کرو:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى دِيْنِيْ وَنَفْسِيْ وَوَلَدِيْ وَأَهْلِيْ.﴾

(اللہ کے نام سے میں میرے دین اور ذات اور اولاد اور اہل کے لیے مدد لیتا ہوں۔)(۲)

آخری بات

آخری بات جو تمام باتوں کا خلاصہ اور لب لباب ہے یہ کہ ہماری تباہی وہلاکت، ذلت وپستی، ناکامی تنزلی اور ادبار وانحطاط کا سبب ہماری ایمانی کمزوری، خدا پر عدم توکل واعتماد، سنت وسیرت سے بیزاری، تعلق مع اللہ کی کمی، نمازوں میں غفلت، زکوۃ کی ادائیگی میں کوتاہی، فحاشی وعریانی اور بے حیائی، عیش پرستی ولذت اندوزی، آخرت سے غفلت وغیرہ چیزیں ہیں۔ اس لیے اگر یہ سوال کیا جائے کہ ہمیں عزت وسربلندی کب نصیب ہوگی، ہماری مدد ونصرت کے فیصلے کب ہوں گے، ناکامی وتنزلی کب ختم ہوگی، ادبار وانحطاط سے خلاصی کب ہوگی، اس ذلت ونکبت سے ہم عروج واقبال کی طرف کب آئیں گے۔ تو اس کا جواب صرف اور صرف یہی ہے اور ہونا چاہئے:

---

(۱) احمد:۲/۲۹۰، سنن کبری للنسائی:۶/۱۰۴، مؤطا مالک:۲/۹۵۱، ابن حبان:۳/۲۹۷ حاکم:۴/۴۶۱، کنز العمال:۳۵۰۸

(۲) تاریخ ابن عساکر:۵۴/۳۹۶، کنز العمال:۴۹۵۸

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے، قطار اندر قطار اب بھی

بس اب ہم کو چاہئے کہ کسی چیز کا انتظار کئے بغیر بدر کی فضا پیدا کرنے لگ جائیں، جہاں اللہ کی حمد وثنا، تحمید وتقدیس کے ترانے، سنت وسیرت سے وابستگی، الحاح وزاری، خشوع وخضوع، دنیا سے بیزاری، آخرت کی فکر، جنت کی طلب، عیش پرستی سے دوری، جہاد فی سبیل اللہ کی لگن اور.........خلاصہ یہ کہ.........شریعت کی پاسداری جیسی عظیم صفات تھیں۔ اللہ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق دے......آمین۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

مہتمم الجامعۃ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

۸/ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ

حضرت
ابراہیم علیہ السلام کی قربانی
حقائق و اسرار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حامداو مصلیا: اما بعد زیر نظر مضمون ''حضرت ابراہیم کی قربانی: حقائق واسرار'' کئی سال پیشتر لکھا گیا تھا، جو بعض اخبارات میں اسی وقت شائع بھی ہو گیا تھا، اب بعض احباب کی خواہش پر اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کا وہ عجیب وغریب واقعہ پیش کیا گیا ہے، جو قربانی کی اصل ہے اور اس میں اصل واقعے کے ساتھ ساتھ اس کے اسرار اور اس سے حاصل ہونے والی عبرتیں ونصائح کی طرف بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

۴ر جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ

۱۴/ اگست/ ۲۰۰۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی - حقائق واسرار

عیدالاضحیٰ کے مبارک ومقدس موقع پراللہ تعالیٰ کی تقدس مآب بارگاہ میں اہل اسلام اپنی اپنی قربانیاں پیش کرتے ہیں اوراللہ کی جناب میں تقرب پانے اوراس کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ مقدس ومبارک عمل دراصل ایک عجیب وغریب واقعے کی یادگاراوراس کی نقل ہے، جس کی نظیرپیش کرنے سے تمام اگلے اورپچھلے لوگ عاجزوقاصر ہیں، اس واقعے کا تعلق دومقدس ومحترم شخصیتوں سے ہے، ایک حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اوردوسرے حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی شخصیت سے کون ناواقف ہوگا؟ آپ اللہ کے وہ برگزیدہ نبی ہیں کہ جنھوں نے اللہ کی محبت میں ایسے مصائب جھیلے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کوخُلت کا بلندترین مقام عطافرمایااورقرآن پاک میں جگہ جگہ آپ کی تعریف فرمائی اورہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوحکم دیاکہ آپ ملتِ ابراہیمی کا اتباع کریں اورآپ کوساری دنیائے انسانیت کا امام بنایا گیا، آپ ہی ہیں جنھوں نے اللہ کے حکم سے کعبۃ اللہ کی تعمیرفرمائی اورحج کا اعلان کیا اورحج جیسی مقدس عبادت کی تعلیم دی، وہ آپ ہی کی ذاتِ کریمہ ہے، جس نے کفروشرک

کے ماحول میں جنم لینے اور آنکھ کھولنے کے باوجود؛ کفر و شرک کی آلودگیوں سے نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو بچایا؛ بل کہ بہت سے لوگوں کو اس سے محفوظ رکھا اور نعرۂ توحید بلند کرتے ہوئے پورے ماحول و معاشرے کو چیلنج کر دیا اور جب اس راہ میں مصائب و پریشانیاں لاحق ہوئیں تو پورے صبر و تحمل کے ساتھ اللہ کی خاطر ان کو برداشت کیا، آپ کو آگ میں ڈالا گیا، جلاوطن کیا گیا، ایذائیں و تکلیفیں پہنچائی گئیں اور یہ سب کچھ آپ نے اللہ کے لیے بہ شوق و رغبت برداشت کیا اور اللہ کی محبت کا ثبوت دیتے رہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت

جب آپ نے اپنے وطن (عراق) سے ملک شام کی طرف ہجرت فرمائی، تو آپ کے ساتھ حضرت سارہ علیہا السلام آپ کی زوجۂ محترمہ اور حضرت لوط علیہ السلام آپ کے بھتیجے بھی تھے، درمیانی منزل مصر میں قیام فرمایا، تو وہاں کے بادشاہ نے حضرت سارہ علیہا السلام پر بدنیتی سے دست درازی کی اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت اس کے ہاتھ شل کر دیئے اور اس طرح تین مرتبہ ہوا، حضرت سارہ کی یہ کرامت دیکھ کر بادشاہ متاثر و مرعوب ہوا اور "ہاجرہ" نامی ایک باندی (جو اصل میں ایک قبطی النسل شہزادی تھی) حضرت سارہ کی خدمت کے لیے بہ طور ہدیہ پیش کی اور حضرت سارہ نے وہ باندی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہبہ فرما دی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اپنے نکاح میں لے لیا، پھر ملکِ شام میں جا کر سکونت اختیار فرمائی؛ مگر ایک طویل مدت تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی؛ یہاں تک کہ آپ کی عمر تقریباً چھیاسی برس کی ہوگئی، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے اولاد کے لیے دعا فرمائی:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (الصافات:۹۹)

(اے میرے پروردگار! مجھے صالحین میں سے ایک صالح اولاد عطا فرما!)
اور اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور آپ کو ایک حلم والے لڑکے کی بشارت دی۔ چناں چہ فرمایا:

﴿ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴾ (الصّافات:۱۰۱)

(پس ہم نے ان کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی۔)

یہ دعا جب آپ نے فرمائی، تو آپ کی عمر ایک روایت کے مطابق چھیاسی برس اور ایک روایت کے مطابق پچاسی برس تھی۔(۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نذر ومنّت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ سے اولاد کے لیے دعا کی تو یہ نذر ومنت بھی کی، کہ اگر مجھے لڑکا ہوگا تو اس کو اللہ کے لیے قربان کردوں گا؛ مگر جب لڑکا پیدا ہوا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی نذر یاد نہ رہی اور وہ اس کی تکمیل نہ کرسکے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں آیا ہے۔(۲)

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور آپ کے گھر حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ایک حسین وجمیل بچہ تولد ہوا تو اس کا نام اسماعیل رکھا گیا --- یہ لفظ عبرانی زبان کا ہے اور اس کے معنی ہیں "سمیع اللہ" عبرانی میں اسماع یا اشماع کے معنی سمیع اور ایل کے معنی "اللہ" کے ہوتے ہیں، چوں کہ حضرت اسماعیل اللہ تعالیٰ سے دعا کے نتیجے میں پیدا ہوئے، اس لیے آپ کا نام اسماعیل رکھا گیا ---- اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بعض مصلحتوں اور حکمتوں کی وجہ

---

(۱) بدائع الزھور:۸۸

(۲) بدائع الزھور:۸۸

سے آپ کو حکم دیا، کہ اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اور لختِ جگر اسماعیل دونوں کو مکہ کی بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ آئیں، آپ نے اس نازک موقعے پر بھی اللہ کی محبت میں اس حکم کی تعمیل کی اور حضرت جبریل عَلَیْہِ السَّلَام کی معیت میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو مکہ لے جا کر چھوڑ آئے اور آپ حسبِ سابق ملکِ شام میں قیام پذیر رہے۔

حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کا خواب

جب حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ مکہ مکرمہ کے بے آب وگیاہ میدان میں زندگی بسر کر رہے تھے اور بڑھتے بڑھتے اس قابل ہو گئے کہ ہلکے پھلکے کام کر سکیں تو حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کو ملک شام میں (جہاں آپ کی سکونت تھی) ایک خواب نظر آیا۔

وہ یہ کہ خواب میں کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ ابراہیم! اپنی نذر کو پورا کرو! دیکھو! اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو! یہ خواب ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ کو دیکھا۔ جب صبح ہوئی تو سوچنے لگے کہ یہ کیا خواب ہے؟ اور یہ کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے یا شیطان کی طرف سے؟ اسی لیے آٹھ ذی الحجہ کو یوم الترویہ یعنی تفکر وتذبذب کا دن کہا جاتا ہے۔ پھر جب نویں ذی الحجہ کی رات ہوئی، تو پھر وہی خواب نظر آیا جب صبح ہوئی، تو آپ نے سمجھ لیا کہ یہ خواب اللہ کی طرف سے ہی ہے، اسی لیے نویں ذی الحجہ کو یوم عرفہ (جاننے اور پہچاننے کا دن) کہا جاتا ہے۔ پھر دس ذی الحجہ کی رات بھی اسی طرح کا خواب دیکھا اور دس ذی الحجہ کو ارادہ فرمایا کہ اس حکم خداوندی کے موافق اپنے لختِ جگر ونورِ نظر اسماعیل (عَلَیْہِ السَّلَام) کو اللہ کے لیے ذبح کر کے قربانی پیش کروں۔ اسی لیے دس ذی الحجہ کو ''یوم النحر'' (قربانی کا دن) کہا

جاتا ہے۔(۱)

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے

خواب میں آپ کو قربانی کا حکم دیا گیا اور انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کا خواب بھی وحی الٰہی ہوتا ہے۔ محمد بن کعب رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ رسولوں پر اللہ کی طرف سے وحی بیداری و نیند دونوں حالتوں میں آتی تھی، کیوں کہ انبیا کے قلوب سوتے نہیں اور یہ بات مرفوع حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم معاشر انبیا وہ ہیں کہ ہماری آنکھیں سوتی ہیں؛ مگر دل نہیں سوتے۔(۲)

غرض انبیا کرام علیہم الصلاۃ والسلام پر خواب میں بھی وحی آتی ہے؛ اس لیے ان کے خواب حجت شرعیہ ہیں اور اس پر عمل ان کے لیے ایسا ہی ضروری ہے، جیسے حالت بیداری میں آنے والی وحی پر عمل ضروری ہے؛ مگر عام انسانوں کے خواب حجتِ شرعیہ نہیں کیوں کہ ان کے خواب سچے بھی ہو سکتے ہیں اور جھوٹے بھی ہو سکتے ہیں؛ حتّٰی کہ حضراتِ اولیاء اللہ کے خواب بھی شریعت میں حجت کا درجہ نہیں رکھتے۔

خواب کی تعبیر

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں جب یہ دیکھا کہ آپ کو اپنے بچے کی قربانی پیش کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، تو اس کی تعبیر اولاً آپ نے یہ نکالی کہ اس سے مراد جانوروں کی قربانی پیش کرنا ہے۔ چناں چہ پہلی اور دوسری رات خواب دیکھنے کے بعد آپ نے کچھ اونٹ بھی اللہ کے نام پر قربان فرمائے؛ مگر جب تیسری رات بھی وہی خواب دیکھا، تو سمجھا کہ مراد یہ ہے کہ اپنے اکلوتے اور محبوب لڑکے کو ذبح کر دوں

(۱) الدر المنثور :۷/۱۱۱، عن ابن عباس، تفسیر القرطبي:۱۵/۱۰۲، روح المعاني :۲۳/۱۲۸
(۲) القرطبي : ۱۵/۱۰۲

کیوں کہ صرف جانور کی قربانی اس سے مراد ہوتی، تو تیسری رات پھر وہی حکم نہ دیا جاتا جو پہلی دوراتوں میں دیا گیا تھا۔

خواب میں حکم دینے کی حکمت

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم خواب میں کیوں دیا جب کہ بیداری میں بہ ذریعۂ وحی بھی یہ حکم دیا جاسکتا تھا، پھر صاف حکم مل جانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تعمیل حکم میں تذبذب و پریشانی بھی پیش نہ آتی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم خواب کے ذریعے دینے میں یہ حکمت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کمال اطاعت اور اللہ تعالیٰ سے کمال محبت کا پوری طرح مظاہرہ ہو، کیوں کہ خواب میں تاویلات کی گنجائش ہوتی ہے اور انسانی نفس عام طور پر ان تاویلات کی آڑ میں تعمیل حکم سے جی چرانے کی کوشش کرتا ہے؛ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام محض ایک خواب میں حکم پاکر تعمیل حکم خداوندی کے لیے تیار ہوگئے اور تاویلات کی ہر راہ کو ان کی اطاعت شعاری اور محبت خداوندی نے بند کردیا اور وہ بلا چوں وچرا اللہ کے لیے اپنے اکلوتے کی قربانی پیش کرنے چل پڑے، اس سے ان کی اطاعت شعاری کا کمال اور محبت خداوندی میں رسوخ کا اندازہ ہوا، اس لیے بہ جائے بیداری کے خواب میں آپ کو حکم دیا گیا۔

دوسری حکمت اس میں یہ ہے کہ خواب میں حکم دینے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کمال آزمائش مقصود ہے، اگر بیداری میں صاف حکم دیا جاتا، تو ایسی آزمائش نہ ہوتی؛ کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاف حکم پاکر تعمیل حکم کے لیے اقدام فرما ہی دیتے؛ مگر جب ایک بات خواب میں دکھائی جارہی ہے اور اس

میں تاویل کی بھی گنجائش ہے، پھر بھی اصل مقصود و منشا خداوندی کو معلوم کرنا اور اس پر عمل کرنا دراصل ایک بہت ہی کٹھن مرحلہ اور سخت ترین آزمائش ہے اور اس کے باوجود بھی حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کا اس مرحلے میں کامیاب ہونا، ان کے مقامِ عزیمت کی کھلی دلیل اور ان کے بلندیٔ مقام و عظمت شان کی بین علامت ہے۔

خواب قولی تھا یا فعلی؟

یہاں ایک بحث یہ ہے کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے جو خواب دیکھا تھا، وہ قولی تھا یا فعلی؟ اوپر ''روح المعانی'' و ''تفسیر قرطبی'' کے حوالے سے خواب کی جو کیفیت مذکور ہوئی اس سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں کسی (فرشتے) نے آپ کو یہ حکم دیا کہ اللہ کے نام پر اپنے بیٹے کو ذبح کردو، اس سے معلوم ہوا کہ یہ خواب قولی تھا؛ مگر قرآن مجید میں حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے جو الفاظ مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب فعلی تھا، یعنی آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کررہے ہیں، چناں چہ آپ نے فرمایا کہ: ﴿يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۰۲)

(اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ تجھ کو ذبح کررہا ہوں)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواب فعلی تھا؛ مگر دونوں باتوں میں تطبیق ممکن ہے، اس طور پر کہ اولاً آپ کو فرشتہ نے قول کے ذریعہ حکم دیا جیسا کہ روایات میں ہے پھر خواب ہی میں آپ نے اس کی تعمیل فرماتے ہوئے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا عمل کیا، اس طرح دونوں باتیں صحیح ہوگئیں۔

غرض یہ کہ جب حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کو خواب کے ذریعہ حکمِ خداوندی ہوا کہ اپنے لختِ جگر و نورِ نظر حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام کو اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح

کردو، تو آپ اس کی تعمیل وامتثال کے لیے بہ دل وجاں تیار ہوگئے اور کیوں نہ تیار ہوتے جب کہ آپ اللہ کے خلیل وحبیب تھے اور اللہ کی محبت میں ہمہ وقت سرشار وچور رہتے تھے۔

حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَامْ سے مشورہ اوران کا جواب

مگراس سے قبل کہ آپ اس کی تعمیل کے لیے کمربستہ ہوتے، آپ نے حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَامْ سے مشورہ فرمایااوراس سلسلے میں ان کی رائے دریافت کی۔

قرآن مجید کہتا ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (الصافات:۱۰۲)

(جب (اسماعیل) ایسی عمر کو پہنچے کہ ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَامْ کے ساتھ چلنے پھرنے لگے تو ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَامْ نے فرمایا کہ برخوردار! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کررہا ہوں، سوتم بھی دیکھ لو کہ تمھاری کیا رائے ہے؟)

اس پر حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَامْ نے جو جواب دیا، وہ واقعی شانِ نبوی کا مظہر اتم اور خانوادۂ نبوت کے پروردہ ہونے کی ایک بین وروشن علامت ہے، نیز آپ کے کمالِ ایمان وعقل کا واضح ثبوت بھی ہے، حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَامْ کے جواب کو قرآن نے نقل فرمایا ہے:

﴿قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

(اسماعیل نے کہا کہ ابّا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ وہ کیجیے۔ان شاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔) (الصافات:۱۰۲)

چند اہم نکات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مشورے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس جواب میں چند اہم نکات ہیں، جن پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

(۱) پہلی بحث اور پہلا نکتہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سلسلے میں مشورہ لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، جب کہ آپ جانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم ہے اور کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کے خلاف رائے دیتے تو آپ اس حکم کی تعمیل نہ کرتے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے صاحب زادے سے مشورہ اس لیے نہیں تھا کہ نعوذ باللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مشورہ پر عمل کیا جائے، خواہ وہ موافقت میں مشورہ دیں یا مخالفت میں دیں؛ بل کہ یہ مشورہ بہ طور امتحان تھا، کہ آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایمانی جذبہ اور تعلق مع اللہ کا امتحان لینا چاہتے تھے اور یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ اس سوال پر کیا رائے ظاہر کرتے ہیں، جس سے ان کے ایمان باللہ و تعلق مع اللہ اور محبت للّٰہ و مع اللہ کی نوعیت و کیفیت معلوم ہو جیسے کبھی استاذ و باپ اپنے شاگردوں اور بچوں سے سوالات کر کے ان کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔

اس کی ایک حکمت حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان کی ہے، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحب زادے سے یہ مشورہ اس لیے کیا کہ آپ تفویض و صبر و تسلیم اور اللہ کے حکم کی تعمیل و انقیاد کا ذکر ان کی زبان سے نکلوانا چاہتے تھے۔(۱)

---

(۱) الدر منثور: ۷/۱۰۹

اور ایک وجہ وحکمت اس مشورہ کی یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکم الٰہی پر عمل کے لیے پہلے ہی سے تیار کردیں؛ کیوں کہ اطلاع وخبر کے بغیر اچانک ذبح کرنے کی صورت میں یہ امکان تھا، کہ کہیں بے خبری میں مزاحمت نہ کریں۔ لہٰذا بہ صورتِ مشورہ اطلاع دے کر اس حکمِ خداوندی پر عمل کی ترغیب اور اس کے لیے تیار رہنے کی تاکید فرمائی ہے؛ لہٰذا اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں۔

دوسرا نکتہ

دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ نہیں بتایا کہ مجھے اللہ کا حکم ہوا ہے کہ میں تم کو ذبح کروں، بل کہ صرف خواب کے حوالے سے یہ فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، اس میں بہ ظاہر یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف منسوب کر کے پیش فرمانے کی صورت میں خدانخواستہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس میں کچھ پس وپیش کرتے تو حکمِ خداوندی سے صریح اعراض و روگردانی لازم آتی، لہٰذا آپ علیہ السلام نے اس کو حکمِ خداوندی کی صورت سے پیش نہیں کیا، بل کہ اپنے ایک خواب کی حیثیت سے پیش کیا اور رائے دریافت کی؛ تاکہ وہ اس خواب کی تعبیر میں غور کریں؛ مگر چوں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ کے نبی ہونے والے تھے، تو اللہ نے آپ کو توفیق دی کہ وہ خواب کا منشا بھی سمجھ گئے اور ساتھ ساتھ تعمیل کے لیے بھی پوری طرح مستعد وتیار ہو گئے۔

تیسرا نکتہ

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بصیرت وفراست کا اندازہ کیجیے کہ حضرت

ابراہیم عَلَیہِ السَّلام کے خواب کو سن کر فرماتے ہیں ﴿ اِفعَلْ مَاتُؤمَرُ ﴾ کہ آپ کو جس کا حکم ہوا ہے وہ کیجیے۔حالاں کہ حکم ہونے کا کوئی ذکر حضرت ابراہیم عَلَیہِ السَّلام نے نہیں فرمایا؛ وجہ یہ ہے کہ حضرت اسماعیل عَلَیہِ السَّلام نے چوں کہ خاندان نبوت و خانۂ نبوت میں تربیت پائی تھی؛ اس لیے آپ نے سمجھ لیا کہ نبی کا خواب وحی الٰہی ہوتا ہے،اس لیے خواب کو حکم سے تعبیر فرمایا،اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی پر جس طرح بیداری میں اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے، اسی طرح حالت نوم (سونے کے وقت) بھی آتی ہے، کیوں کہ نبی کا قلب سوتے وقت بھی بیدار اور متوجہ الی اللہ ہوتا ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب کی شکل میں جس طرح وحی آتی ہے اسی طرح کتاب سے ہٹ کر بھی وحی ہوتی ہے جس کو حدیث وسنت کہتے ہیں۔

چوتھا نکتہ

جب حضرت اسماعیل عَلَیہِ السَّلام نے والد کی بات سن کر یہ فرمایا کہ آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کیجیے،تو اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ مجھے آپ ان شاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، یہ دراصل والد محترم حضرت ابراہیم عَلَیہِ السَّلام کو یقین دلانے کے لیے تھا کہ تعمیل حکم میں، میں بھی آپ کا پورا تعاون کروں گا اور کوئی مزاحمت نہیں کروں گا، پھر اس میں ''ان شاء اللہ'' کا لفظ بڑھا کر مشیت خداوندی پر اعتماد اور اس سے استناد کیا ہے، جو ایک طرف ان کے کمال ایمان و اعتماد علی اللہ اور توکل علی اللہ کی طرف اشارہ کرتا ہے،تو دوسری طرف یہ بتا رہا ہے کہ انھوں نے اپنے نفس پر اعتماد و بھروسہ نہیں کیا، جو ان کے کمالِ اخلاق کا پتہ دے رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان شاء اللہ کہہ کر حضرت اسماعیل عَلَیہِ السَّلام نے بتایا کہ میں صرف اللہ کی توفیق سے اس حکم کی تعمیل میں ثابت قدم رہ سکتا ہوں؛ ورنہ نفس پر کوئی

بھروسہ نہیں،اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے؛ بل کہ ہر دینی ودنیوی معاملے میں صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

پانچواں نکتہ

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس جواب میں ایک اور بات بڑی ہی قابل غور ہے،وہ یہ کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ مجھے" صبر کرنے والا "پائیں گے،بل کہ یوں فرمایا کہ"مجھے آپ صبر کرنے والوں"میں سے پائیں گے،اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ میں اکیلا ہی صبر کرنے والا نہیں ہوں کہ یہ میری خصوصیت ہو بل کہ صبر کرنے والے تو بہت ہیں،ان ہی میں سے ایک میں بھی ہوں،یہ دراصل آپ کی غایتِ تواضع کی بات ہے۔

مقامِ عبرت

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس جواب میں جو اہم نکات آپ نے ملاحظہ فرمائے،ان سے آپ کی فہم وبصیرت کا کمال،ایمان ویقین کی پختگی،تعلق ومحبت خداوندی کا رسوخ،اخلاق وآداب کی پاکیزگی کا خوب اندازہ ہوتا ہے؛ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس وقت یہ جواب آپ نے دیا تھا،آپ کی عمر اس وقت صرف ۱۳(تیرہ) برس کی تھی۔(۱)

اللہ اکبر! اس چھوٹی سی عمر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ایسا جواب دینا، آپ کی سلامتیٔ طبع کی بین دلیل ہے۔اس جواب سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ اگر اللہ کا حکم ہمارے سامنے آئے،تو کیا ہم اسی طرح اس کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس طرح کی قربانی پیش کرتے ہیں؟ جانور کی قربانی تو ہم بھی کرتے

(۱) روح المعاني: ۲۳/۱۲۸،القرطبي: ۱۵/۹۹

ہیں؛ مگر جب تک یہ جذبہ اس کے اندر کار فرما نہ ہو، وہ حقیقی معنی میں قربانی کہاں ؟!

ذبح کی تیاری اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام سے رخصتی

اس کے بعد حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل کے لیے تیاری فرمائی؛ " قصص النبیین " کی روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام سے فرمایا کہ اسماعیل کے سر کو کنگھی کر کے بال اس کے مشک وعنبر سے خوشبودار کر دو اور آنکھوں میں سرمہ لگا کر پاکیزہ کپڑے پہنادو کہ میرے ساتھ دعوت میں جائیں گے، چناں چہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اسی کے موافق تیار کر دیا اور فرمایا کہ اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ضیافت میں جاؤ چناں چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ،حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر نکل پڑے، اس روایت میں جو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ کو بتایا کہ دعوت میں جانا ہے، یہ کوئی جھوٹ نہیں؛ کیوں کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک دعوت ہی تھی، دعوت صرف کھانے پینے ہی کی نہیں ہوتی ،دعوت روحانی بھی ہوتی ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ یہ دعوت روحانی تھی۔

شیطان کا بہکاوا اور حضرت ہاجرہ کا جواب

جب حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام گھر سے چلے گئے،تو شیطان کو بڑی فکر لاحق ہوئی اور وہ ان حضرات کے اس نظام و پروگرام کو باطل کرنے کی تدبیر سوچنے لگا، ایک حدیث میں ہے کہ شیطان نے کہا کہ اگر میں نے ان کو اس موقعے پر فتنہ میں نہ ڈالا تو پھر کبھی بھی میں ان کو بہکا نہ سکوں گا۔ (۱)

(۱) ابن کثیر:۴/۱۵، الدر المنثور :۷/۱۰۸، القرطبی :۱۵/۱۰۵

اس کے بعد وہ سب سے پہلے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے پاس گیا اور ان کو بہکانے کی کوشش کرنے لگا، شاید یہ خیال کیا ہوگا کہ عورت عقل و دین دونوں میں ناقص و کمزور ہوتی ہے؛ لہٰذا پہلے ان ہی کو فتنے میں ڈالا جائے اور پھر ان کے ذریعے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام پر بھی قبضہ کیا جاسکتا ہے، چناں چہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے پاس انسانی شکل میں آیا اور کہنے لگا۔

”کیا تم کو خبر بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تمھارے بچہ کو کہاں لے گئے ہیں؟“

ایک جگہ ”ابن کثیر“ و ”قرطبی“ و ”درمنثور“ میں جو روایت آئی ہے اس میں اس واقعہ کو اسحاق علیہ السلام کا بتایا گیا ہے اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی جگہ حضرت سارہ کا نام ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث منکر ہے اور اگر محفوظ ہے، تو اشبہ یہ ہے کہ اسماعیل کی جگہ اسحاق کر کے تحریف کی گئی ہے۔ اصل حدیث حضرت کعب احبار سے ہے اور غالباً اسرائیلی روایات اس کا ماخذ ہیں اور یہود نے اس میں حسد سے تحریف کر کے اسماعیل کو اسحاق بنا دیا ہے۔

حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے فرمایا کہ وہ اپنی کسی ضرورت سے لے گئے ہیں، کہنے لگا کہ نہیں وہ تو اپنے بچے کو ذبح کرنے لے گئے ہیں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے فرمایا کہ کیا کوئی باپ اپنے بچے کو ذبح کرتا ہے؟ کہنے لگا کہ ان کے خدا کا ان کو یہی حکم ہے۔ حضرت ہاجرہ فرمانے لگیں کہ اگر خدا کا یہ حکم ہے، تو یہ اچھی بات ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے۔ (۱)

حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی ایمانی قوت

شیطان نے خیال کیا تھا کہ میں حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو عورت ذات ہونے

(۱) ابن کثیر: ۴/ ۱۵، قرطبی: ۱۵/ ۱۰۵، درمنثور: ۷/ ۱۰۸

کی وجہ سے بہ آسانی بہکا لوں گا، مگر حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے ایسا جواب دیا کہ اس کی ساری تدبیر فیل ہوگئی، حضرت ہاجرہ کو نہیں معلوم تھا کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام بچے کو کہاں لے گئے ہیں؟ صرف اتنا معلوم تھا کہ دعوت میں گئے ہیں یا کسی حاجت وضرورت سے تشریف لے گئے ہیں جب شیطان نے (جو انسانی شکل میں آیا تھا) بتایا کہ ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام تو اپنے بچے کو ذبح کرنے لے گئے ہیں، تو اولاً حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے یہ جواب دیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام اپنے بچے کو ذبح کردیں کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کو قتل کرتا ہے؟ یہ سن کر شیطان لاجواب ہوگیا اور اپنی بات پر یقین دلانے کے لیے ایک ایسی بات اس کی زبان سے نکل گئی، جس سے اس کی پوری تدبیر وکارروائی اکارت ہوگئی، شیطان نے کہا کہ ہاں کوئی باپ اپنے بچہ کو ذبح نہیں کرتا؛ مگر ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام اپنے بچے کو اس لیے ذبح کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو اللہ کا یہی حکم ہوا ہے۔ شیطان یہ سمجھا کہ جب میں یہ کہوں گا، تو وہ پریشان ہوجائیں گی اور واویلا مچائیں گی، گھر کے باہر دوڑ پڑیں گی اور ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی راہ میں مزاحم بن جائیں گی؛ مگر ہوا یہ کہ حضرت ہاجرہ نے جوں ہی سنا کہ اللہ کے حکم کی بنا پر حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام اپنے بچے کو ذبح کرنے لے گئے ہیں، تو خدا کے نام وہ بھی مر مٹنے کو تیار ہوگئیں اور کہنے لگیں کہ اگر خدا نے یہ حکم دیا ہے، تو پھر مجھ کو بھی منظور ہے اور بہ زبان حال یوں گویا ہوئیں کہ:

برتر از اندیشۂ سود وزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

غرض شیطان مایوس ہوگیا اور دوسری تدبیر سوچنے لگا کہ اس عبادت اور اطاعت سے کس طرح ان کو روکوں؟

حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کو بہکانے کی کوشش ناکام

پھر وہ حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی طرف دوڑا اور حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کو بہکانے کی کوشش کرنے لگا، کہا کہ آپ اپنے بیٹے کو لیے کہاں جارہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ایک حاجت اور کام سے جارہا ہوں، شیطان کہنے لگا کہ نہیں! آپ تو اس کو ذبح کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں، حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے (اسی کی زبان سے حق نکلوانے کے لیے فرمایا کہ) میں کیوں اپنے بچے کو ذبح کروں گا؟ شیطان کہنے لگا کہ اللہ کا آپ کو یہی حکم ہے اس لیے آپ اس کو ذبح کریں گے اور ایک روایت میں ہے کہ شیطان حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے ایک دوست کی شکل میں آیا اور کہا کہ آپ ایک خواب کی بنا پر اپنے بچے کو ذبح کرنے لے جا رہے ہیں، جب کہ خواب کبھی سچا ہوتا ہے، تو کبھی اس میں خطا بھی ہو جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ قسم بہ خدا خدا کا حکم ہے، تو مجھ کو تو یہ کرنا ہی چاہیے، اس پر وہ وہاں سے بھی ناکام و نامراد واپس ہوا۔(۱) روایات میں اس بارے میں اختلاف ملتا ہے کہ شیطان بہکانے کی کوشش میں پہلے حضرت ابراہیم کے پاس گیا یا حضرت اسماعیل کے پاس؟ مگر اس میں کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہے۔اس لیے یہاں ہم نے جو اختیار کیا ہے، وہ کسی فیصلہ کی وجہ سے نہیں ہے۔بل کہ ایک روایت ہونے کی حیثیت سے ہے۔

حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام کو بہکانے کی کوشش

اس کے بعد شیطان، حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام کو بہکانے کی کوشش کرنے لگا، جب یہ حضرات منیٰ کی وادی کے قریب ہوئے تو یہ مردود شیطان حضرت

---

(۱) الدر المنثور :۷/۱۰۸، الطبري:۱۰/۵۱۱

اسماعیل علیہ السلام کے قریب آیا اور کہنے لگا کہ خبر بھی ہے کہ تمھارے والد تم کو کہاں لے جا رہے ہیں؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کی جناب میں قربانی کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں، شیطان نے کہا کہ ہاں! مگر وہ کسی جانور کی نہیں بل کہ تمھاری قربانی کرنے کے لیے جا رہے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کام اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں یا اپنی مرضی سے؟ شیطان اس کے جواب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی مرضی سے کر رہے ہیں کیوں کہ اس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام ہرگز یقین نہ کرتے بل کہ تردید کر دیتے؛ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو یہ کہنا پڑا کہ یہ کام وہ اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں اس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ جب ذبح کا حکم اللہ کی طرف سے ہے، تو میں کیسے اس کی مخالفت کر سکتا ہوں؟ یہ سن کر شیطان خائب و خاسر لوٹ گیا، ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ اللہ کی خاطر مجھے ذبح کر رہے ہیں، تو میں اس پر صبر کروں گا اور اللہ اس کا اہل ہے۔(۱)

اس طرح شیطان کی یہ دوسری تدبیر بھی ناکام ہوگئی اور یہ ظاہر ہوگیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نہیں؛ بل کہ یہ پورا گھرانہ اور یہاں کا بچہ بچہ عشق خداوندی میں سرشار و چور ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنی جان بھی اللہ کے نام پر قربان کرنے کو تیار ہے۔

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی رمی جمار

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس جگہ شیطان پر کنکریاں ماریں؛ تاکہ وہ دفع ہو اور "مسند احمد" کی ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذبح کا حکم دیا گیا تو شیطان سعی کے وقت حاضر ہوا اور حضرت

(۱) بدائع الزھور : ۹۲ و در منثور :۷/۱۱۰

ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام سے آگے بڑھا، پس حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام اس سے آگے بڑھ گئے۔ پھر حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام آپ کو ''جمرۃ العقبہ'' کی طرف لے گئے، تو شیطان وہاں بھی ظاہر ہوا، تو حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے اس کو سات کنکریاں ماریں پس وہ چلا گیا پھر ''جمرۃ الوسطیٰ'' کے پاس ظاہر ہوا، تو آپ نے پھر سات کنکریاں اس کو ماریں، تو وہ چلا گیا اور پھر جمرۃ الاخریٰ کے پاس ظاہر ہوا، تو آپ نے پھر سات کنکریاں پھینکیں اور وہ بھاگ گیا۔ (۱)

شیطان اللہ کا دشمن ہے۔ اس کو دفع کرنے کے لیے تدبیر، دراصل اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت کا تقاضہ ہے؛ اس لیے اللہ کو حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اس کو حاجیوں کے لیے مشروع کر دیا اور ان حضرات کا یہ عمل قیامت تک کے لیے زندۂ جاوید بنا دیا گیا۔

باپ بیٹے کی گفتگو

غرض شیطان کو دفع کرنے اور اس کی تدبیروں اور سازشوں کو ناکام بنانے کے بعد یہ دونوں مقدس ہستیاں اللہ کے حکم کی تعمیل وتکمیل کے لیے تیاری کرنے لگیں، حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنے والد سے عرض کیا کہ ذبح سے پہلے میرے ہاتھ پیر مضبوط باندھ دیں، کہ کہیں ذبح کے بعد میرے تڑپنے سے آپ کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے نہ پڑ جائیں اور میرا منہ زمین کی طرف کر دیں؛ تاکہ میری نظر آپ پر اور آپ کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور جوش محبت تعمیل حکم خداوندی میں حائل نہ ہو جائے، ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ مجھے اچھی طرح سے باندھ دیں، کہ کہیں آپ کے کپڑوں پر میرے خون کے چھینٹے نہ پڑ جائیں۔ (۲)

---

(۱) ابن کثیر :۴/۱۵، القرطبي :۱۵/۱۰۶، الدر المنثور :۷/۱۰۵
(۲) الدرمنثور :۷/۱۰۴، الطبري :۱۰/۵۰۷

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام نے عرض کیا کہ آپ اپنے کپڑوں کو مجھ سے بچا کر رکھیں؛ تا کہ ان پر خون نہ لگ جائے اور میری والدہ اس کو دیکھ کر غمگین نہ ہو جائے اور ایک بات یہ عرض کی کہ میری والدہ کو سلام سنا دینا۔ (۱)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام نے یہ مشورہ دیا تھا، کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں؛ مگر ”بدائع الزهور“ میں علامہ محمد بن احمد بن ایاس حنفی نے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے جب حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام کے ہاتھ پیر باندھنے چاہے،تو حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام نے عرض کیا کہ ابا جی! میرے ہاتھ پیر رسی سے نہ باندھیں؛ کیوں کہ فرشتے کہیں گے کہ اللہ کے حکم پر عمل کرنے میں اس نے جزع فزع کیا چناں چہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے پھر ان کے ہاتھ پیر جن کو باندھ دیا تھا کھول دیا۔ (۲)

لیکن واللہ اعلم بالصواب پہلی بات ہی صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اکثر روایات میں اسی پہلی بات کا ذکر ہے۔

ذبح عظیم

جب پوری طرح حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام کو تیار کر دیا،تو ذبح کے لیے ان کو پیشانی کے بل لٹا دیا، جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے:﴿ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴾ (کہ ان کو پیشانی کے بل لٹا دیا) اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ مشورہ حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام نے دیا تھا، پھر گردن پر چھری چلانے لگے اور پوری قوت وتوانائی اور شدت کے

(۱) الطبري: ۱۰/۵۰۷

(۲) بدائع الزهور: ۹۲

ساتھ آپ نے چھری چلائی؛ مگر حیرت ناک طور پر یہ دیکھا گیا کہ وہ چھری جو روزانہ بے شمار چیزوں کو کاٹتی اور ذبح کرتی تھی، وہ آج اللہ تعالیٰ کے حکم پر اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلانے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ میں کند ہوگئی ہے- وہ تعمیل ارشاد خداوندی میں بیٹے کو ذبح کرنا چاہتے ہیں اور چھری ہے کہ اس میں رکاوٹ بن رہی ہے- حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ چھری تعمیل حکم میں مانع بن رہی ہے، تو آپ کو غصہ آیا اور آپ نے چھری کو زور سے پھینک دیا، اب اللہ تعالیٰ نے چھری کو گویائی عطا فرمائی اور چھری کہنے لگی:

''اے ابراہیم! میں دو امروں کے درمیان: ہوں ایک طرف خلیل کا حکم ہے کہ میں کاٹوں اور دوسری طرف رب جلیل کا حکم ہے کہ ہرگز نہ کاٹوں اور میں جلیل کا حکم مانوں گی نہ کہ خلیل کا۔''(۱)

اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کی یہ چاقو پیتل میں تبدیل ہوگئی (غالباً یہ مطلب ہے کہ اس کا استعمال ذبح کے لیے نہیں کیا جا سکتا تھا)۔(۲)

اسی اثنا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالی کی جانب سے یہ آواز دی گئی:

﴿قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا﴾ (سورۃ الصافات: ۱۰۵)

(اے ابراہیم! آپ نے خواب کو سچ کر دکھایا!)

کیوں کہ خواب میں یہی دیکھا تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں اور یہاں بھی وہی ہوا کہ اپنی پوری قوت وطاقت اس کے لیے خرچ کر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر بیٹے کو ذبح کر دوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے چھری کے اندر سے کاٹنے اور ذبح

(۱) بدائع الزهور :۹۲

(۲) الدر المنثور :۱۱۲/۷

کرنے کی صلاحیت سلب کرلی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی حالت میں ہیں کہ اللہ کا فرشتہ جبریل آتا ہے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اٹھا کر ان کی جگہ جنت کا ایک مینڈھا رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ اس مینڈھے کو ذبح کر دیجیے۔قرآن میں اسی کو فرمایا:

﴿وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ﴾

(ہم نے فدیہ دیا ان کا ذبح عظیم سے) (الصافات:۱۰۷)

متعدد روایات میں ہے کہ یہ مینڈھا، جس کو اللہ نے جنت سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بدلے میں ذبح کرنے کے لیے بھیجا تھا، وہ جنت میں چالیس سال تک چرتا رہا تھا اور یہ کہ یہ وہ مینڈھا تھا، جس کو حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے ہابیل نے اللہ کے نام قربانی کرتے ہوئے پیش کیا تھا، اللہ نے اس کو جنت میں محفوظ رکھا تھا۔(۱)

تکبیراتِ تشریق کی ابتدا

ایک روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلائی؛ تو آسمان وزمین کے فرشتے بے قرار ہوکر چیخ اٹھے اور پرندوں اور جانوروں میں ہلچل مچ گئی کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ اور سب نے اللہ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! اس شیخ پر اور اس بچے پر رحم فرما۔(۲)

پھر یہ دیکھ کر حضرت جبریل علیہ السلام کی زبان سے نکلا "الله أكبر الله أكبر" اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ نے فرمایا "لاإله إلاالله والله أكبر" اور حضرت ابراہیم علیہ السلام

(۱) الطبري:۱۰/۵۱۶، الدر المنثور:۷/۱۱۳
(۲) بدائع الزهور:۹۲

نے فرمایا" أللہ اکبر وللہ الحمد" یہ تکبیر تشریق ہے، جو ایام تشریق میں سنت قرار پائی اور آج تک باقی ہے۔(۱)

عبرت وموعظت

یہ پورا واقعہ ہمارے لیے عبرت وموعظت ہے اور اس کے جز جز اور اس کی ایک ایک کڑی میں ہمارے لیے ہدایت کا سامان ہے۔بعض اجزا پر کلام اوپر عرض کیا گیا ہے؛ مگر مجموعی حیثیت سے یہ پورا واقعہ ہمارے لیے جو عبرت اور موعظت کا سامان بہم پہنچاتا ہے، وہ یہ ہے کہ بندۂ مومن اللہ کی محبت میں، اللہ کے حکم کے مطابق، ہر چیز قربان کرنے تیار ہو جاتا ہے، مال تو اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کہ اس کی قربانی اس کے لیے مشکل ہو، وہ تو اس سے بڑھ کر اپنی لاڈلی اور پیاری اولاد کو بھی اس کے نام پر ذبح کرنے کو تیار ہو جاتا ہے، اس کی نظر اس پر ہوتی ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی وخوش رہے،قربانی کا یہ واقعہ دراصل اسی محبتِ خداوندی کا مظاہرہ ہے۔

لہٰذا قربانی کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اسی جذبہ اور ایسی ہی محبت خداوندی کے ساتھ قربانی کریں ؛ کیوں کہ اسلام کا منشا اس عمل سے یہی ہے کہ بندہ اللہ کی محبت میں سرشار اور چور رہے اور اسی کے مظاہر کے لیے قربانی پیش کرے، یہی وجہ ہے کہ جانور کی قربانی کی جگہ کوئی شخص غربا اور مساکین کو روپیہ دے دے تو قربانی کا ثواب نہ ملے گا اور یہ جائز نہ ہوگا، کیوں کہ قربانی کا مقصد غریبوں کی امداد نہیں ہے؛ حتیٰ کہ اگر کوئی گوشت لینے والا نہ ہو، تب بھی قربانی ہی کرنا ضروری ہے۔

غرض یہ کہ جس طرح حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ کی محبت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، اس طرح ہم کو بھی چاہیے کہ اس خالق و

(۱) القرطبي ۱۵/۱۰۲

مالک کی محبت میں ہمہ وقت اس کے احکام کی اطاعت کے لیے تیار رہیں اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دیں یہی وہ چیز ہے، جس نے اسلام کو ہر دور میں زندہ اور تاباں رکھا ہوا ہے اور یہی وہ عظیم و مبارک جذبہ ہے، جس نے اسلام دشمن طاقتوں کو حیراں و پریشاں کیا ہوا ہے، کہ اسلام کی اس قدر مخالفت اور اس کی خلاف سازشوں کے اس قدر جال بچھائے جانے کے باوجود؛ وہ آج تک کس طرح نہ صرف زندہ ہے بل کہ ہر روز ترقی کی طرف گامزن ہے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

فقہِ اسلامی
اور
غیر مقلدین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گذارش احوال واقعی

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْن، اَمَّا بعد:

دین اسلام سے وابستہ معمولی درجہ کا آدمی بھی اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ ہم تک جو" دین وشریعت" کے احکام ومسائل، حقائق ومعارف اوراس کا مزاج و انداز پہنچا اس کا ذریعہ ووسیلہ اولاً حضرات صحابہ ہیں پھر تابعین وتبع تابعین اور بعد کے ائمہ محدثین وفقہاء ہیں، اگر اس واسطہ کو درمیان سے اٹھا دیا جائے تو" دین و شریعت" سے ہماری وابستگی کا کوئی معنی ہی نہ ہوگا۔

اسی لیے ہمیشہ سے اہل اسلام نے حاملین دین وشریعت صحابہ، علماء، فقہاء و محدثین کی عظمت وجلالت بزرگی وشرافت، دیانت وامانت، تقویٰ وطہارت کا اعتراف کیا ہے اور اپنی نسلوں میں اس عظمت واعتماد کو باقی رکھنے کی فکر فرمائی ہے کیوں کہ اگر اسلاف پر اعتماد نہ رہا تو نہ قرآن پر اعتماد ہوسکتا ہے اور نہ حدیث پر اور نہ دین کی کسی بات پر۔

مگر افسوس کہ بعض لوگ، اسلام دشمن عناصر کی رچائی ہوئی سازش کا شکار ہو کر، اسلاف کی عظمت وجلالت اوران کے اعتبار واعتماد کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے؛ بل کہ مشکوک کرنے کی ناروا جسارت کررہے ہیں۔

کبھی صحابہ کرام کی عظیم شخصیات پر تنقید و جرح کرتے ہیں؛ کبھی تابعین و تبع تابعین وائمہ فقہ وحدیث کو ھدف ملامت بناتے ہیں؛ کبھی ان کی شخصیات کو مورد لعن وطعن قرار دیا جاتا ہے؛ تو کبھی ان کے کارناموں اور قربانیوں اور خدمات کو ھدف الزام بنا کر ان میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ سب دراصل انگریزی و سامراجی قوتوں کا پیدا کردہ ناپاک فتنہ ہے: جس کا مقصد اسلاف اوران کی خدمات سے اعتماد کو ختم کرنا اوراہل اسلام میں دین وشریعت کے بارے میں شک وریب پیدا کرنا ہے، اس فتنہ وسازش میں جہاں بہت سے لوگ ملوث ہوئے، وہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر ''طبقۂ غیر مقلدین'' بھی اس سازش کا آلۂ کار بن گیا اور اس نے مسلسل حضرات ائمہ وفقہا؛ بل کہ حضرات صحابہ کرام کو ھدف ملامت بنا کر، لوگوں کے درمیان اختلاف وانتشار اور اسلاف سے بے اعتمادی وبدظنی کی فضا پیدا کردی ہے۔

اس طبقہ نے اپنا نام ''اہل حدیث'' رکھا ہے، یہ دراصل، اس لفظ کا غاصبانہ قبضہ ہے، جس طرح منکرین حدیث نے اپنا نام ''اہل قرآن'' رکھ لیا ہے، اور اس لفظ پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے، قرآن وحدیث پر عمل پوری امت کا مشترکہ ورثہ ہے، صرف اپنے کو اہل قرآن کہنا، یا اہل حدیث کہنا اور پوری امت کو قرآن کا یا حدیث کا باغی یا منکر قرار دینا، انتہائی جسارت کی بات ہے، پھر خاص طور پر صحابہ وفقہا وائمہ کو بھی قرآن وحدیث کے باغی اور اپنی رائے کے پابند کہنا انتہائی درجہ کی جسارت ہے مگر یہ طبقہ اس جسارت ہی کو اپنی پوری لیاقت وحقانیت سمجھتا ہے۔

پھر جن مسائل کو عام طور پر یہ لوگ اچھالتے اور عوام کو انتشار وپریشانی میں مبتلا کرتے ہیں، ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں زمانہ سلف سے اختلاف چلا آرہا ہے اور اس فروعی وجزئی اختلاف کو صحابہ وتابعین وتبع تابعین اور ان کے بعد بھی ہر زمانہ کے علما وائمہ نے نہ تو حق وباطل کا اختلاف سمجھا اور نہ اس کی وجہ سے ایک دوسرے پر

اعتراض ونکیر فرمائی؛ بل کہ اس اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ احترام و اکرام محبت و عظمت اور حسن سلوک و رعایت ادب کا معاملہ فرمایا مگر غیر مقلدین انہی مسائل اختلافیہ کو حق و باطل بل کہ ایمان و کفر کا اختلاف سمجھتے اور سارے ائمہ و علما اور عام مسلمین کی تفسیق و تضلیل اور تکفیر و تذلیل کرتے ہیں۔

ان کا کہنا تو یہ ہے کہ امت میں اتحاد ہونا چاہیئے ؛مگر اتحاد کی جو صورت یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ نہ شرعاً قابل قبول ہوسکتی ہے اور نہ عقلاً قابل اعتبار، کیوں کہ یہ لوگ کہتے ہیں:

''ائمہ وفقہا کو چھوڑ دو اور سب کے سب قرآن وحدیث پر جمع ہو جاؤ''۔

بہ ظاہر یہ نعرہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن نہ شرعاً یہ قابل قبول ہے نہ عقلاً۔

شرعاً تو اس لیے کہ اس نعرہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر جاہل کو قرآن وحدیث کی تشریح کا حق دے دیا جائے اور ائمہ وفقہا نے جو تشریحات و توجیہات بیان کی ہیں ان کو فضول سمجھا جائے اور جاہل و اناڑی لوگوں کے ہاتھوں میں قرآن وحدیث دے کران کا کھلواڑ کیا جائے، ظاہر ہے کہ شریعت اس کی اجازت ہر گز نہیں دیتی۔

اور عقلاً یہ اس لیے نا قابل اعتبار ہے کہ اگر ایسا کیا بھی جائے گا تو پھر بھی قرآن وحدیث کے سمجھنے میں اختلاف پیدا ہوگا جس سے بچنے کے لیے انہوں نے یہ مشورہ دیا ہے؛ بس فرق یہ ہوگا کہ اسلاف کے مابین جو اختلاف ہوا اس کی بنیاد علم و تحقیق اور دلائل و براھین تھے اور ان غیر مقلدین کے مابین جو اختلاف ہوگا (بل کہ ہوا) وہ جہالت و بے خبری کی بنیاد پر ہوگا، چناں چہ ان میں بھی کئی فرقے بن چکے ہیں جو ایک دوسرے کو غلط قرار دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ لوگ جو اتحاد امت کا نعرہ لگاتے ہیں ائمہ اسلاف کو اور اہل

اسلام کو مشرک، کافر، فاسق وفاجر کہہ کر، اتحاد کس طرح پیدا کریں گے؟ جب کہ ان کی یہ روش انتہاء درجہ اختلاف وانتشار پیدا کرتی ہے؟

یہ لوگ عموماً بخاری شریف اور مسلم شریف پر عمل کے مدعی ہیں اور دوسروں سے بھی اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ بخاری ومسلم میں حدیث دکھاؤ، جب کہ نہ اللہ نے فرمایا اور نہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کہ صرف بخاری ومسلم کی حدیثوں پر عمل کرو پھر بخاری ومسلم کی حدیثوں پر صحیح ہونے کا حکم اور اس پر ایسا پختہ عقیدہ، محض ''امام بخاری وامام مسلم'' کی تقلید میں ہے؛ جب کہ یہ لوگ فقہا کی تقلید کو حرام وشرک کہتے ہیں اگر امام ابوحنیفہ اور فقہا کرام کی تقلید شرک ہے تو امام بخاری وامام مسلم کی تقلید کرنا کیسے جائز ہوا؟

پھر یہ لوگ تقلید کو حرام وشرک کہتے ہیں حالاں کہ ان کے عام لوگ؛ بل کہ عام علما بھی ان کے اپنے علما ہی کی تقلید کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں، ایک واقعہ جو خود میرے ساتھ پیش آیا تھا عرض کردوں، ایک دن میں اپنے بعض دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ایک صاحب نے آکر ملاقات کی پھر کچھ مسئلہ پوچھا، میں نے جواب دیا تو وہ صاحب پوچھنے لگے کہ کیا یہ بات بخاری میں ہے؟ اب میں سمجھا کہ یہ صاحب غیر مقلد ہیں کیوں کہ بخاری شریف کو تو پوری امت مانتی ہے، مگر دین کو بخاری میں یا مسلم میں منحصر سمجھنا ''غیر مقلدین'' کی خصوصیت ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ جو کچھ کرتے ہیں وہ سب بخاری شریف سے ثابت ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں، میں نے کہا کہ آپ نماز میں ہاتھ کہاں باندھتے ہیں؟ کہا کہ سینہ پر باندھتا ہوں میں نے کہا کہ یہ بخاری میں کہاں ہے؟ کہنے لگے کہ کیا بخاری میں نہیں ہے؟ میں نے کہا کہ دعویٰ آپ کریں اور دلیل میں دوں؟ میں نے کہا کہ یہ نہ بخاری میں

ہے نہ مسلم میں ہے، اب تو بڑے پریشان ہوئے، پھر کہنے لگے کہ نہیں، بخاری میں ضرور ہوگا، میں فلاں (نام لیکر) مولانا سے پوچھ کر آتا ہوں، میں نے کہا کہ یہی تقلید ہے کہ آپ صرف اپنے علما کے کہنے پر کہ بخاری میں ہے عمل کر رہے ہیں اور آپ کو خود پتہ نہیں ہے کہ یہ بخاری میں ہے یا نہیں؟ اور آپ کے نزدیک تقلید شرک ہے، پھر میں نے کہا کہ آپ کسی بھی اپنے عالم سے پوچھ لیں اور جب بھی بخاری یا مسلم میں مجھے ایسی حدیث دکھادیں تو ایک لاکھ کا انعام دوں گا، یہ صاحب اب بھی ادھر ادھر نظر تو آتے ہیں مگر آنکھ بچا کر چلے جاتے ہیں، افسوس کہ انعام لینے کی جرأت وہ آج تک نہ کر سکے۔

غرض یہ کہ خود غیر مقلدین بھی تقلید کرتے ہیں مگر تقلید کو شرک کہتے ہیں اور ائمہ کے خلاف لوگوں کا ذہن بناتے ہیں اسی اختلاف وانتشار کو ختم کرنے کے لیے اور عوام کو اصل حقیقت سمجھانے کے لیے زیر نظر مضامین، مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے، ان میں سے بعض مضامین روزنامہ ''سالار'' بنگلور میں شائع ہو چکے ہیں، اب ضرورت پر ان سب کو جمع کر کے اور بعض مضامین کا اضافہ کر کے کتابی صورت میں، پیش کیا جا رہا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو حسنِ قبول عطا فرمائے اور لوگوں کے لیے مفید و بار آور فرمائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ
جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

۸/صفر ۱۴۲۲ھ مطابق ۳۰، مئی ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فقہ کی حقیقت و ضرورت

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور احسان سے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے احکامات اور تعلیمات نازل فرمائے اور ان کے نزول کے لیے مقدس ذوات کا انتخاب فرمایا جن کو انبیاء کرام کہا جاتا ہے اور ان کے قول و عمل، ان کی سیرت و کردار اور ان کے حالات و معاملات کے ذریعہ اپنے احکام و فرامین کی تشریح و توضیح فرمائی، اس طرح انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک طرف خدائی احکام کا مجموعہ تھا تو دوسری طرف نبی کے اقوال و اعمال اور اس کی سیرت و کردار کا اُسوہ بھی تھا، آخری نبی خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب خدا کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے تو آپ پر اللہ کا آخری و دائمی کلام نازل ہوا جس کو ''قرآن مجید'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور دوسری طرف آپ کے اقوال و افعال، آپ کے کوائف و احوال اور آپ کی سیرت و کردار کے ذریعہ اس کلامِ ربانی و حقانی کی تشریح و توضیح اور تبیین و تفہیم اور اس کے احکام پر عمل کی ترتیب و تسہیل کرائی گئی، اس طرح ہماری ہدایت کے لیے دو چیزیں بنیادی و اساسی ماخذ کی حیثیت سے مقرر فرمادی گئیں، ایک قرآن مجید، دوسری نبی کی سنت۔

اسلام کے دو بنیادی مآخذ

چناں چہ حدیث پاک میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، تم جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے ایک اللہ کی کتاب دوسرے اس کے رسول کی سنت۔ (۱)

نیز ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہترین کلام، اللہ کا کلام ہے اور سب سے بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور بدترین کام نیا ایجاد کردہ کام (بدعت) ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (۲)

اس حدیث میں ایک اللہ کے کلام کا اور دوسرے طریقہ محمدی (سنت) کا ذکر کر کے باقی امور کو ''شر'' قرار دیا گیا ہے، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کے بنیادی مآخذ، قرآن وحدیث ہیں۔

اجماعِ اُمت

ہاں قرآن وحدیث ہی سے، کچھ اور ماخذ کا بھی ثبوت ہوتا ہے، مثلاً اجماعِ اُمت کہ اگر کسی بات پر صحابہ کرام یا تمام علما وائمہ کا اتفاق ہو جائے، وہ بھی ایک مأخذ اور دلیل ہے، علما نے اجماع کی تعریف یہ لکھی ہے:

الاجماع هو اتفاق جميع المجتهدين من المسلمين في عصر من العصور بعد وفاة الرسول على حكم شرعي في واقعة .

''اجماع نام ہے امتِ محمدیہ میں سے اہل حل وعقد (علما وائمہ) کا بعد وفات رسول کسی زمانے میں کسی واقعہ کے حکم پر اتفاق کرنے کا۔'' (۳)

---

(۱) مشکوٰۃ:۳۱

(۲) مسلم:۱۴۳۵

(۳) علم اصول الفقه:۴۵ الاحکام للآمدی:۲۵۴

علامہ عبدالوہاب خلاّف اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فاذا وقعت حادثة وعرضت على جميع المجتهدين من الامة الاسلامية وقت حدوثها واتفقوا على حكم فيها سمى اتفاقهم اجماعا واعتبر اجماعهم على حكم واحد فيها دليلا على ان هذا الحكم هو الحكم الشرعي في الواقعة."

(جب کوئی واقعہ ومسئلہ درپیش ہو اور اُمتِ اسلامیہ کے ائمہ مجتہدین کے سامنے اسی زمانے میں وہ پیش کیا جائے اور وہ سب کے سب اس بارے میں ایک حکم پر اتفاق کریں؛ تو اس اتفاق کو اجماع کہا جاتا ہے اور ان کے ایک ہی حکم پر اجماع اور اتفاق کر لینے کو اس بات کی دلیل قرار کردیا جائے گا کہ اس واقعہ ومسئلہ میں حکم شرعی یہی ہے۔(۱)

اجماع کے حجت ودلیل ہونے کی دلیل قرآن وحدیث میں وارد ہے۔

قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۔﴾

(جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی؛ اور جو اہلِ ایمان کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اس طرف لے جائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور ہم اس کو جہنم رسید کریں گے۔)(النسآء: ۱۱۵)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قال العلماء في قوله تعالى:"ومن يشاقق الرسول" دليل

---

(۱) علم اصول الفقه: ۴۵

علی صحة القول بالاجماع''(علماء نے فرمایا کہ اس آیت میں اجماع کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔(۱)

اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''استدل الشافعی رحمہ اللہ و تابعه الناس بقوله تعالی و من یشاقق الخ علی حجة الاجماع و تحریم مخالفته''

(کہ امام شافعی اور دیگر لوگوں نے آپ کی اتباع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت میں اجماع کے حجت ہونے اور اس کی مخالفت کے حرام ہونے کی دلیل ہے۔)(۲)

نیز حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لا تجتمع امتی علی ضلالة.»

(کہ میری اُمت گمراہی پر اتفاق و اجماع نہیں کر سکتی۔)(۳)

اس حدیث سے بھی علما نے استدلال کیا ہے کہ اُمت کا اجماع حجت و دلیل ہے، کیوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ میری اُمت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی، لہٰذا اگر اُمت کسی بات پر اجماع کر لے تو وہ حق ہی پر اجماع ہوگا۔

غرض یہ کہ قرآن و حدیث ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دلیل و مأخذ اجماع اُمت بھی ہے جس سے احکام کا علم ہوتا ہے۔

---

(۱) قرطبی:۵/۳۸۷

(۲) استنباط التنزیل:۸۴

(۳) ترمذی:۲/۳۹،ابو دائود:۲/۵۸۴

قیاس واستنباط

اسی طرح قرآن وحدیث ہی سے ایک اور دلیل بھی ثابت ہوتی ہے اس کوفقہا کرام کی زبان میں ''قیاس'' کہا جاتا ہے،اوراصولیین کی اصطلاح میں قیاس یہ ہے:

'' هو الحاق واقعةلا نص على حكمها في الحكم الذى ورد به النص ،لتساوى الواقعتين في علة هذا الحكم''

(جس مسئلہ کا قرآن وحدیث میں منصوص حکم نہ ہواس کوحکم کے اعتبار سے اس مسئلہ سے ملانا جس کا حکم منصوص ہے اس وجہ سے کہ دونوں مسئلوں اور واقعات کی علّت ایک ہے،لہٰذا منصوص مسئلہ کا حکم غیر منصوص کے لیے ثابت کیا جاتا ہے اس کو قیاس کہتے ہیں)۔(۱)

مثال کے طور پر ایک شخص جمعہ کے دن، جمعہ کی اذان کے بعد اسکول میں بچوں کو پڑھاتا ہے،اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟اس بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی منصوص حکم نہیں ہے؛مگر فقہا کرام قیاس سے اس کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں جیسا کہ اذان جمعہ کے بعد تجارت ناجائز ہے،وجہ یہ ہے کہ قرآن میں اذان جمعہ کے بعد تجارت وبیع کوممنوع قرار دیا گیا ہے؛اوراس کی وجہ خطبۂ جمعہ ونماز جمعہ میں خلل کا اندیشہ ہے،لہٰذا یہ علّت اوروجہ جہاں بھی پائی جائے فقہا کرام وہ حکم بھی اس پر لگاتے ہیں جواذان جمعہ کے بعد تجارت کا قرآن نے بیان کیا ہے،لہٰذا تعلیم وتعلم ہو یا اور کوئی کام جس سے کہ نماز جمعہ میں خلل کا اندیشہ ہے وہ ناجائز ہوگا۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا:

حضرات صحابہ پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد فرماتے تھے اور بعض

(۱) علم اصول الفقه للعلامه خلّاف:۵۲

احکام کو بعض پر قیاس کرتے تھے اور ایک نظیر سے دوسری نظیر پر اعتبار کرتے تھے، پھر متعدد مثالیں لکھ کر فرمایا کہ امام مُزنی (شافعی) نے کہا کہ فقہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر آج تک برابر تمام فقہی احکام میں جو ان کے دین سے تعلق رکھتے ہیں قیاس کا استعمال کرتے آرہے ہیں اور فرمایا کہ فقہا نے اس پر اجماع کیا ہے کہ حق کی نظیر حق اور باطل کی نظیر باطل ہوتی ہے، لہٰذا کسی کے لیے جائز نہیں کہ قیاس کا انکار کرے۔(۱)

قیاس کی حجیت قرآن و حدیث کے متعدد دلائل سے ثابت ہے، یہاں صرف ایک ایک دلیل پر اکتفاء کرتا ہوں، ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا أَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ أَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ، ذٰلِكَ خَيْر وَّأَحْسَنُ تَأْوِيلاً ﴾

اس سے معلوم ہوا کہ جن مسائل و معاملات میں اللہ و رسول کا صریح حکم نہیں ہے ان میں اللہ و رسول کے بیان کردہ احکام میں غور و خوض کر کے حکم معلوم کیا جائے گا، اور یہی قیاس ہے۔

اور حدیث سے اس کی دلیل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو پوچھا کہ اگر تمہارے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہو تو تم کیا کرو گے؟ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ

(۱) اعلام الموقعین: ۱/۲۰۳-۲۰۵

مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر سنت رسول اللہ سے فیصلہ کروں گا، آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی وہ مسئلہ نہ ملے تو کیا کروگے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر میں میری رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی نہ کروں گا، اس پر رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینے پر مارا اور فرمایا کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس سے اس کا رسول راضی ہے، علاّمہ ابن القیم رَحِمَهُ اللهُ اس حدیث کی صحت کی طرف مائل ہیں۔ (۱)

غرض یہ کہ جمہور علماء و ائمہ کے نزدیک قرآن و حدیث کی روشنی میں قیاس مجتہد بھی ایک دلیل ہے جس سے قرآن و حدیث میں پوشیدہ و مخفی حکم ظاہر ہوتا ہے، یہ نہیں کہ قیاس کے ذریعہ احکام بنائے و تراشے جاتے ہیں۔ اسی لیے علما اصول نے لکھا ہے کہ (القیاس مُظهِر لا مثبت) یعنی قیاس پوشیدہ احکام کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ نئے احکام ثابت کرتا ہے۔ (۲)

یہ کل چار دلائل ہیں جو جمہور علماءِ اُمت کے نزدیک معمول بہا و معتبر ہیں اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ، بل کہ دیگر ائمہ مجتہدین سب کے سب ان چاروں دلیلوں کو مانتے ہیں، سوائے اہل الظاہر کے (جن میں آج کل کے اہل حدیث حضرات بھی داخل ہیں) اور بعض فرقوں کے کوئی اس کا منکر نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض کم فہم لوگ قیاس کا معنی یہ سمجھتے ہیں کہ ائمہ کرام محض اپنی عقل و فہم سے جو

---

(۱) دیکھو: اعلام الموقعین: ۱/۲۲

(۲) اصول البزدوی: ۲۴۹

مناسب خیال کرتے ہیں، اس کا حکم دیتے ہیں، حالاں کہ قیاس کے معنی یہ نہیں ہیں، اگر یہ معترض لوگ ''اصول فقہ'' کی کتابوں میں قیاس کی حقیقت وتعریف کھول کر پڑھتے تو شاید غلط فہمی سے محفوظ رہتے اور ائمہ کرام سے بدگمانی وبدزبانی میں مبتلا نہ ہوتے۔

پہلے یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ آئے دن مختلف واقعات وحوادث پیش آتے رہتے ہیں، اور عجیب وغریب مسائل وحالات سے ہم دوچار ہوتے رہتے ہیں، اور قرآن و حدیث میں ان نئے نئے احوال وحوادث کا صاف صاف کوئی حکم نہیں ملتا، اب ایسی صورت میں ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم یوں کہہ دیں کہ یہ احوال وحوادث شرعی والٰہی قانون وحکم سے آزاد وخارج ہیں، ان کا کوئی حکم نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ بات اسلام کے مکمل وکامل ہونے کے خلاف ہے، جس کا اعلان بڑی شد ومد کے ساتھ قرآن کریم نے فرمایا ہے اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں غور وفکر کر کے ان حالات وواقعات کی نظیروں کو تلاش کیا جائے اور ان نظائر پر ان نئے احوال وحوادث کو قیاس کر کے وہی حکم ان کے لیے بھی ثابت کیا جائے، اسی دوسرے طریقہ کا نام فقہا کی اصطلاح میں ''قیاس'' ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے یہ عقلاً وعرفاً بھی پسندیدہ ہے اور اسلام کے کامل ومکمل ہونے سے زیادہ موافقت ومطابقت بھی رکھتا ہے۔

چناں چہ تمام فقہا کرام غیر منصوص مسائل میں قیاس سے کام لے کر ان کا شرعی حکم تلاش کرتے اور قرآن وحدیث میں مذکور نظائر وامثال سے ان کا حکم مستنبط کرتے ہیں۔

اس خاص مسئلہ اور واقعہ میں بہ ظاہر قرآن وحدیث ساکت ہیں، لیکن ایک دوسرے واقعہ سے اس کا حکم مستنبط کیا گیا ہے، اس کو قیاس کہتے ہیں اور حدیث میں بھی صراحتاً اس کی اجازت آئی ہے اور حضرات صحابہ بھی ایسے مسائل میں قیاس سے کام لیا کرتے تھے۔

کیا قیاس ممنوع ہے؟

ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات کو یہاں یہ شبہ ہو کہ صحابہ کرام اور فقہا کرام سے ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں رائے سے کام لینا حرام ہے، تو پھر قیاس کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دین میں رائے سے بچو۔ نیز فرمایا کہ اصحاب الرائے سنتوں کے دشمن ہیں۔ (۱)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فقہا چلے جائیں گے؛ تو پھر تم ان کے جانشین نہ پاؤ گے اور ایسے لوگ آئیں گے جو اپنی رائے سے قیاس کریں گے۔ نیز فرمایا کہ میری یہ رائے ہے، میری یہ رائے ہے کہنے سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ میری رائے میری رائے کہنے سے ہی ہلاک ہوئے۔ الخ (۲)

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے ''اعلام الموقعین'' میں اور علامہ ابن عبد البر نے ''جامع بیان العلم'' میں متعدد حضرات صحابہ سے نیز علما و فقہا سے دین میں رائے کے استعمال کی مذمت و برائی نقل کی ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے مراد وہ رائے ہے جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو، باقی غیر منصوص مسائل میں نظائر و امثال پر نظر کرتے ہوئے ان کا حکم مستنبط کرنا، یہ خود صحابہ سے اور فقہاء سے ثابت ہے جیسا کہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ کے حوالہ سے اوپر عرض کر چکا ہوں، لہٰذا اس قسم کے اقوال سے حضرات فقہا پر خصوصاً فقہ حنفی کے ائمہ پر یہ اعتراض کرنا کہ یہ لوگ رائے

---

(۱) اعلام: ۱/ ۵۵

(۲) اعلام الموقعین: ۱/ ۵۷

اور قیاس کو دین میں داخل کرتے ہیں اور گنہ کا کام کرتے ہیں، انتہائی غباوت اور جہالت کا کام ہے اور نہ صرف ائمہ پر بل کہ حضرات صحابہ پر بھی الزام و بہتان ہے۔

بہ ہر حال اجتہادی غیر منصوص مسائل میں قیاس سے کام لیا جاتا ہے اور یہاں بھی مجتہد ائمہ کرام کی آرا میں اختلاف ہوسکتا ہے کیوں کہ ایک امام و مجتہد نئے مسئلہ کے حل کے لیے قرآن و حدیث میں غور کر کے کسی بات کو اس کی نظیر سمجھتا ہے اور اس کا حکم بیان کرتا ہے، اور دوسرا مجتہد اسی مسئلہ کے لیے کسی بات کو اس کی نظیر خیال کر کے دوسرا حکم بیان کرتا ہے۔ مگر اس میں بھی کسی پر کوئی ملامت نہیں بل کہ ہر ایک اجتہاد کی رو سے لائق تعریف و توصیف اور مستحق اجر ہوتا ہے۔

مجتہد ہر حال میں مستحق اجر ہے

چناں چہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(جس حاکم (یا مجتہد) نے اجتہاد کیا اور صواب کو پالیا تو اس کو دو اجر ہیں اور جس حاکم یا (مجتہد) نے خطا کی (یعنی نیک نیتی سے اجتہاد کے باوجود اس سے خطا ہو گئی) تو اس کو ایک اجر ہے)(۱)

اس حدیث میں حاکم و قاضی کے لیے ہر صورت میں اجر کا وعدہ و بشارت ہے۔

صواب کو پہنچ جانے کی صورت میں دُہرے اجر کا، اور خطا ہو جانے کی صورت میں ایک اجر کا، اور یہی حکم مجتہد امام کا بھی ہے چناں چہ جمہورِ علماء نے اسی حدیث سے مجتہد کے لیے ہر صورت میں اجر ملنے کا حکم اخذ کیا ہے۔

الغرض! جو عالم قوتِ اجتہادیہ رکھتا ہے، وہ اپنے اجتہاد میں ہر صورت میں ماجور و مستحق ثواب ہے لہٰذا کسی پر ملامت و مذمت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

---

(۱) البخاری:۲/۱۰۹۲، المسلم:۲/۷۶، الترمذی:۱/۲۴۷، ابو داؤد:۲/۵۰۳، النسائی:۲/۳۰۳

فقہ کیا ہے؟

پس ان چاروں دلائل کی روشنی میں ظاہری عبادات جیسے نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ، قربانی، نیز طہارت اور معاملات ومعاشرات وغیرہ سے متعلق شرعی احکام کا مجموعہ فقہ کہلاتا ہے۔علامہ عبدالوہاب الخلاف اپنی کتاب لاجواب ''علم اصول الفقہ'' میں فقہ کی تعریف وحقیقت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''فقہ بنتا ہے ان شرعی احکام کے مجموعہ سے جن کا تعلق انسان سے صادر ہونے والے اقوال وافعال سے ہواور وہ احکام یا تو قرآن وحدیث کی نصوص سے مستفاد ہوتے ہیں یا دیگر دلائل شرعیہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ فقہ دراصل قرآنی وحدیثی نصوص اور اجماعی وقیاسی اصول کی روشنی میں مرتب احکام کا مجموعہ ہے،قرآن سے نکلے ہوئے احکام بھی اس میں ہیں اور احادیث سے مستنبط احکام بھی اس میں ہیں؛ نیز اجماعی مسائل بھی اس میں ہیں اور وہ احکام بھی اس میں ہیں جو قیاس کے ذریعہ مجتہدین نے اخذ واستنباط فرمائے ہیں۔

فقہ،قرآن وحدیث ہی کا ثمرہ ہے

اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ فقہ درحقیقت قرآن وحدیث ہی کا ثمرہ اور پھل ہے کیوں کہ یہ یا تو قرآن وحدیث کے احکام منصوصہ ومستنبطہ کا مجموعہ ہے یا اجماعی وقیاسی احکام کا مجموعہ ہے-- جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا--اور یہ معلوم ہو چکا کہ

(۱) علم اصول الفقہ:۱۱

اجماع وقیاس بھی قرآن وحدیث کے حکم کے موافق دلائل شرعیہ میں داخل ہیں، لہٰذا جب فقہ ان چار دلائل سے حاصل شدہ احکام کا مجموعہ ہے تو وہ دراصل قرآن و حدیث ہی کا ثمرہ وپھل اور خلاصہ ولب لباب ہے۔

فقہ کو قرآن وحدیث کے خلاف سمجھنا یا ان سے ہٹی ہوئی یا زائد چیز سمجھنا انتہا درجہ کی کوتاہ نظری اور سطحیت پسندی کا نتیجہ ہے یا تعصب وناانصافی کا کرشمہ، ورنہ حق پسند وانصاف پسند صاف محسوس کرے گا کہ فقہا کرام کی کوششوں کے نتیجہ میں تیار ہونے والا فقہ کا یہ عظیم ذخیرہ دلائل شرعیہ ہی سے حاصل کردہ ہے اور اس کا انکار در اصل قرآن وحدیث کا انکار ہے۔

شریعت میں تفقہ کا مقام

اس اجمال کے بعد ہم اس کی تفصیل اور تحقیق میں جانا چاہتے ہیں تاکہ بات کھل کر سامنے آجائے۔

''فقہ'' کا لفظ عربی زبان میں جاننے اور سمجھنے کے معنی میں آتا ہے بعد میں اس کا استعمال زیادہ تر علم دین کے معنی میں ہونے لگا کیوں کہ علم دین کو عام علوم پر سیادت و شرافت حاصل ہے۔ نیز علمانے فرمایا کہ فقہ اصل میں فہم وسمجھ کو کہتے ہیں۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کو دین میں فقہ عطا ہوئی یعنی دین کی سمجھ عطا کی گئی۔ (۱)

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ﴿مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْراً یُفَقِّهْهُ فِیْ الدِّیْنِ.﴾ یعنی اللہ تعالے جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ (فقہ) عطا فرماتے ہیں۔ (۲)

---

(۱) لِسان العرب، مادہ ''فقہ'' جلد:۵۲۲/۱۳

(۲) مشکوۃ:۳۲

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ﴿ فَقِیْہٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَا بِدٍ﴾ یعنی ایک فقیہ (دین کی سمجھ رکھنے والا) شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ (۱)

اور بخاری ومسلم وغیرہ میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ لوگ سونے چاندی کے کان کی طرح ہیں؛ جوان میں زمانۂ جاہلیت میں (کریم الاخلاق ہونے کی وجہ سے) اچھے اور بہتر تھے وہ لوگ اسلام میں (یعنی اسلام لانے کے بعد) بھی بہترین لوگ ہیں جب کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔ (۲)

ان احادیث میں تفقہ وفقاہت (یعنی دین کی سمجھ) کی تعریف واہمیت بیان ہوئی ہے۔ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں فقاہت اس کو دی جاتی ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں۔ علامہ عبیداللہ مبارک پوری مشہور اہل حدیث عالم اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔

> ''فقہ اصل میں فہم کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے ''فَقِہ الرجل'' (ق پر زیر کے ساتھ) جب کہ آدمی جان لے اور سمجھ جائے اور فَقُہ (ق پر پیش کے ساتھ) اس وقت بولتے ہیں جب کہ عالم وفقیہ ہو جائے اور عرف نے فقہ کو عملی احکام شرعیہ کے ساتھ خاص کردیا ہے اور اس حدیث میں اس کو لغوی معنی پر محمول کرنا اولیٰ ہے تاکہ علوم دین میں سے ہر علم کی سمجھ کو شامل ہو جائے۔ (۳)

---

(۱) الترمذی:۲/۹۷، مشکوۃ:۳۴

(۲) مسلم شریف:۲/۳۰۷، البخاري:۲/۴۹۲، مُشکوۃ:۳۲، دارمی:۵۲،۱۸

(۳) مرعاۃالمفاتیح: ۱/۳۰۴

دوسری حدیث جس میں فرمایا کہ ایک فقیہ، شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہے یہ اگر چہ سندِ ضعیف سے آئی ہے مگر چوں کہ اس کی متعدد سندیں ہیں لہٰذا ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔ (۱)

اس حدیث سے بھی فقہ اور دین کی سمجھ کی فضیلت وعظمت معلوم ہوتی ہے، یہاں یہ باریک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے، کہ اس حدیث میں جو عابد کا ذکر ہے اس سے مراد دین کے علم سے بالکل عاری اور جاہل نہیں ہے، کیوں کہ عبادت کرنے والا بھی کچھ نہ کچھ دین کا علم رکھتا ہے، جیسا کہ عوام الناس عبادت کرتے ہیں تو اس کے فرائض وواجبات، سنن وآداب جانتے ہیں تب ہی تو وہ عابد ہوگا، بالکل نرا جاہل جسے دین کا کچھ بھی علم نہ ہو وہ درحقیقت عابد بھی نہیں ہوسکتا، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس حدیث کے اوپر غور فرمایئے کہ اللہ کے نبی علیہ السلام دین کا علم رکھتے ہوئے عبادت کرنے والے ہزاروں عابدوں پر فقیہ کو مقدم فرمارہے ہیں اور شیطان پر بہ مقابلہ ہزار عابدوں کے اس کو بھاری فرمارہے ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہاں فقیہ سے مراد دین کا تھوڑا بہت علم رکھنے والا نہیں ہے، کیوں کہ ایسا علم تو عابد کو بھی حاصل ہے؛ بل کہ فقیہ سے مراد وہ ہے جس کو دین کی سمجھ وفہم اور شریعت کے نصوص ودلائل اور ان دلائل کے استعمال کے مواقع کی مہارت دی گئی ہو، یا وہ عالم مراد ہے جو احکام دین سے اور ان کی تفاصیل سے واقف کار ہو۔ (۲)

اسی طرح تیسری حدیث سے واضح ہوا، کہ جو لوگ شریف الذات وکریم الاخلاق ہوتے ہیں وہ اسلام لانے کے بعد بھی بہترین لوگ ہوتے ہیں، جب کہ وہ دین کی

(۱) المقاصد الحسنة:۳۹۶، مرعاة المفاتیح:۱/۳۲

(۲) مرعاة المفاتیح:۱/۳۲۱

سمجھ حاصل کرلیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اشارہ ہے اس بات کی طرف، کہ اسلامی شرافت و بزرگی کی تکمیل صرف تفقہ فی الدین سے ہوتی ہے۔(۱)

غرض یہ کہ فقہ یعنی دین کی سمجھ بوجھ اور دلائل شرعیہ ونصوص شرعیہ کو تحقیق و تفصیل سے جان کر، ان کا اپنے موقعہ ومحل میں استعمال؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم نعمت اور اسلامی شرافت وعظمت کے لیے ایک ضروری امر ہے، اس کے بغیر نہ دلائل ونصوص کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ان کا بر موقعہ و بر محل استعمال ہوسکتا ہے۔ اس سے فقہ و تفقہ کی حیثیت اور اس کا اسلام میں مرتبہ ومقام واضح طور پر معلوم ہوگیا۔

لفظ فقہ کا مأخذ حدیث ہے

اوپر پیش کردہ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فقہا وعلما کے کلام میں جو ''فِقہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ من گھڑت نہیں ہے بل کہ حدیث سے مأخوذ ہے اور میرے نزدیک اس سے بھی زیادہ واضح مأخذ لفظ فقہ کا یہ حدیث ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ﴾

(اللہ تعالیٰ اس بندہ کو تروتازہ رکھے؛ جس نے میری بات سنی پھر اس کو یاد کیا اور یاد رکھا، پھر اس کو دوسروں تک پہنچایا، کیوں کہ بعض حامل فقہ (یعنی حدیث یاد رکھنے والے) فقیہ نہیں ہوتے اور بعض حامل فقہ

(۱) فتح الباري: ۲/۵۲

اس شخص تک پہنچادیتے ہیں جو اس سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔(۱)

اس حدیث میں حامل فقہ اس شخص کو کہا گیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو سنا اور یاد کیا ہوا ہو، تو فقہ کا لفظ حدیث یا قرآن وحدیث دونوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فقہ کا لفظ قرآن وحدیث کے علم کے لیے خود زبان رسالت سے صادر ہوا ہے اور فقہا اسی کی اتباع میں قرآن وحدیث سے مستنبط احکام وعلوم کو فقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

محدث اور فقیہ کا فرق

اوپر پیش کردہ حدیث (رب حامل فقه غير فقيه الخ) سے محدث اور فقیہ کی ذمہ داری اور ان کے منصب کا فرق بھی معلوم ہو گیا، وہ یہ کہ محدث کا کام یہ ہے کہ حدیث کے یاد کرنے یاد رکھنے اور دوسروں تک من وعن (کما سمع) پہنچانے کا اہتمام وفکر کرے، اور فقیہ کا کام اور اس کا منصب یہ ہے کہ وہ حدیث کے الفاظ کے معنی پر اس کے سیاق وسباق پر، اس کے مقصد ومنشا پر، اس کی علّت وحکمت پر غور وفکر کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تفقہ کا کام ہر ایک کے بس کا نہیں، ہر کس وناکس اگر تفقہ کا حامل ہوتا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیسے ارشاد فرما سکتے ہیں کہ ”بعض حامل فقہ (حدیث) غیر فقیہ ہوتے ہیں؟ غرض حدیث کا یاد رکھنا اور اس کی روایت کرنا محدث کا کام ہے، اور حدیث کی توضیح وتشریح کرنا اور اس کے منشا کو معلوم کر کے اس کے احکام کا استنباط کرنا فقیہ ومجتہد کا کام ہے، لہٰذا جس طرح اُمت کو مجتہدین کی ضرورت ہے، اسی طرح اُمت حضرات فقہا کرام کی بھی محتاج ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم کو امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداوٗد، وغیرہ محدثین کی

---

(۱) مشكوة:۳۵، مسند شافعي:۸۲، الترمذي:۲/۹۴، ابو دائود:۲/۵۱۵، دارمي :۵۳۱

اس لیے ضرورت ہے کہ ان کے ذریعہ ہم تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث محفوظ طریقہ پر پہنچیں، تو اس کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ہم کو ان احادیث کی تشریح و تفہیم اور ان کے منشا و مقصد کی تبیین و تحقیق اور ان سے نکلنے والے احکام کے استنباط و استخراج کے لیے امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام سفیان ثوری، امام ابن مبارک، امام محمد و امام ابو یوسف رحمہم اللہ جیسے فقہاء و علماء کی بھی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث جب ہمارے سامنے ہیں تو ہم کو کسی فقیہ و مجتہد کی کیا ضرورت ہے؟ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا یہ سوال و اعتراض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث پر واقع ہوتا ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ حدیث کو دوسروں تک پہنچادو کیوں کہ بعض حدیث کے حامل لوگ غیر فقیہ ہوتے ہیں؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو فرمائیں کہ ہر کوئی حدیث کو سمجھ نہیں سکتا سب کے سب فقیہ نہیں ہوتے اور یہ لوگ اس کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ ہم کو کسی فقیہ کی ضرورت نہیں ہم خود سب سمجھ جائیں گے۔ فیاللعجب!

عدم تفقہ کے مضحکہ خیز نتائج

جو لوگ فقیہ نہیں ہوتے وہ جب قرآن و حدیث پڑھتے ہیں اور اپنی ناسمجھی سے ان کے مطالب و معانی اخذ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں تو ان سے جو غلطیاں ہوتی ہیں اور قرآن و حدیث کے منشاء کے خلاف جو مفہوم و معنی وہ نکالتے ہیں ان کے مضحکہ خیز نتائج بھی سن لیجئے:

(۱) حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اس بات سے کہ آدمی اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے۔

اس حدیث کو ایک نرے محدث نے طلبہ کے سامنے بیان کیا تو ان میں سے کچھ لوگ کہنے لگے، کہ ہم نے بسا اوقات ایسا کیا ہے کہ جب ہمارے باغ میں پانی زیادہ ہو گیا تو ہم نے اپنے پڑوسی کے باغ میں یا کھیت میں چھوڑ دیا۔ اب ہم اس فعل سے استغفار کرتے ہیں، حالاں کہ حدیث بالا کا مطلب یہ ہے کہ حاملہ باندیوں سے جماع نہ کیا جائے۔ مگر اس کو عدم تفقہ کی وجہ سے نہ سنانے والا سمجھا نہ سننے والے سمجھے۔ (۱)

دیکھئے ظاہر الفاظ سے کس طرح دھوکہ کھالیا، اگر فقہ اور تفقہ سے ان بے چاروں کو حصہ ملا ہوتا تو ایسی فاش غلطی نہ کرتے۔

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اس بات سے کہ جمعہ کی نماز سے پہلے حلقہ بنائیں (یعنی حلقے بنا کر مسجد میں بیٹھیں)

علامہ خطابی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک محدث نے حدیث کے لفظ (نهى عن الحِلَق) کو حلق یعنی سر منڈوانا سمجھ کر، چالیس سال تک جمعہ سے پہلے سر منڈوانے سے پرہیز کیا؛ حالاں کہ یہ لفظ حَلَق نہیں؛ بل کہ حِلَق ہے، جس کے معنی ہیں 'حلقے'۔ (۲)

(۳) امام حاکم رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ محمد بن علی واعظ تھے۔ انہوں نے حدیث پڑھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(زَرَعْنَا تَزْدَادُ حِناً)

(ہم نے کھیتی کی تو سب کی سب مہندی بن گئی۔)

لوگ حیران ہوئے کہ اس کا کیا مطلب ہوا؟ اس پر ان واعظ نے ایک لمبا قصہ

(۱) تلبیس ابلیس علامہ ابن الجوزی:۱۶۶

(۲) ایضاً:۱۶۶

سنایا، کہ کسی جگہ کے لوگ اپنی پیداوار کی زکاۃ (عشر) نہیں دیتے تھے اور نہ صدقہ نکالتے تھے۔ لہٰذا ان کی کھیتی حِنا یعنی مہندی کا درخت بن گئی اسی قول کو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نقل کیا ہے۔ مگر معلوم ہے کہ یہ کس حدیث کا حشر واعظ شیریں بیاں نے کیا ہے سیوطی رَحِمَہُ اللہُ نے لکھا ہے کہ یہ مشہور حدیث ﴿ زُرْ غِبّاً تَزْدَدْ حُباً ﴾ (ناغہ کر کے ملاقات کر، محبت بڑھے گی) کا حشر ہے۔ (۱)

(۴) حاکم وغیرہ نے لکھا ہے کہ فقیہ ابو منصور بن محمد رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا کہ میں یمن میں تھا، وہاں ایک اعرابی ہم سے مذاکرہ کرنے لگا اس نے کہا کہ جب رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نماز پڑھتے تھے تو اپنے سامنے بکری کو کھڑا کر لیتے تھے، میں نے انکار کیا کہ ایسا نہیں ہے، تو وہ ایک کتاب اٹھا لایا اور اس میں حدیث دکھائی کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب نماز پڑھتے تھے تو اپنے سامنے عَنْزۃ رکھ لیتے تھے اور کہنے لگا کہ دیکھو یہ حدیث ہے۔ فقیہ ابو منصور فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تم نے خطا کی یہ "عَنْزۃ" (ن پر جزم کے ساتھ) نہیں ہے؛ بل کہ عَنَزہ (ن پر زبر کے ساتھ ہے) جس کے معنی لکڑی وعصا کے ہیں۔ (۲)

(۵) اس سے بھی عجیب وہ لطیفہ ہے جس میں ہے کہ ایک محدث صاحب نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ جب بھی استنجاء کرتے تو وتر پڑھتے، جب ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ جو تم میں سے استنجاء کرے "فَلْيُوتِر" (وتر پڑھے) حالاں کہ یہاں وتر کے معنی ہیں کہ استنجاء میں طاق عدد (تین، پانچ، سات) ڈھیلے لیا کرے۔ دیکھئے کہ فقہ نہ ہونے کے سبب کس قدر مضحکہ خیز مطلب نکال لیا۔

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۱۸۴، تدریب الراوی: ۲/۱۱

(۲) ایضاً

(٦) علامہ داؤد ظاہری جو بڑے عالم ہیں، مگر نصوص کے ظاہر پر جمود میں شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے فقہ وتفقہ کی رعایت نہ کر کے بڑے عجیب مسائل بیان کئے ہیں، مثلاً حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے۔ (۱)

داؤد ظاہری فرماتے ہیں کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا منع ہے اور اس سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ لیکن پاخانہ کرنا یا برتن میں پیشاب کر کے پانی میں ڈال دینا جائز ہے اور اس سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان کا یہ مسلک ذکر کر کے فرمایا کہ یہ مسئلہ ان کے جمود علی الظاہر کی بدترین مثال ہے۔ (۲)

یہ چند مثالیں اس لیے پیش کی گئیں کہ ان سے یہ واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ فقہ وتفقہ کے بغیر قرآن ہو یا حدیث کسی کا بھی سمجھنا مضحکہ خیز غلطی کا ارتکاب کرا دیتا ہے۔

محدّث بھی فقیہ کا محتاج ہے

اسی وجہ سے محدث بھی فہم نصوص میں فقیہ کا محتاج ہے؛ جس طرح فقیہ روایت و حفاظتِ حدیث کے لحاظ سے محدث کا محتاج ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام أعمش رحمہ اللہ کے پاس تھے، امام أعمش سے کسی صاحب نے کوئی مسئلہ دریافت کیا مگر آپ نے جواب نہیں دیا، پھر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ آپ اس بارے میں جواب دیجیے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کا جواب دیا۔ امام أعمش نے پوچھا کہ یہ جواب آپ نے کس دلیل سے دیا ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث سے جو آپ نے ہم سے بیان کی (پھر وہ حدیث بیان کی) یہ سن کر امام أعمش نے فرمایا کہ (نحن الصيادلة وانتم الاطباء) یعنی ہم (محدثین) تو دوا فروش

---

(۱) البخاري: ۲۳۲، مسلم: ۴۲۴

(۲) شرح مسلم: ۱/۱۳

ہیں اور تم (فقہا) طبیب وڈاکٹر ہو۔(۱)

یعنی جس طرح دوافروش مختلف دوائیاں رکھے ہوئے ہوتا ہے مگر کس دوا کا کیا اثر اور خاصیت ہے اور کس بیماری کے لیے مفید ہے، اس کا علم اس کو نہیں ہوتا اور ڈاکٹر کو ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔ اسی طرح محدث حدیث کا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے مگر کس حدیث میں کس روحانی مرض کی کیا دوا ہے اور کس حدیث سے کیا مسئلہ مستنبط ہو رہا ہے اور کس موقعہ اور محل کا کیا حکم ہے یہ فقیہ جانتا ہے۔ یاد رہے امام اعمش رحمۃ اللہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے استاذ ہیں۔

اسی طرح کا واقعہ امام اعمش رحمۃ اللہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے مابین بھی پیش آیا تھا، جب امام ابو یوسف نے مسئلہ کا جواب دیا تو امام اعمش نے پوچھا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی؟ ابو یوسفؒ نے جواب دیا کہ اس حدیث سے جو آپ نے ہی مجھ سے بیان فرمائی تھی پھر وہ حدیث بیان کی تو امام اعمش نے فرمایا کہ یہ حدیث مجھے اس وقت سے یاد ہے جب کہ تمہارے ماں باپ (رشتہ ازدواج میں) جمع بھی نہ ہوئے تھے مگر اس حدیث کا یہ معنی ومطلب آج تک مجھے معلوم نہ تھا۔(۲)

دیکھ لیجئے! کہ امام اعمش رحمۃ اللہ استاذ حدیث ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اور امام ابو یوسف دونوں ان کے شاگرد ہیں مگر فہم حدیث اور استنباطِ احکام میں وہ شاگردوں کے محتاج ہوئے اور خود انہوں نے اس کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا۔

فقہاء کرام کا مقام، ابن القیم رحمۃ اللہ کی زبانی

حضرات فقہا کا جو منصب ومقام ہے اس کو علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے بڑے

(۱) جامع بیان العلم:۲/۱۶۰

(۲) جامع بیان العلم:۲/۱۵۹

بلند الفاظ میں پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پیغام کی تبلیغ دو قسم کی ہے، ایک اس کے الفاظ کی تبلیغ ہے اور دوسرے اس کے معانی کی تبلیغ، محدثین حضرات الفاظ کی حفاظت و تبلیغ کرتے ہیں اور فقہا کرام معانی کی حفاظت و تبلیغ کرتے ہیں علامہ فرماتے ہیں:

''فقہا کرام ہی کے اقوال پر لوگوں کے درمیان فتویٰ دائر ہوتا ہے جن کو استنباطِ احکام کی صلاحیت سے خاص و ممتاز فرمایا گیا ہے اور جو حلال و حرام کے قواعد و اصول ضبط کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، پس یہ فقہا زمین پر ایسے ہیں جیسے آسمان میں ستارے، ان ہی کے ذریعہ تاریکی میں بھٹکے ہوئے لوگ راہ پاتے ہیں اور ان فقہا کی ضرورت لوگوں کو کھانے پینے کی ضرورت سے زیادہ ہے، ان حضرات کی اطاعت قرآن کی رو سے ماں باپ کی اطاعت سے زیادہ فرض ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ محدث کا اپنا وظیفہ اور کام ہے اور فقیہ کا اپنا وظیفہ اور کام ہے اور دونوں کی اُمت کو ضرورت ہے۔

فقہ حضراتِ صحابہ کے دور میں

چناں چہ شروع دور ہی سے یہ طبقے اُمت کے اندر چلے آرہے ہیں حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جیسے ایک طبقہ حفظ و نقل روایت حدیث میں مشغول تھا۔ ایک طبقہ احادیث میں غور و خوض ان سے استنباط احکام و اخذ مسائل میں مشغول و مصروف تھا۔ اور لوگ ان حضرات سے احکام و مسائل میں رجوع کیا کرتے تھے۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

(۱) اعلام الموقعین: ۱/۹

”رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد فتوے کے کام پر اسلام کا اولین طبقہ ایمان (والوں) کی جماعت، قرآن کا لشکر اور رحمٰن کی فوج کھڑی ہوئی، یہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے صحابہ تھے، ان میں بہت زیادہ فتوے دینے والے بھی تھے اور بہت کم دینے والے بھی اور متوسط بھی۔“(۱)

میں اس موقعہ پر مناسب سمجھتا ہوں کہ ان حضرات کے فقہ وفتاویٰ کے کام کی چند مثالیں پیش کروں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کے دور ہی سے فقہ وفتاویٰ کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

صفا ومروہ کے درمیان سعی کا حکم

حج میں صفا ومروہ کے درمیان سعی کا حکم جمہورِ صحابہ وائمہ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ ضروری ہے، بعض تو اس کو حج کا رکن قرار دیتے ہیں، مگر اس بارے میں قرآن کریم میں جو آیت نازل ہوئی ہے اس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا ومروہ کے درمیان سعی واجب وضروری نہیں بل کہ صرف جائز ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (البقرة: ۱۵۸)

(کہ حج وعمرہ کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں اس بات سے کہ وہ صفا ومروہ کا طواف کرے)

ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا ومروہ کے طواف پر کوئی گناہ نہیں لیکن کوئی نہ کرے تو کیا ہے؟ بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نہ کرنے میں بھی حرج نہیں۔ چناں چہ حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور خصوصی شاگرد

(۱) اعلام الموقعین: ۱/۱۱

تھے، ان کو یہی دھوکہ ہوا اور انہوں نے حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ اگر میں صفا ومروہ کے درمیان طواف نہ کروں تو کوئی حرج اور گناہ تو نہ ہونا چاہیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کیوں؟ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ آیتِ قرآن میں یہی تو ہے کہ ان کا طواف کرنے میں گناہ نہیں، ضروری تو نہیں قرار دیا؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اے میری بہن کے لڑکے! اللہ کے رسول نے طواف کیا، مسلمانوں نے کیا، لہٰذا یہ سنت (یعنی اسلام کا طریقہ) ہے۔ اگر تم جو کہہ رہے ہو وہ بات صحیح ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتا کہ صفا ومروہ کا طواف نہ کرنے میں گناہ نہیں، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ صفا ومروہ کا طواف نہیں کرتے تھے، جب اسلام آیا تو حج کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے اس کا ذکر کیا کہ صفا ومروہ کے طواف کو لوگ حلال نہیں سمجھتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ (۱)

اس حدیث میں غور کیجئے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ آیتِ کریمہ سے ایک بات اخذ کرتے ہیں، مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا رد فرماتی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عمل اور آیت کے شانِ نزول کے پیش نظر اسی آیت سے اس کے خلاف مسئلہ اخذ واستنباط کرتی ہیں۔ اور علما نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس فقاہت کو سراہا ہے۔ چناں چہ حضرت امام زہری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ کی یہ بات میں نے امام ابوبکر بن عبد الرحمٰن رحمۃ اللہ کے سامنے پیش کی تو فرمایا "ان ھذا لعلم" (یہ تو بڑا علم ہے) (۲)

---

(۱) مسلم:۱/۴۱۴، البخاری:۱/۲۲۲، ابو داؤد:۱/۲۶۱، نسائی:۲/۴۰، ابن ماجه:۲۱۴

(۲) البخاري:۱/۲۲۲، مسلم:۱/۴۱۴

نماز میں ہنسنا ناقض نماز ہے

حضرت جابر بن عبداللہ ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں اگر کوئی ہنسے تو نماز کو دہرانا ہوگا؛ لیکن وضو کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ (۱)

نیز ان سے مروی ہے کہ فرمایا: ہنسنے سے وضو لازم نہیں ہے۔ (۲)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوموسیٰ نے بھی فرمایا کہ جو نماز میں ہنسے تو نماز کو دہرائے۔ (۳)

یہ مسائل فقہ ہی تو ہیں جس کو صحابہ کرام نے بیان فرمایا ہے۔ البتہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اور حضرت جابر ﷺ سے جو اس صورت میں وضو لازم نہ ہونے کا حکم آیا ہے، تو یا تو اس سے مراد آہستہ ہنسنے کی صورت ہے یا یہ کہ یہ ان کا مسلک ہے، بعض کے نزدیک زور سے ہنسنے کی صورت میں وضو لازم ہے۔

کیا پانی نہ ملنے پر جنبی تیمّم کرے؟

جمہور صحابہ وائمہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو جنبی (جس کو نہانے کی ضرورت ہو) کو چاہیے کہ تیمّم کر کے نماز پڑھے، مگر حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں کہ جنبی تیمّم نہ کرے اگرچہ ایک ماہ تک وہ پانی نہ پائے۔ (۴)

اور یہی بات حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے بھی فرمائی کہ پانی نہ ملے تو جنبی

---

(۱) البخاري تعليقاً :۱/۲۹، دارقطني:۱/۱۷۳، فتح الباري:۱/۲۸۰

(۲) دارقطني:۱/۲۷

(۳) دارقطني:۱/۱۷۴

(۴) ابن ابی شیبہ:۱/۱۸۳

نماز ہی نہ پڑھے۔ اگر چہ ایک ماہ گذر جائے۔ (۱)

اور عجیب بات ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کے اس مسلک پر حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ نے ان سے گفتگو بھی کی اور حضرت عمار کی حدیث سے ان پر احتجاج کیا اس کا جواب حضرت عبداللہ نے دیا کہ اس حدیث کو حضرت عمر ﷺ نے قبول نہیں کیا۔ حضرت ابوموسیٰ نے پھر آیت سے استدلال کیا، تو حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ اگر ہم تیمّم کی اجازت دیدیں گے، تو جب سردی محسوس ہوگی تو لوگ تیمّم کرلیا کریں گے، اس پوری گفتگو کو امام بخاری وابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے اور ابن ابی شیبہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود ﷺ نے اس مسلک سے رجوع کرلیا تھا۔

یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ صحابہ میں مسائل فقہ پر گفتگو ہوا کرتی تھی، دلائل پیش ہوتے تھے اور اپنے اپنے تفقہ کی بنا پر ان دلائل میں غور وخوض اور سوال و جواب کی نوبت بھی آیا کرتی تھی۔

میراث کا ایک مسئلہ

صحابہ کے درمیان میراث کے ایک مسئلہ میں شدید اختلاف ومباحثہ ہوا ہے۔ وہ مسئلہ یہ کہ اگر کوئی شخص انتقال کر جائے اور اپنے پیچھے بھائی اور دادا چھوڑ جائے تو بھائیوں کو کتنا ملے گا اور دادا کا کیا حصہ ہوگا؟ حضرت ابوبکر ﷺ اور حضرت عمر ﷺ کی یہ رائے تھی، کہ دادا کو کل مال متروکہ میں سے ایک تہائی ۱/۳ دیا جائے گا اور بقیہ دو تہائی بھائیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کی آخری رائے بھی یہی تھی اور حضرت زید بن ثابت ﷺ بھی اسی کے قائل تھے۔ اور اس کے

(۱) البخاري:۱/۵۰، ابن ابی شیبہ:۱/۱۸۳

برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ دادا کو کل مال سے چھٹا حصہ دیا جائے گا اور بقیہ بھائیوں میں تقسیم ہوگا۔(۱)

اسی مسئلہ میں جو فقہی بحث ومباحثہ اور اپنی اپنی رائے پر قیاس کا سلسلہ چلا، اس کا کچھ ذکر ابن القیم رحمۃ اللہ نے کیا ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا خیال یہ تھا کہ دادا کی بہ نسبت، بھائی لوگ میراث کے زیادہ حق دار ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ بھائیوں کے مقابلہ میں دادا میراث کا زیادہ حق دار ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ کیا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر کسی درخت سے ایک شاخ نکلے اور پھر اس شاخ سے دو شاخیں پھوٹیں تو یہ شاخ دو شاخوں کی حامل ہے نہ کہ اصل درخت، اور یہ دو شاخیں آپس میں ایک دوسرے سے قریب ہیں بہ نسبت اصل کے، اسی طرح بھائی ایک دوسرے کے قریب ہیں نہ کہ دادا۔ یہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب حضرت عمر نے مشورہ لیا تو انہوں نے فرمایا کہ دادا کو سدس (چھٹا) ہونا چاہیئے۔ پھر وادی کے سیلاب سے تمثیل پیش فرمائی۔(۲)

غور کیجیے کہ یہ سب کیا فقہ ہی تو نہیں؟ جس پر تبصرے وتذکرے حضرات صحابہ کے درمیان ہورہے ہیں، یہ مثالیں محض نمونہ کے لیے پیش کی گئیں ورنہ کتب حدیث اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ایسی ہزاروں مثالیں مل جائیں گی، صرف ابن ابی شیبہ کا مصنف دیکھ جائیے۔ ہر باب ہر صفحہ پر حضرات صحابہ کے فقہی فیصلے واقوال مل جائیں گے، خود بخاری شریف میں بے شمار فقہی اقوال صحابہ کے مذکور ہیں، معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد حضرات صحابہ کے دور میں ہی پڑ چکی تھی اور متعدد صحابہ کے فقہی اقوال وفیصلے لوگوں میں معروف ومشہور ومعمول بہ تھے۔

---

(۱) ابن ابی شیبہ: ۷/ ۳۵۱-۳۵۳

(۲) إعلام الموقعين: ۱/ ۲۱۲

فروعی اختلافات اوران کی نوعیت

تمہیدی گذارش

اس دور پر فتن میں سیکڑوں انواع واقسام کے فتنے مسلم معاشرے میں پرورش پارہے ہیں اوراس کوگھن کی طرح کھاتے جارہے ہیں اوران سارے فتنوں کی جڑو اساس اگرغوروفکر سے کام لیا جائے تو اُمت کی شیرازہ بندی کو پارہ پارہ کردینے والے وہ اختلافات اورآپسی نزاعات ہیں جن کی بنیاد پر فرقہ بندیاں اور پارٹی بازیاں جنم لے رہی ہیں، حالاں کہ یہ اُمت اُمت واحدہ تھی، جوایک ٹھوس عقیدہ پر قائم کی گئی تھی اوراس کواتحاد کی ایک ایسی مضبوط لڑی میں پُرودیا گیا تھا جس نے ان کے رنگوں کے اختلاف کو؛ زبانوں کے اختلاف کو؛ مزاجوں کے اختلاف کو؛ اجتہادی رایوں اور نظریوں کے اختلاف کواور حسب ونسب کے اختلاف کو؛ ایک حسین امتزاج کے ساتھ اس طرح قبول کرلیا تھا جیسے موتیوں کی لڑی میں مختلف قسم کے موتی اپنے حُسن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوت نظّارہ دیتے ہیں۔

اگر مختلف اقسام وانواع کے موتی ، اپنی رنگتوں اورصفتوں کے اختلاف کے باوجود ایک لڑی میں جمع ہوسکتے ہیں اوراختلاف میں اتحاد کا کرشمہ دکھاسکتے ہیں اور حسن وکمال کے مناظر پیش کرسکتے ہیں تو کیا اُمتِ مسلمہ بھی ایک مضبوط عقیدہ کی لڑی میں جمع ہوکراپنے اختلافات کواتحاد کے رنگ میں پیش نہیں کرسکتی ؟ اورنظریاتی اختلافات کورنگ برنگی موتیوں یا پھولوں کی طرح تعدد وتنوع کے حسین مالوں اورگل دستوں کے روپ میں نہیں پیش کرسکتی ؟

مگر افسوس کہ آج ہم معمولی اور جزئیاتی وفروعی اختلافات کو کفر واسلام کی جنگ سمجھ بیٹھے ہیں، اور شقاق ونفاق کی ساری وہ صورتیں جو کفر کا خاصہ اور مزاج ہیں، ہم خود اپنے بھائیوں کے لیے روا اور جائز رکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات کا اقتضا ہے کہ اختلاف کی نوعیت وحیثیت کو سمجھا جائے، اسی خیال سے ذیل کا مضمون پیش کیا جارہا ہے۔

اختلاف کی دو قسمیں

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اختلاف دو قسم کا ہوتا ہے، ایک وہ اختلاف جو اسلام کے بنیادی عقائد اور مسلمہ ومنصوص مسائل میں ہو؛ اور ان میں اختلاف؛ شریعت وسنت کی شاہراہ سے ہٹا کر انسان کو بدعات وخرافات اور گمراہیوں کی طرف لے جاتا ہے، جیسے قادیانی فرقہ کا اختلاف۔ ظاہر ہے کہ اس فرقہ کا اختلاف معمولی اور جزوی وفروعی اختلاف نہیں ہے بل کہ اتنا سخت اختلاف ہے کہ اس اختلاف کی بنا پر اس کا رشتہ اسلام سے یکسر کٹ جاتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین وآخر النبیین ہیں اور آپ کے بعد نبوت کا باب کلیۃً مسدود و بند کر دیا۔ لیکن قادیانی فرقہ اس مسئلہ اور بنیادی عقیدہ کے خلاف پنجاب کے کذاب ودجال ایک جھوٹے دعوے دارِ نبوت کو نبی مانتا ہے۔ لہٰذا یہ اختلاف معمولی اختلاف نہیں۔ اسی طرح شیعہ کا اختلاف بھی بنیادی عقائد اور مسلمہ مسائل میں اختلاف ہے، اسی طرح بعض لوگوں کا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء اور اولیاء کو عالم الغیب و حاضر و ناظر اور مشکل کشا وغیرہ ماننا، اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے، اسی طرح اسلام میں نئی نئی باتوں کو پیدا کرنا اور دین کے نام پر رواج دینا اور ان بدعات وخرافات کے لیے آیات و احادیث میں بے جا تاویل؛ بل کہ تحریف سے کام لینا بھی اختلاف کی اسی قسم میں

سے ہے جو انسان کو سنت و شریعت کی شاہراہ سے ہٹا دیتا ہے، اس لیے اس قسم کا اختلاف شرعاً مذموم وممنوع ہے اور اس قسم کے اختلاف پر حدیث میں سخت وعید بھی آئی ہے۔

دوسرا اختلاف وہ ہے جو اجتہادی مسائل میں دلائل شرعیہ کی روشنی میں ہوتا ہے اور ایسا اختلاف صدرِ اول صحابہ کے زمانے سے برابر چلا آ رہا ہے، بل کہ اس قسم کا اختلاف خود دورِ رسالت میں بھی حضرات صحابہ کے درمیان ہوا ہے اور اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اختلاف کی دونوں جہتوں کی تصویب فرمائی ہے (اس کی تفصیل آگے آئے گی) کیوں کہ خود دلائل میں دونوں جہتوں اور شقوں کی گنجائش ہوتی ہے ایک بات منصوص اور فیصل نہیں ہوتی، ایسے اختلاف کو اجتہادی وفروعی اختلاف کہا جاتا ہے یہ اختلاف نہ مذموم ہے نہ ممنوع ہے؛ بل کہ یہ فطری وطبعی ہونے کے ساتھ باعث رحمت بھی ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

فروعی اختلاف مذموم نہیں

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان دونوں قسم کے اختلاف کا حکم و درجہ یکساں نہیں ہے بل کہ دونوں کے درجہ میں ایسا ہی فرق ہے جیسے زمین و آسمان میں اور حق و باطل میں اور حرام و حلال میں ہے۔ مگر بعض لوگ اس فرق کو نظر انداز کر کے دونوں اختلافات کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں اور دونوں کو مذموم وحرام قرار دیتے ہیں اور ان آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اختلاف کی قسم اول کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ان آیات واحادیث سے صرف اس اختلاف کی مذمت و برائی ثابت ہوتی ہے جو بغیر دلیل شرعی نفسانیت وشرارت سے کیا جائے اور بنیادی ومسلمہ عقائد و مسائل میں ہو لیکن دوسری قسم کا اختلاف جو دلائل

کی روشنی میں کیا جائے۔اوراجتہادی وفروعی مسائل میں ہوان سے اس کا مذموم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔مثال کے طور پر قرآن میں متعدد جگہ فرمایا کہ "آپس میں اختلاف نہ کرو"۔

(آل عمران :۱۰۳)

ایک جگہ فرمایا کہ" تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جنہوں نے اختلاف کیا اور متفرق ہوگئے (آل عمران :۱۰۵)

ان آیات میں جس اختلاف سے ممانعت کی گئی ہے وہ وہ اختلاف ہے جو کفار کی طرح عقائد و مسلمات میں کیا جائے جس سے انسان اسلام سے خارج ہو جاتا یا کم ازکم سنت کی شاہراہ سے ہٹ کر بدعت کی گمراہی میں ملوث ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیات میں سے آل عمران کی آیت ۱۰۳ کی تفسیر میں مشہور اہل حدیث عالم مولانا جونا گڑھی کے ترجمہ قرآن پر حواشی میں مولانا صلاح الدین یوسف صاحب لکھتے ہیں:

"وَلَا تَفَرَّقُوا" اور پھوٹ نہ ڈالو" کے ذریعہ فرقہ بندی سے روک دیا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مذکورہ دو اصولوں (تقویٰ اور اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنا) سے انحراف کروگے تو تمہارے درمیان پھوٹ پڑ جائے گی اور تم الگ الگ فرقوں میں بٹ جاؤ گے، چنانچہ فرقہ بندی کی تاریخ دیکھ لیجئے، یہی چیز نمایاں ہوکر سامنے آئیگی قرآن وحدیث کے فہم اوراسکی توضیح وتعبیر میں کچھ باہم اختلاف یہ فرقہ بندی کا سبب نہیں ہے، یہ اختلاف تو صحابہ وتابعین کے عہد میں بھی تھا لیکن مسلمان فرقوں اور گرہوں میں تقسیم نہیں ہوئے۔"

مذکورہ تشریح سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے؛ بل کہ

قرآن وحدیث کے فہم اور تشریح وتوضیح اور تفسیر وتعبیر میں صحابہ میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ اور ایسا اختلاف گروہ بندی وفرقہ بندی کا سبب بھی نہیں جس سے قرآن نے روکا ہے۔ ہاں جنھوں نے ان اختلافات فرعیہ کی بنیاد پر فرقہ بندیاں کیں ہیں وہ ضرور ماٗخوذ ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ اجتہادی مسائل کا اختلاف ان آیات میں مراد نہیں ہے؛ بل کہ ان سے مراد پہلی قسم کا اختلاف ہے۔

اسی طرح حدیث میں جس اختلاف وافتراق سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد بھی یہی پہلی قسم کا اختلاف ہے۔حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''بنی اسرائیل بہتر ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور میری اُمت تہتر ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی اور یہ سارے فرقے دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ وہ ایک فرقہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جو اس طریقہ پر قائم ہو جس پر میں اور میرے صحابہ قائم ہیں۔'' (۱)

اس حدیث میں جو اُمت کے اختلاف وافتراق کا ذکر کر کے سارے فرقوں کو جہنمی اور صرف ایک فرقہ کو جنتی قرار دیا گیا ہے، اس سے بھی یہ مسائل کا اختلاف مراد نہیں ہے، بل کہ عقائد واصول میں اختلاف مراد ہے، بعض لوگ اس حدیث کو پیش کر کے ان فرقوں سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مکاتب فکر مراد لیتے اور ان مکاتب فکر کے لوگوں کو نعوذ باللہ جہنمی قرار دیتے ہیں؛ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اس حدیث

---

(۱) ترمذی: ۲/۹۲ مشکوۃ: ۳۰

سے یہ اختلاف ہرگز مراد نہیں، چناں چہ اہل حدیث کے مشہور عالم علامہ عبید اللہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح میں مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

''حدیث میں افتراق سے مراد مطلق افتراق نہیں ہے کہ اس میں وہ اختلاف بھی داخل ہو جائے جو فروعی مسائل میں خلفاء راشدین پھر دیگر صحابہ پھر تابعین پھر ائمہ مجتہدین کے زمانہ میں واقع ہوا بل کہ مراد اس سے ایک خاص اختلاف وافتراق ہے، اور وہ اختلاف وتفرق ہے جس سے پارٹیاں اور جماعتیں بن گئیں اور بعض نے بعض سے جدائی اختیار کی جو آپسی محبت والفت اور تعاون وتناصر پر قائم نہیں ہیں، بل کہ اس کی ضد یعنی ہجر، قطع تعلق عداوت اور بغض اور ایک دوسرے کی تضلیل و تکفیر وتفسیق پر قائم ہیں (پھر فرمایا کہ) کہا گیا ہے کہ اس اختلاف سے مراد اصول اور عقائد میں بدعتیں پیدا کرنا ہے۔ نہ کہ فروعات اور عملیات میں الخ۔''(۱)

علامہ عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے واضح ہوا کہ اس حدیث میں وہ اختلاف مراد نہیں ہے جو فروعی واجتہادی مسائل میں صحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین جیسے امام شافعی وامام مالک وامام ابوحنیفہ وامام احمد وامام اوزاعی وامام سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ کے زمانوں میں واقع ہوا۔

الغرض! آیات واحادیث میں جس اختلاف کی مذمت وبرائی آئی ہے، اس سے پہلی قسم کا اختلاف مراد ہے یا اس سے مراد گروہ بندی و پارٹی بازی ہے۔ جس کی

(۱) مرعاۃ المفاتیح: ۱/۱۷۰-۱۷۱

بناپرایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق وتضلیل کی جائے، اوران جزوی مسائل کی بناپر حسد وبغض رکھا جائے، یہ بلا شبہ سخت قبیح چیز ہے رہا فروعی مسائل میں آراء کا اختلاف جو قرآن وحدیث کے فہم اوران کی تعبیر وتشریح میں تفاوت کی بناپر واقع ہوا وہ نہ قرآن وحدیث میں مذموم ٹھہرایا گیا نہ ممنوع قرار دیا گیا۔

صحابہ میں اختلافِ مسائل کی مثالیں

بل کہ ایسا اختلاف تو صحابہ کے درمیان بھی پیش آیا، اور جناب رسالت مآب صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس اختلاف آراء کو مذموم نہیں ٹھہرایا؛ بل کہ دونوں جہتوں کی تحسین وتصویب فرمائی یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دواشخاص نے تیمّم کرکے نماز پڑھ لی پھران کو پانی مل گیا، جب کہ ابھی اس نماز کا وقت باقی تھا، توایک صاحب نے پانی سے وضو کرکے وہ نماز دہرائی اور دوسرے صاحب نے نماز نہیں دہرائی پھر (جب اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو) آپ سے اس واقعہ کے متعلق سوال کیا تو آپ نے نماز نہ دہرانے والے صحابی سے فرمایا کہ تم نے سنت کے موافق کیا اور دوسرے صحابی سے فرمایا کہ تم کو پورا ثواب (دونوں نمازوں کا) ملا۔(۱)

اس حدیث میں غور فرمایئے کہ نماز کے وقت پانی نہ ملا تو دوصحابہ نے حسبِ حکم شرع تیمّم کرکے نماز پڑھ لی، نماز کے بعد وقت کے اندر اندران حضرات کو پانی مل گیا تو ان میں اختلاف ہوگیا، ایک صحابی نے سمجھا کہ چوں کہ وقت کے اندر پانی مل گیا ہے، لہٰذا تیمّم سے ادا کی ہوئی نماز باطل ہوگئی، دوبارہ پڑھنا چاہیئے دوسرے صحابی نے سمجھا کہ جب نماز پڑھ چکے تو اب پانی ملنے سے اس پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔ لہٰذا انہوں

---

(۱) نسائی :۱/۷۵

نے نہیں دہرائی اس اختلاف رائے کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برا نہیں سمجھا؛ بل کہ دونوں کی تصویب کی، البتہ ایک کے اجتہاد کو موافق سنت قرار دیا اور دوسرے کو برا نہیں کہا؛ بل کہ فرمایا کہ دونوں نمازوں کا ثواب تم کو مل گیا۔

(۲) امام بخاری رحمۃ اللہ نے اپنی سند سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے دن صحابہ سے فرمایا کہ عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچنے سے پہلے کوئی نہ پڑھے اور بعض صحابہ کو راستہ میں ہی عصر کا وقت آ گیا، تو بعض صحابہ نے کہا کہ ہم نماز نہیں پڑھیں گے جب تک کہ اس جگہ (بنی قریظہ) نہ پہنچ جائیں اور بعض نے کہا کہ ہم تو نماز (راستہ میں ہی) پڑھیں گے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ نہیں تھا (کہ نماز کا وقت ہو جائے تو بھی راستہ میں نماز نہ پڑھو، بل کہ آپ کا منشا یہ تھا کہ عصر کا وقت ہونے سے پہلے اس جگہ پہنچنے کے لیے جلدی کریں) پھر یہ اختلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا مگر آپ نے کسی کو بھی برا نہیں فرمایا۔(۱)

اور مسلم میں اس واقعہ میں عصر کے بجائے ظہر کا ذکر ہے۔(۲)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور علما نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اجتہاد کرنے والے کو (کسی بھی صورت میں) گناہ نہیں، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی دونوں جماعتوں میں سے کسی پر بھی زجر و توبیخ نہیں فرمائی۔ اگر یہاں کوئی گناہ کی بات ہوتی تو گنہ گار پر عتاب فرماتے۔(۳)

---

(۱) البخاری:۲/۵۹۱

(۲) مسلم:۷/۳۳۱

(۳) فتح الباری:۷/۴۱۰

معلوم ہوا کہ اجتہادی فروعی مسائل میں اختلاف کوئی مذموم چیز نہیں ؛ بل کہ شرعاً اس کی پوری طرح گنجائش ہے۔

نیز بڑے بڑے صحابہ میں متعدد مسائل میں اختلاف رہا ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ ﷺ کا مسلک یہ تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے' اور وہ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بھی بیان فرماتے ہیں' مگر جمہورِ صحابہ وتابعین اس کے قائل نہیں تھے۔ امام ترمذی حضرت ابوہریرہ ﷺ سے اس سلسلہ کی حدیث نقل کرکے فرماتے ہیں:

بعض اہل علم آگ سے پکی ہوئی چیز سے وضو (واجب ہونے) کے قائل ہیں ؛ مگر اکثر اہل علم صحابہ وتابعین میں سے اس کے ترک پر ہیں یعنی آگ سے پکی ہوئی چیز سے وضو کے قائل نہیں۔ (۱)

اونٹ کا گوشت کھانے سے و' حضرت ابوموسیٰ اشعری' حضرت جابر بن سمرۃ ﷺ وضوٹوٹ جانے کے قائل تھے جب کہ دوسرے صحابہ جیسے حضرت عمرؓ' حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت علیؓ' حضرت سُوید بن غفلۃ ﷺ اس کے خلاف وضو نہ ٹوٹنے کے قائل تھے۔ (۲)

حضرت عمر ﷺ بغلوں کے بال کی صفائی کے بعد وضو کو ضروری قرار دیتے تھے اور ابن عباس ﷺ اس کے قائل نہ تھے اور عبداللہ بن عمر ﷺ بغل کے بالوں کی صفائی کے بعد غسل کیا کرتے تھے۔ (۳)

---

(۱) ترمذی:۱/۲۴

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ:۱/۶۳-۶۴

(۳) ابن شیبہ:۱/۷۰

گویا صحابہ میں اس مسئلہ میں تین مسلک تھے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن کے پیش کرنے سے مقصود صرف نمونہ دکھانا ہے۔ استقصا و احاطہ پیش نظر نہیں ہے۔ کتب حدیث کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ صحابہ میں سینکڑوں مسائل میں اختلاف رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایسا اختلاف جو فروعی مسائل میں ہوتا ہے، قابل ملامت و مذمت نہیں؛ بل کہ مستحسن ہے۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبھی اس کو روا نہ رکھتے۔

اختلاف کیوں اور کیسے پیدا ہوا؟

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین یا بعد کے ائمہ میں جو مختلف فروعی مسائل میں اختلاف پیدا ہوا؛ اس کی وجہ و بنیاد نعوذ باللہ یہ نہیں کہ ان میں ایک قرآن وحدیث کو مانتا تھا اور دوسرا قرآن وحدیث کو نہیں مانتا تھا اور محض نفسانیت وشرارت اور اپنی عقل وفہم کی بنا پر مسائل بیان کرتا تھا؛ ایسا سمجھنا انتہائی غلط اور صحابہ وائمہ دین سے سوءِ ظنی و بدگمانی کی بدترین قسم ہے؛ بل کہ اس اختلاف کی وجہ و بنیاد ایک دوسری ہی بات ہے، اور وہ یہ کہ بعض آیات اور احادیث میں مراد و مطلب صریح و واضح نہیں ہوتا؛ بل کہ اس میں متعدد احتمالات کی گنجائش ہوتی ہے، اور ایک شخص اس کے ایک معنی لے لیتا ہے اور دوسرا دوسرے معنی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آیات واحادیث میں بہ ظاہر تعارض وٹکراؤ معلوم ہوتا ہے، اور یہ واضح ومسلم ہے کہ اللہ ورسول کے کلام میں تعارض نہیں ہو سکتا، لہٰذا علما وائمہ اس تعارض کو دور کرنے کے لیے کبھی تطبیق سے اور کبھی ترجیح سے کام لیتے ہیں۔ اب علما میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے، کوئی تطبیق کی راہ اختیار کرتا ہے اور کوئی ترجیح پر چلتا ہے۔ پھر تطبیق کی بھی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں کوئی کسی صورت کو اختیار کرتا ہے، کوئی دوسری صورت کو لیتا

ہے۔ نیز کبھی اختلاف اس لیے پیدا ہو جاتا ہے کہ احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے میں محدثین میں اختلاف ہوتا ہے کیوں کہ حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینا بھی ایک اجتہادی کام ہے۔ لہٰذا ایک محدث ایک حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے، مگر دوسرے محدث کے پاس وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے پھر اسی پر علما و ائمہ میں مسائل میں اختلاف ہو جاتا ہے، ایک فقیہ اس حدیث کو صحیح قرار دے کر لے لیتا ہے اور عمل کرتا ہے اور دوسرا فقیہ اس پر عمل نہیں کرتا اور اس کو ضعیف قرار دیتا ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک وہ ضعیف ہوتی ہے اس طرح ائمہ؛ بل کہ صحابہ میں اختلاف رونما ہوا اور اس کو شرعاً گوارا کیا گیا، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔

اختلافِ ائمہ کی پہلی وجہ

اب میں اوپر کے اجمال کی مختصر سی تفصیل و تشریح بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، تا کہ بات واضح ہو جائے اور لوگوں کے دلوں سے خلش و پریشانی دور ہو جائے، کیوں کہ آج ایک طبقہ اُمت میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو ائمہ کے ان اختلافات کو اس طرح پیش کرتا ہے گویا کہ ان ائمہ نے قرآن و حدیث کو یک لخت چھوڑ دیا اور محض نفسانیت و شرارت سے من مانی باتیں بیان کر دیں اور ان ائمہ کے ماننے والے بھی نہ قرآن کو مانتے ہیں نہ حدیث کو مانتے ہیں؛ بل کہ قرآن و حدیث کے خلاف ان ائمہ کی بات کو مان کر گویا کفر و شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فکر اور سوچنے کا انداز غیر محققانہ، نہایت درجہ سطحی اور حق سے یکسر بعید ہے۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اختلاف کیوں کر پیدا ہوا؟ کیا اس کا منشاء نفسانیت اور قرآن و حدیث کی مخالفت تھی یا کچھ اور؟

اوپر میں نے پہلی وجہِ اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ بعض آیات و

احادیث کے معانی ومرادات واضح وصریح نہیں ہوتے؛ بل کہ مختلف احتمالات کی ان میں گنجائش ہوتی ہے اس لیے ائمہ وصحابہ میں اختلاف ہوجاتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ ”تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ“ یعنی تو مجھ پر حرام ہے، اس کے کہنے سے بیوی پر طلاق تو نہیں پڑتی، مگر یہ ایک درجہ میں قسم کی طرح ہے، قرآن کریم نے اس کے بارے میں فرمایا کہ ایسے شخص پر ایک غلام آزاد کرنا ضروری ہے (فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ) (المجادلۃ: ۳) اتنی بات تو قرآن کریم میں صاف ہے، لہٰذا اس میں کسی کا اختلاف نہیں، لیکن قرآن کریم میں یہ بات نہیں بتائی گئی کہ یہ غلام جس کو آزاد کیا جانا ہے، اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے یا کسی کافر غلام کو بھی آزاد کردینے سے یہ کفارہ ادا ہوجاتا ہے؟ لہٰذا اس میں علما نے اختلاف کیا ہے، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غلام مسلمان ہونا چاہیے کیوں کہ قرآن نے قتل خطا کے کفارہ میں غلام کے آزاد کرنے کا حکم دیتے ہوئے مؤمن ہونے کی بھی قید لگائی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی وہی حکم ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفارۂ ظہار میں مؤمن غلام کی قید نہیں ہے لہٰذا کافر ہو یا مؤمن کسی بھی غلام کا آزاد کردینا کافی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اختلاف قرآن کی ایک آیت میں مراد کی صراحت نہ ہونے کی وجہ سے ہوا، اور ہر امام نے اپنا نظریہ اس گنجائش سے اخذ کیا جو آیت کے الفاظ میں رکھی ہوئی ہے۔ یہاں نہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو آیت کا مخالف کہا جائے گا نہ امام شافعی رحمہ اللہ کو، بل کہ دونوں حضرات نے قرآن کریم ہی کو اپنا رہبر و قائد بنا کر اجتہادی عمل سے مراد خداوندی کو اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب ایک مثال حدیث پاک سے بھی سن لیجیے۔ ”مسلم شریف میں حدیث آئی

ہے کہ احرام والا، نکاح نہ کرے۔ (۱)

اس سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ احرام میں نکاح کرنا جائز نہیں، چناں چہ امام شافعی رحمۃ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ مگر اس حدیث میں جو لفظ نکاح آیا ہے لغت کے اعتبار سے اس کا معنیٰ جماع ہے۔ لہٰذا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حالتِ احرام میں جماع سے منع کیا گیا ہے، عقدِ نکاح سے نہیں اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالتِ احرام میں نکاح فرمایا۔ (۲)

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جس کام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، آپ خود وہ کام کیسے کر سکتے ہیں؟ لا محالہ پہلی حدیث میں نکاح سے مراد جماع ہے جو کہ اس کا لغوی معنیٰ ہے۔

اب غور کیجیے کہ اس اختلاف میں بھی نہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے حدیث کو چھوڑا، نہ امام شافعی رحمۃ اللہ نے حدیث کو ترک کیا، بل کہ دونوں نے اپنے اجتہاد سے اس کا ایک ایک محمل و معنیٰ لے لیا اور اس کی پوری گنجائش لفظ حدیث میں پائی جاتی ہے۔

اختلاف کی دوسری وجہ

اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی آیت و حدیث میں یا متعدد آیات میں یا متعدد احادیث میں بظاہر اختلاف و تعارض نظر آتا ہے۔ اور یہ واضح و مسلم ہے کہ اللہ و رسول کے کلام میں فی الواقع کوئی تعارض نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ائمہ و علما دفع تعارض کی

(۱) مسلم: ۱/۴۵۳

(۲) اس کو ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے۔ البخاري: ۱/ ۲۴۸، مسلم: ۱/۴۵۴، الترمذي: ۱/۱۷۲، ابو داود: ۱/۲۵۵، النسائي: ۲/۲۶، ابن ماجه: ۱۴۱

مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں جس سے علما کی آراء میں اختلاف ہو جاتا ہے۔
مثلاً قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾

(اور جب قرآن پڑھا جائے تو تم اس کو سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے) (الاعراف: ۲۰۴)

اس آیت کے بارے میں اکثر علما فرماتے ہیں کہ یہ نماز و خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب نماز میں یا خطبہ میں قرآن پڑھا جائے تو خاموش ہو کر سننا چاہیئے، صحابہ میں سے ابن مسعود، ابن عباس، ابوہریرہ، عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔(۱)
اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ سے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔(۲)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نماز میں قرآن پڑھا جائے تو سب کو خاموش رہ کر سننا چاہیئے۔ مگر ایک حدیث صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے:

« لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ »

(جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی۔) (۳)

اس حدیث سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، بغیر اس کے نماز نہیں ہوتی، خود نماز پڑھنے والا امام ہو یا مقتدی ہو یا منفرد ہو، اگر

(۱) ابن کثیر: ۲/ ۲۸۰-۲۸۱
(۲) فتاوی ابن تیمیہ:۲۲/۲۹۵
(۳) البخاري:۱/ ۱۰۴، مسلم:۱/ ۱۶۹، الترمذي:۱/ ۵۷، ابو داود:۱/ ۱۱۸، النسائي: ۱/ ۱۴۵، ابن ماجہ: ۶۰

حدیث کے اس ظاہری مفہوم پر عمل کریں گے تو قرآن کے خلاف کرنا لازم آئے گا اس لیے کہ قرآن کی آیت نماز میں قرآن پڑھے جانے کے وقت میں خاموش رہ کر سننے کی تاکید کرتی ہے، اگر مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے گا، تو اس آیت کی خلاف ورزی ہوگی۔

اب علماء وائمہ کرام نے اس تعارض کو دور کرنے کے لیے مختلف صورتیں اختیار فرمائی ہیں، بعض ائمہ نے فرمایا کہ آیت میں قرآن سے مراد سورۂ فاتحہ سے زائد کچھ پڑھنا ہے۔ لہٰذا مقتدی سورۂ فاتحہ تو پڑھ سکتا ہے؛ بل کہ حدیث کی وجہ سے ضرور پڑھنا چاہیے۔ مگر سورۂ فاتحہ سے زائد کوئی اور آیت وسورۃ نہیں پڑھ سکتا۔ یہی امام شافعی کا مسلک ہے، اور بعض ائمہ نے فرمایا کہ مذکورہ حدیث میں نماز سے مراد امام ومنفرد کی نماز ہے، مقتدی کی نماز نہیں، کیوں کہ قرآن نے مطلقاً اس بات کا حکم کردیا ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو خاموش رہو اور سنو۔ لہٰذا سورۂ فاتحہ پڑھا جائے یا اور کوئی سورۃ پڑھی جائے، بہ ہر صورت مقتدی کو پڑھنا نہ چاہیئے اور حدیث کا تعلق مقتدی سے نہیں ہے کیوں کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جس کا امام ہو، پس امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے۔ (۱)

نیز ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بغیر سورۂ فاتحہ نماز نہیں ہوتی مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو تو ہو جاتی ہے۔ (۲)

اب غور کیجیے! کہ آیت وحدیث کے ظاہری تعارض کو دور کرنے کے لیے بعض ائمہ نے قرآن کی آیت سے سورۂ فاتحہ کا استثناء کیا اور آیت میں تاویل کی اور بعض

---

(۱) ابن ماجہ:۶۱، موطامحمد:۹۷، الطحاوی:۱/۱۲۸، دارقطنی :۱ ۳۲۳،
ابن ابی شیبہ:۱/۴۱۴ وغیرہ

(۲) الترمذي: حديث حسن صحيح:۱/۷۱

ائمہ نے اس کے برخلاف حدیث کو امام ومنفرد کے ساتھ خاص کر کے آیت کو اپنے ظاہر پر رکھا، نہ پہلے طبقہ نے قرآن وحدیث کے خلاف کیا نہ دوسرے طبقہ نے؛ بل کہ دونوں مکاتب فکر کے ائمہ نے قرآن وحدیث ہی پر عمل کی راہ نکالی، لہٰذا جو لوگ امام کے پیچھے مقتدی کو پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں وہ بھی اپنے اجتہاد کی رو سے حق پر ہیں اور جو لوگ اس سے منع کرتے ہیں وہ بھی حق پر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بخاری ومسلم کی حدیث دکھا دکھا کر حنفیہ کی نماز کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی نماز نہیں ہوئی اور یہ کہ یہ لوگ بخاری کی حدیث کو نہیں مانتے، یہ انتہائی غلط وباطل بات کہتے ہیں؛ کیوں کہ حنفی بھی اس حدیث کو مانتے ہیں، ہاں یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امام ومنفرد کی نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی جیسے دوسرے لوگ قرآن کی آیت میں تخصیص کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیت میں قرآن سے مراد، سورۂ فاتحہ کے بعد کچھ اور پڑھنا ہے تو کیا کوئی ان لوگوں کو قرآن کا مخالف کہہ سکتا ہے؟ جب آیت میں تاویل کرنا، قرآن کی خلاف ورزی نہیں تو آیت پر عمل کے لیے حدیث میں حدیث ہی کی روشنی میں تاویل کرنا، حدیث کی خلاف ورزی کیوں کر ہوگئی؟

اختلاف کی تیسری وجہ

ائمہ میں اختلاف اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ ایک امام نے ایک حدیث کو صحیح و معتبر سمجھا اور دوسرے امام نے اس حدیث کو ضعیف سمجھا اور دوسری حدیث سے دوسری بات اخذ کی، کیوں کہ حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینا بھی ایک اجتہادی عمل ہے جس میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے اور ہوا ہے، بہت سی حدیثیں امام بخاری کے نزدیک ضعیف ہیں؛ مگر امام مسلم ان کو معتبر قرار دیتے ہیں، مثال کے طور پر نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟ سینہ پر یا ناف کے اوپر یا ناف کے نیچے، اس سلسلہ میں جو روایات

آئی ہیں ان میں ،کوئی روایت بھی ایسی نہیں جو بے غبار ہو۔مثلاً سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت حضرت وائل بن حجر ﷺ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی ،آپ نے بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ سینہ پر رکھا۔(۱)

مگر یہ روایت ضعیف ہے؛ کیوں کہ اس کا ایک راوی مؤمّل بن اسماعیل کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے ۔لہٰذا احناف اس پر عمل نہیں کرتے اور اس کے مقابلے میں حضرت علی کی ایک حدیث ابو داؤد کے بعض نسخوں میں ثابت ہے کہ حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ پر ہاتھ رکھا جائے ۔(۲)

اس روایت کے ایک راوی عبدالرحمان بن اسحاق واسطی کو بھی اکثر محدثین ضعیف قرار دیتے ہیں ؛مگر امام ترمذی نے ان کی ایک حدیث کو حسن قرار دیا اور امام حاکم نے ان کی ایک حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔(۳)

لہٰذا احناف اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

یہاں وہی بات ہے کہ اختلاف اس لیے پیدا ہوا کہ روایات کے صحیح وضعیف ہونے میں اختلاف ہے،لہٰذا جس کو جو اقرب الی الصحت نظر آئے ،اس پر عمل کرے نہ الزام نہ اعتراض ،اس کے برخلاف جو لوگ اپنی ہی بات کو صحیح اور دوسروں کو غلط ٹھہراتے ہیں ؛وہ یقیناً جادۂ اعتدال سے دور ہیں۔

اوپر پیش کردہ تفصیلات سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ گئی؛ کہ فروعی وجزوی

---

(۱) صحیح ابن خزیمہ:۱/۲۴۳

(۲) ابن ابی شیبہ:۱/۳۹۱،دار قطني۱/۲۸۶

(۳) القول المسدد:۳۵

مسائل میں علما وائمہ کا اختلاف ایک فطری اختلاف ہے، جس کی بنیاد نہ نفسانیت ہے نہ جہالت؛ بل کہ اس کی مختلف دیگر ایسی بنیادیں اور وجوہات ہیں، جو ایسے اختلاف کے لیے شرعی جواز فراہم کرتی ہیں۔ جیسا کہ اوپر حوالے نقل کیے جا چکے ہیں، ہاں یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اختلاف کی جو تین وجوہات بیان کی گئیں، یہ بہ طور تمثیل بیان کی گئی ہیں ورنہ اختلاف کی اور بھی وجوہات ہیں مگر یہاں سب کا احاطہ مقصود نہیں ہے؛ بل کہ صرف یہ بتانے کے لیے کہ اختلاف کیوں پیدا ہوا، یہ چند امور بیان کیے گئے ہیں۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی بھی امام و مجتہد قرآن وحدیث کا مخالف نہیں ہوا؛ بل کہ سب ائمہ و علماء نے قرآن وحدیث کے منشاء ہی کی تلاش و جستجو کو اپنا مطمح نظر اور مقصدِ زندگی بنا کر اجتہادی قوت و نورِ بصیرت کا استعمال فرمایا ہے۔

تین وضاحتیں

ان تفصیلات سے تین باتیں واضح ہو گئیں (۱) ایک تو یہ کہ اجتہادی فروعی مسائل میں اختلاف آج کی کوئی نئی ایجاد نہیں ہے؛ بل کہ یہ اختلاف زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے اور حضرات صحابہ و تابعین کے مقدس دور میں بھی ہوا اور رہا ہے، اور وہی اختلاف پھر بعد کے دوروں اور زمانوں میں منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا ہے۔ (۲) دوسری یہ کہ اس اختلاف کی بنیاد؛ نفسانیت و قرآن وحدیث کی مخالفت نہیں؛ بل کہ قرآن وحدیث ہی کے منشاء و مراد کو پانے کی خاطر بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے بالکل فطری و طبعی طور پر واقع ہوا ہے، تمام ائمہ و علما کی یہ اجتہادی خدمات، اخلاص و نیک نیتی، اور اہل دین سے؛ خیر خواہی و ہمدردی کی بنیاد پر واقع ہوئی ہیں،

جس پر ان سب کو ہر صورت میں اجر یقینی ہے۔(۳) اور تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس قسم کے اختلاف کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے اور اس پر کوئی ملامت و مذمت نہیں کی گئی ہے اور جس اختلاف و افتراق کی مذمت و برائی قرآن و حدیث میں آئی ہے؛ اس سے مراد اعتقادیات اور دین کے بنیادی مسائل میں اختلاف ہے یا وہ اختلاف جو نصوص کے خلاف نفسانیت و شرارت سے کیا جائے۔

اختلاف میں اتفاق کا مظاہرہ

ان ساری گذارشات کا منشاء یہ ہے کہ ان فروعی اختلافات کو بالکل اہمیت نہ دینا چاہئے اور اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے عداوت و دشمنی یا ایک دوسرے پر ملامت و مذمت کا رویہ اختیار نہ کرنا چاہیئے ؛ بل کہ تمام ائمہ و علما کا احترام اور عظمت کرنا چاہیئے ، اور ان سے محبت و الفت کا طریق اپنانا چاہیے، چناں چہ سلفِ صالحین کے یہاں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔

حضرت امام قدوری حنفی رحمۃ اللہ ، فقہ حنفی کے مایۂ ناز عالم و فقیہ تھے ، جن کی ”مختصر القدوری“ نامی کتاب ، فقہ حنفیہ کا مستند متن مانی جاتی ہے، انہی کے زمانہ میں امام ابو حامد اسفرائنی رحمۃ اللہ ، فقہ شافعی کے مشہور شارح تھے اور دونوں حضرات کے مابین بہت سارے مسائل میں اختلاف و مناظرہ رہتا تھا، مگر اس کے باوجود ابن خلکان نے لکھا ہے کہ امام قدوری، امام اسفرائنی کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔(۱)

اسی طرح فقیہ عماد الدین شافعی اور قاضی ابو طالب حنفی کے درمیان بہت سے اختلافات تھے۔ جب عماد الدین شافعی کا انتقال ہوا تو قاضی ابو طالب حنفی نے ان کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر بڑے حسرت آمیز لہجہ میں یہ شعر پڑھا:

---

(۱) ابن خلکان:۱/۲۰

عقم النِّساء فلاتلدن شبيهه ان النِّسـاء بمثلـه عقـم

(ترجمہ:عورتیں بانجھ ہوگئیں، پس ان (عماد الدین) جیسا وہ نہ جن سکیں گی کیوں کہ عورتیں ان جیسے کے جننے سے بانجھ ہیں۔)

غور کیجئے کہ ایک طرف ان سے مسائل میں اختلاف بھی ہے اور دوسری طرف ان کی عظمت شان کا برملا اعتراف بھی ہے اور ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جس کسی سے کسی سلسلہ میں چھوٹا یا بڑا اختلاف ہوا تو اس کی کسی خوبی وکمال کا اعتراف تو کیا کرتے؛ بل کہ اور اس کی ہجو اور مذمت کے درپے ہو جاتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ دونوں جلیل القدر فقیہ و مجتہد ہونے کے باوجود بے شمار مسائل میں اختلاف رکھتے تھے، امام ذہبی رحمۃ اللہ نے اشہب بن عبدالعزیز سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ کو امام مالک کے سامنے اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھا جیسے بچہ باپ کے سامنے بیٹھتا ہے، امام ذہبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ امام ابوحنیفہ کے حسن ادب اور ان کی تواضع پر دلالت کرتا ہے؛ حالاں کہ وہ امام مالک سے تیرہ برس عمر میں بڑے تھے۔(۱)

اگرچہ اہل سیر وتاریخ کو اس واقعہ کی صحت میں اشکال ہے کیوں کہ اس کے راوی اشہب، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے، تو ان کی یہ روایت مخدوش معلوم ہوتی ہے، تاہم اس کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے ائمہ سلف کا ادب اور آپسی تعلقات کی خوش گواری کا علم ہوتا ہے، ایک طرف امام ابوحنیفہ کا امام مالک کے ساتھ یہ ادب وتعظیم کا برتاؤ تھا اور دوسری طرف امام مالک رحمۃ اللہ امام ابوحنیفہ کی مدح وتعریف اور ان کی عقل وفہم اور دور بینی و دور اندیشی کی توثیق و

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ:۱/۲۰۹

تصدیق فرماتے تھے۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے امام ابوحنیفہ کو دیکھا ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں میں نے ایسے شخص کو دیکھا کہ اگر وہ اس ستون کے بارے میں تجھ سے گفتگو کرے کہ وہ اس ستون کو سونے کا ثابت کرے گا تو ضرور اس پر دلیل قائم کردیگا۔ (۱)

پھر ان بزرگوں سے بھی اوپر حضرات صحابہ کو دیکھئے، وہاں بھی اختلاف کے باوجود؛ محبت وعظمت کا یہی نقشہ نظر آئے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

مثالیں تو ہزاروں دی جاسکتی ہیں، مگر انصاف پسند کے لیے ایک بھی کافی ہے، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں صحابی ہیں، اور ایک مسئلہ میں نظریاتی اختلاف نے ان دونوں کو جنگ وحرب پر بھی آمادہ کردیا، چناں چہ جنگ بھی ہوئی اور بہت سے مسلمان اس جنگ میں کام آئے؛ مگر اتنے شدید اختلاف کے باوجود، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت امیر معاویہ نے قسم کھا کر فرمایا:

> علی مجھ سے بہتر اور افضل ہیں اور میرا اختلاف ان سے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے مسئلہ میں ہے، اگر وہ خون عثمان کا قصاص (بدلہ) لے لیں ؛تو اہل شام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا۔ (۲)

نیز روایت ہے کہ جب ان حضرات کے درمیان جنگ کا میدان گرم تھا، روم کے عیسائی بادشاہ کی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام خط آیا جس میں عیسائی

---

(۱) مقدمۂ اعلاء السنن:۱/۲۰۰

(۲) البدایہ:۲/۲۵۹

بادشاہ نے لکھا تھا کہ معلوم ہوا کہ تم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے پریشانی ہے، میں تمہاری مدد کے لیے فوج بھیج دوں؟

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں لکھا:

"اے نصرانی کتے! میرے اور علی کے درمیان جو اختلاف ہے؛ تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یادرکھ کہ اگر تو نے حضرت علی کی طرف ترچھی نگاہ بھی اٹھائی؛ تو سب سے پہلے علی کے لشکر کا سپاہی بن کر تیری آنکھیں پھوڑنے والا، معاویہ ہوگا۔"(۱)

آمدم برسر مطلب

غور کیجیے کیا ہم لوگ بھی اختلاف کے باوجود عظمت و محبت کا یہی نقشہ پیش کرتے ہیں؟ افسوس کہ آج ہم اپنے ان جزوی اختلافات میں الجھ کر اپنی بڑی بڑی اور اہم ذمہ داریوں سے غافل ہو چکے ہیں اور یہ تک نہیں سوچتے کہ اس سے غیر اقوام فائدہ اٹھائیں گی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ اختلاف نہ نیا ہے نہ بُرا، البتہ ہمارا ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنا، ایک دوسرے کی توہین کرنا اور دوسروں کو الزام و بہتان لگا کر بدنام کرنا، ضرور بالضرور بُرا ہے اور اسی سے ہم کو منع کیا گیا، جیسے بعض لوگ حنفی لوگوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور ان کی نماز کو باطل کہتے ہیں، امام ابو حنیفہ کی توہین کرتے ہیں اور فقہ حنفی کے خلاف کتابیں و رسائل چھاپ چھاپ کر تقسیم کرتے ہیں اور اپنی رائے سے حدیث کا مفہوم گھڑ کر ائمہ کو حدیث کا مخالف کہتے ہیں۔ یہ سب باتیں جہالت کی ہیں، علم و عقل سے دور کا بھی ان کو واسطہ نہیں۔

---

(۱) حدود اختلاف: ۱۰، بہ حوالہ تاج العروس: ۱/ ۳۰۸

غیر مقلدین کے دعویٰ ''عمل بالحدیث'' پر ایک نظر

غیر مقلدین کا دعویٰ ہے کہ وہ صرف صحیح حدیث پر عمل کرتے ہیں؛ بل کہ ان میں سے بہت سارے تو بہ طور خاص بخاری و مسلم ہی پر عمل کے مدعی ہیں اور دوسرے لوگوں سے بھی ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ بخاری شریف یا مسلم شریف سے حدیث پیش کرو۔ نیز یہ لوگ حنفی لوگوں کو الزام دیتے ہیں کہ یہ بخاری و مسلم کی صحیح حدیثوں پر عمل نہیں کرتے ، یہ لوگ رفع یدین اور فاتحہ خلف الامام وغیرہ بعض مسئلوں میں عوام کو بخاری و مسلم کی حدیث دکھا کر کہتے ہیں کہ یہ صحیح حدیثیں ہیں، حنفی ان پر عمل نہ کر کے اپنی نمازوں کو برباد کر رہے ہیں، اس جگہ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بخاری و مسلم کی اور دیگر کتب حدیث کی کتنی صحیح حدیثیں ہیں جن کو یہ غیر مقلد ٹھکراتے ہیں، پھر بھی اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں۔

(۱) امام مسلم رحمہ اللہ نے حدیث روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو ''وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا'' (۱)

امام مسلم نے مسلم شریف میں اس کو صحیح قرار دیا ہے،اور ابن حزم ظاہری نے بھی اس کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ (۲)

اس حدیث کو امام مسلم کے علاوہ نسائی، ابن ماجہ، احمد وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (۳)

یہ روایت حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ و حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں سے

(۱) مسلم: ۱/۱۷۴

(۲) محلی: ۲/۲۷۰

(۳) نسائی: ۱/۱۴۶، ابن ماجہ: ۱/۶۱، احمد: ۱۶/۵۵ و ۱۷/۵۲

روایت کی گئی ہے۔

اس صحیح حدیث پر غیر مقلدین عمل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری وفرض ہے، بغیر اس کے نماز نہیں ہوتی۔ حالاں کہ کسی بھی صحیح حدیث میں مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو ضروری نہیں بتایا گیا ہے اور جس حدیث کا یہ حوالہ دیتے ہیں یعنی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، اس کی نماز نہیں ہوئی'' یہ حدیث تو مقتدی کے بارے میں نہیں ہے کیوں کہ مقتدی کے بارے میں اوپر کی حدیث نے بتایا کہ اس کو خاموش رہنا ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا تعلق مقتدی سے نہیں ہوگا؛ بل کہ ان سے ہوگا جن کے ذمہ قرأت ہے اور وہ امام ہے یا تنہا نماز پڑھنے والا۔

اس صاف وصریح صحیح حدیث کا انکار کرتے ہوئے غیر مقلدین کہتے ہیں کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا ہر حال میں فرض ہے، حالاں کہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کی تصریح کے مطابق امام کے زور سے قرأت کرتے وقت امام کے پیچھے قرأت کرنے سے صحابہ، تابعین وغیرہ سے متواتراً منع کرنا وارد وثابت ہے۔ (۱)

غیر مقلدین، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کے سلسلے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اور تین طلاق کے مسئلہ میں خاص طور پر ان کے بیانات سے استفادہ کرتے ہیں ان کا یہ بیان ان پر حجت ہونا چاہئے۔

(۲) حضرت علقمہ رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟ چناں چہ آپ نے نماز پڑھی اور پہلی مرتبہ (تکبیر تحریمہ کے وقت) کے سوا کسی اور جگہ رفع

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۳/ ۳۰۷

یدین نہیں کیا۔(۱)

امام ترمذی نے اس حدیث کو ''حسن'' اور غیر مقلدین کے امام علامہ ابن حزم ظاہری نے ''صحیح'' قرار دیا ہے۔(۲)

اور غیر مقلد عالم علامہ ناصر الدین البانی نے لکھا ہے:

''حق یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی سند مسلم کی شرط کے مطابق ہے اور جن لوگوں نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے ہمیں ان کی کوئی ایسی دلیل نہیں ملی جس سے استدلال صحیح ہو اور اس کی وجہ سے حدیث رد کر دی جائے''۔(۳)

نیز علامہ احمد محمد شاکر نے (اس حدیث کی سند کو مسند احمد کی تعلیق میں صحیح قرار دیا ہے۔(۴)

اس صحیح حدیث اور اس کے ساتھ اور بھی متعدد اس معنیٰ کی احادیث صحیحہ کے خلاف؛ غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رکوع میں جاتے ہوئے اور اٹھتے ہوئے بھی رفع یدین کرنا چاہیے۔

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے جب پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوتوں میں نماز پڑھتے تھے؟ تو فرمایا کہ ہاں۔(۵)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جوتے پہن کر نماز

---

(۱) الترمذي:۱/۵۹، احمد :۵/۲۵۱

(۲) محلى:۳/۴

(۳) المشكاة ، بتحقيق الشيخ ناصر الدين الألباني :۱/۲۵۲

(۴) مسند:۵/۲۵۱

(۵) البخاري:۱/۵۶ ، مسلم:۱/۲۰۸

پڑھتے تھے؛ کیا غیر مقلدین اس پر عمل کرتے ہیں؟ کیا ان کے امام و علما اس پر عمل کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو بخاری و مسلم کی حدیث پر عمل نہ کر کے، غیر مقلدین اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانے کے مستحق کیوں کر ہو سکتے ہیں؟

(۴) بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رمضان ہو یا غیر رمضان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں چار رکعت نماز پڑھتے جس کی کیفیت وطول کو نہ پوچھو، پھر چار رکعت پڑھتے جس کے حسن وطول کو نہ پوچھو، پھر تین رکعت پڑھتے۔(۱)

غیر مقلدین اس حدیث کو تراویح کی نماز کے آٹھ رکعات ہونے کی دلیل میں بڑے طمطراق سے پیش کرتے ہیں، اور جو صحابہ کے زمانے سے آج تک مسلسل و متواتر بیس رکعت پڑھی جا رہی ہیں اس کو بدعت کہتے ہیں، مگر خود اس حدیث کی مخالفت بھی کرتے ہیں، اس طرح کہ اس حدیث میں صاف طور پر آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چار چار رکعت پڑھتے تھے، مگر کسی بھی غیر مقلدین کی مسجد میں تراویح چار چار رکعت نہیں؛ بل کہ دو دو رکعت پڑھتے ہیں؛ لیکن کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں؟ پھر اس حدیث میں نہ جماعت سے پڑھنے کا ذکر ہے اور نہ مسجد میں پڑھنے کا؛ بل کہ حدیث کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تنہائی میں اور گھر میں ہوتا تھا؛ مگر غیر مقلدین تراویح کی نماز جماعت سے مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ جب کہ خود حدیث میں یہ بھی ہے کہ فرض کے سوا دوسری نمازیں گھر میں پڑھو؛ کہ یہی افضل ہے۔(۲)

---

(۱) البخاري:۱/۱۵۴، مسلم:۲/۲۵۴

(۲) البخاري :۱/۱۰۱، مسلم:۱/۲۶۶

یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی تھی کہ رمضان میں چند دن صحابہ کرام کو تراویح پڑھائی پھر ایک دن صحابہ تو جمع ہو گئے مگر آپ تشریف نہیں لائے اس کے بعد تشریف لا کر یہ فرمایا کہ گھروں میں نماز پڑھو؛ کہ یہی افضل ہے؛ کہ فرض کے سوا دیگر نمازیں گھر میں پڑھی جائیں۔ مگر خاص تراویح کے سلسلہ کا یہ حکم نہ مان کر غیر مقلدین حدیث کی مخالفت مسلسل کرتے ہیں اور دوسروں کو الزام دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے۔

(۵) امام بخاری رحمۃ اللہ نے باب باندھا "بَابُ مَنْ اَجَازَ الطَّلَاقَ الثَّلَاثَ" باب اس کا جس نے تینوں طلاقوں کو جائز قرار دیا۔ پھر متعدد احادیث بیان فرمائیں جن سے ایک ساتھ تین طلاق دینے سے تینوں طلاقوں کا واقع ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میرے خاوند نے مجھے طلاق بتہ دی اور ایک روایت میں ہے کہ تین طلاقیں دیں، اس کے بعد میں نے عبدالرحمان بن زبیر سے نکاح کرلیا؛ مگر وہ ناکارہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ شاید دوبارہ رفاعہ کے پاس جانا چاہتی ہے ہرگز نہیں جب تک کہ وہ تیری مٹھاس اور تو اس کی مٹھاس نہ چکھ لے۔ (۱)

اس حدیث میں حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ کے تین طلاق دینے کا ذکر ہے جس سے امام بخاری ان لوگوں کے لیے استدلال فرمارہے ہیں، جو تین طلاقوں کو نافذ مانتے ہیں، معلوم ہوا کہ امام بخاری نے اس سے اکھٹی تین طلاقیں مراد لی ہیں، مگر غیر مقلدین اس کے خلاف محاذ بنائے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ تین طلاقیں اکھٹی دینے سے ایک

---

(۱) البخاري:۲/۷۹۱

ہی واقع ہوتی ہے، ایک طرف بخاری کو ماننے کا دعویٰ اور دوسری طرف اس کے خلاف عمل حالاں کہ بخاری میں امام بخاری نے اس کے خلاف نہ کوئی باب باندھا ہے اور نہ کوئی حدیث پیش کی ہے۔

(٦) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد سکھایا اس حال میں کہ میرا ہاتھ آپ کے دو ہاتھوں کے درمیان تھا۔ (۲)

اس حدیث کو امام بخاری نے "باب المصافحة" میں تعلیقاً اور "باب الاخذ بالیدین" میں پوری سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت حماد اور حضرت ابن المبارک نے دو ہاتھوں سے مصافحہ کیا؛ مگر اس متفق علیہ حدیث کے خلاف غیر مقلدین ہمیشہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے اور دو ہاتھوں سے مصافحہ کو برا جانتے ہیں۔ کیا یہی عمل بالحدیث ہے؟

(۷) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دیکھا نمازوں کو ان کے وقت پر پڑھتے دیکھا، سوائے مزدلفہ میں دو نمازوں مغرب وعشاء کے اور اس دن فجر کی نماز آپ نے (وقت معتاد) سے پہلے پڑھی۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار نیند میں کوئی تفریط نہیں (یعنی کوئی گناہ نہیں) تفریط (گناہ) تو اس پر ہے جو نماز نہ پڑھے یہاں تک کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں کو وقت پر پڑھنا چاہئے۔ بلا عذر نماز کو موخر کرنا اور

(۱) البخاري:۲/ ۹۲٦، مسلم:۱/ ۱۷۴

(۲) مسلم:۱/ ۴۱۷

(۳) مسلم:۱/ ۲۳۹

بے وقت پڑھنا گناہ کی بات ہے۔مگر غیر مقلدین کے یہاں نمازوں کومقدم ومؤخر کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب کہ یہ بات صریح احادیث کے خلاف ہے۔

(۸) مسلم ودیگر کتب حدیث میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جوشخص سورۂ فاتحہ اوراس کے ساتھ کچھ زائد (سورہ یا آیات) نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ (۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جوشخص نماز میں سورۂ فاتحہ اوراس کے ساتھ کچھ اور (سورت یا آیات) نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، غیر مقلدین اس حدیث کے ایک حصہ کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر سورۂ فاتحہ کسی کی نماز نہیں ہوتی، نہ امام کی، نہ مقتدی کی، نہ منفرد کی، مگراس حدیث کے دوسرے حصہ میں جو کہا گیا کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی سورت وآیت پڑھنا ضروری ہے۔اس کو نہیں مانتے اور مقتدی کو سورۂ فاتحہ کے سوا کچھ اور پڑھنے سے منع کرتے ہیں، پھر بھی اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں۔ فیاللعجب!

(۹) بخاری ومسلم ودیگر محدثین نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم بیت الخلا آؤ تو پیشاب پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف نہ منہ کرو اور نہ پیٹھ کرو۔ (۴)

مگر غیر مقلدین اس حدیث کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ بنے ہوئے بیت الخلا میں قبلہ کی طرف رُخ کر کے یا پیٹھ کر کے پیشاب پاخانہ کر سکتے ہیں۔

(۱۰) حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر میری

---

(۱) مسلم:۱/۱۶۹ النسائی:۱/۱۴۶

(۲) البخاري:۱/۵۷،مسلم:۱/۱۳۰

اور خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے۔ اس کو مضبوط پکڑو اور دانتوں سے تھام لو۔ (۱)

امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث ''حسن صحیح'' ہے۔

پوری اُمت اس حدیث پر عمل کرتی ہے اور حضراتِ خلفاء راشدین کی سنتوں کو قابل عمل قرار دیتی ہے۔ مگر غیر مقلدین' صحابہ وخلفاء راشدین کی سنت کو نعوذ باللہ بدعت کہتے اور اس کو ٹھکراتے ہیں چناں چہ بیس رکعت تراویح کو حضرت عمر ﷜ کی بدعت ؛ اور جمعہ کے دن کی پہلی اذان کو بدعت عثمان ﷜ کہہ کر ان کا رد کرتے ہیں۔ جب کہ اس حدیث صحیح سے خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوط پکڑنے کا حکم زبانِ رسالت سے صادر ہوا ہے تِلْکَ عَشَرَةٌ کَامِلَةٌ (یہ کامل دس (مثالیں) ہیں) ایسی صحیح احادیث بہت سی ہیں جن کو غیر مقلدین ٹھکراتے ہیں۔ یہاں صرف بطور نمونہ دس مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

---

(۱) الترمذي:۲/۹۲، ابن ماجه:۵، ابو داود:۲/۲۷۹، مسنداحمد:۴/۲۷، دارمی:۱/۲۶

فقہ پر غیر مقلدین کے اعتراضات کا جائزہ

کیا فقہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے؟

غیر مقلدین کی طرف سے عوام الناس میں جو وسوسے ڈالے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عوام کو یہ سمجھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو صرف قرآن وحدیث کا مکلّف وپابند بنایا گیا ہے۔لہٰذا فقہ اور فقہی کتابوں کی نہ ضرورت ہے اور نہ قرآن و حدیث کو چھوڑ کر اس پر عمل کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ ''فقہ'' قرآن وحدیث سے ہٹ کر اور قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غیر مقلدین کی یہ بات ۔''کَلِمَۃُ حَقٍّ اُرِیْدَ بِھَا الْبَاطِلُ ۔ (کلمہ حق ؛ جس سے باطل مراد لیا گیا ہے) کا مصداق ہے۔اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے منکرین حدیث (جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں) کہا کرتے ہیں کہ قرآن کریم ایک جامع اور مکمل کتاب ہے اس کے معانی ومضامین واضح ہیں، لہٰذا حدیث وسنت کی کوئی ضرورت نہیں اور قرآن کو چھوڑ کر حدیث پر عمل جائز نہیں ؛ کیوں کہ قرآن وحدیث میں بہت جگہ تضاد وٹکراؤ ہے، ظاہر ہے کہ منکرین حدیث کی یہ منطق جس طرح باطل ہے اسی طرح غیر مقلدین کی منطق بھی غیر معقول ہے۔

کیوں کہ فقہ درحقیقت، قرآن وحدیث کی تشریح وتوضیح، تفہیم وتسہیل کا نام ہے جس کو علوم قرآن وحدیث کے ماہرین اور مستند شارحین نے انتہائی دیانت داری وامانت داری اور پورے حزم واحتیاط کے ساتھ مرتب ومدون فرمایا ہے۔

مثلاً نماز جو کہ اسلامی عبادات میں سے سب سے اہم عبادت ہے، قرآن و حدیث میں اس کا مکمل طریقہ پوری جزوی تفصیلات کے ساتھ ایک جگہ اکٹھا موجود نہیں ہے، کچھ باتوں کا ذکر قرآن میں ہے اور کچھ ارکان وآداب کا ذکر کسی حدیث میں ہے اور کچھ کا ذکر کسی اور حدیث میں ہے، اسی طرح اس کی جزوی تفصیلات اور متعلقہ مسائل واحکامات ترتیب اور تفصیل سے مذکور نہیں ہیں، ان ماہرین شریعت علما وفقہا نے قرآن وحدیث سے کشید کر کے ان سب کو اکٹھا کر دیا تا کہ عوام الناس اور معمولی سمجھ بوجھ والا بھی ان شرعی احکامات پر بہ آسانی عمل کر سکے، اسی طرح جو مسائل قرآن وحدیث میں صراحۃً بیان نہیں فرمائے گئے۔ ان کو قرآن وحدیث کے اشارے سے یا دلالت سے اخذ کر کے ان کو بھی بیان فرمایا، مثال کے طور پر قرآن پاک میں والدین کے حقوق وآداب میں ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو ''اُف'' نہ کہو (الإسراء :۲۳) اور حدیث میں والدین کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے۔

مگر والدین کو مارنے پیٹنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، مگر قرآن وحدیث کی دلالت سے اس کا بھی حرام ہونا معلوم ہوتا ہے کہ جب والدین کو گالی دینا منع، اور اُف کہنا منع ہے تو مارنا تو بدرجہ اولیٰ منع و ناجائز ہوگا، ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن وحدیث کی دلالت یا ان کے اشارے سے مسئلہ نکالنا، قرآن وحدیث کے خلاف نہیں، بل کہ عین قرآن وحدیث کی منشا و مراد کے مطابق ہے۔

اسی طرح بعض وہ مسائل جس کا ذکر قرآن وحدیث میں بالکل نہیں ہے، نہ صراحۃً، نہ دلالۃً، نہ اشارۃً۔ ایسے مسائل کو قرآن وحدیث کے اندر آئے ہوئے مسائل پر پیش کر کے، ان کا حکم معلوم کیا جاتا اور ان کو بھی فقہ میں مرتب کیا جاتا ہے، مثلاً غلام کتنی شادیاں کر سکتا ہے؟ اس مسئلہ کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔

حضرات صحابہ نے قرآن کی ایک آیت پر قیاس کر کے فرمایا کہ غلام صرف دو نکاح کرسکتا ہے، کیوں کہ قرآن میں باندیوں کی سزا (یعنی زنا کی سزا) آزاد عورتوں کی سزا کے لحاظ سے نصف بتائی گئی ہے (النساء: ۲۵) تو اس پر نکاح کے مسئلہ کو قیاس کیا گیا اور آزاد مردوں کے لحاظ سے نصف شادیاں کرنے کی بات طے کی گئی۔ (۱)

اس کو قیاس کہا جاتا ہے اور صحابہ کے دور سے؛ بل کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے قیاس سے برابر کام لیا جاتا رہا ہے، تو فقہا نے ان قیاسی مسائل کو بھی فقہ میں مدون کیا ہے۔

یہ ہے فقہ کی حقیقت جس کو غیر مقلدین اپنی ناواقفیت کی بنا پر یا محض تعصب و عناد کی وجہ سے قرآن وحدیث کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ فقہ کی پوری حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمارا مضمون ”فقہ کی حقیقت وضرورت“ جو اس رسالہ میں شامل ہے۔ اس کا مطالعہ فرمائیے۔

اور ان لوگوں کا یہ کہنا کہ جب قرآن وحدیث موجود ہیں تو فقہ کی کیا ضرورت؟ محض مغالطہ ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ جب قرآن وحدیث موجود ہیں؛ تو یہ غیر مقلدین تفسیریں، اور حدیث کی شروحات اور دیگر عنوانات پر چھوٹی بڑی کتابیں کیوں لکھتے اور پھیلاتے ہیں؟ خصوصاً نماز کے عنوان پر ”صلوۃ الرسول“ اور ”صلوۃ النبی“ نام کی کتابیں اور ”فتاویٰ علماء اہل حدیث“ اور ”فتاویٰ ثنائیہ“ اور ”فتاویٰ نذیریہ“ جو غیر مقلد علماء کے فتاویٰ ہیں، آخر قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے، ان کی کیا ضرورت تھی اور ہے؟ افسوس صد افسوس کہ جو طبقہ اپنے علماء کی کتابوں پر، ان کے فتاویٰ پر، ان کی فہم پر اعتماد کرتا ہے اور ان کی کتابوں کو پھیلاتا ہے، وہ عوام کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتا پھرتا ہے کہ قرآن وحدیث کافی ہے، فقہ کی کیا ضرورت؟ جب

(۱) اعلام الموقعین، ابن قیمؒ: ۱/ ۲۰۹

کہ ہم نے اوپر عرض کر دیا ہے کہ قرآن و حدیث کے ثمرہ اور پھل اور ان کی تشریح ہی کا نام فقہ ہے۔اگر قرآن وحدیث اور دیگر دلائل شرعیہ (اجماع و قیاس) سے مستنبط و ماخوذ مسائل واحکامات کی ضرورت نہیں ہے،تو پھر غیر مقلد علما کی کتابوں اوران کے فتاویٰ کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں قرآن وحدیث کو کافی سمجھ کران پر یہ لوگ اکتفا نہیں کرتے؟

چند دنوں قبل ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں نے ایک اہل حدیث عالم (انھوں نے نام بھی لیا تھا) کا بیان کیسٹ میں سنا،وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے قرآن کو آسان بنایا ہے۔(وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ) اور قرآن وحدیث ہمارے لیے کافی ہےتو پھر کسی اور چیز کی یا کسی عالم کی کیا ضرورت ہے؟

میرے پاس اس وقت بعض علما بھی تشریف فرما تھے اور مدرسہ کے طلبہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ عربی زبان سے واقف ہیں؟ کہا کہ نہیں، میں نے کہا کہ جب قرآن سب کے لیے یکساں طور پر آسان کر دیا گیا ہے،تو آپ قرآن پاک اٹھایئے اور کسی کے ترجمہ کی مدد کے بغیر اس کو پڑھیے،کیا آپ اس طرح قرآن سمجھ سکتے ہیں؟ کہنے لگے کہ نہیں سمجھ سکتا، میں نے کہا کہ جب قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ”ہم نے صرف عربی جاننے والوں کے لیے اس کو آسان کیا ہے،تو یہ ہر زبان والے کو سمجھ میں آنا چاہیے،اب اگر آپ کسی ترجمہ کی مدد لیتے ہیں تو وہ ترجمہ کسی نہ کسی عالم کا کیا ہوا ہوگا،تو آپ قرآن جیسی آسان چیز کو سمجھنے میں ایک عالم کے محتاج ہوئے،جب کہ اہل حدیث مولوی صاحب کا کہنا تھا کہ ہم کو کسی چیز یا کسی عالم کی ضرورت نہیں۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں تو یہ غیر مقلد علما قرآن

کا ترجمہ کیوں کرتے ہیں، ان کی تفسیر کیوں لکھتے ہیں۔ لوگوں میں بیانات کیوں کرتے ہیں لوگوں کو صرف قرآن وحدیث کے معری نسخے کیوں نہیں دیتے؟ معلوم ہوا کہ ان کا دعویٰ کچھ ہے اور عمل کچھ اور۔

غرض یہ کہ فقہ کی ضرورت واہمیت ایک مسلمہ امر ہے اگر عناد وتعصب نہ ہو تو کوئی ذی عقل وہوش اس کا انکار نہیں کرسکتا۔

فقہی کتب میں فحش مضامین ہونے کا جواب

غیر مقلدین نے فقہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ فقہ کی کتب میں فحش مضامین ہیں، مثلاً کتب فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ، مرد کا پیشاب کا مقام عورت کے پیشاب کے مقام سے مل جائے اور درمیان میں آڑ نہ ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا؟

مگر ان کا یہ اعتراض؛ بل کہ وسوسہ، محض لغو اور متعصب ذہنیت کی پیداوار ہے، کیوں کہ اولاً تو اس قسم کے مسائل خود احادیث مبارکہ میں بھی آئے ہیں، جن کو یہ لوگ مانتے ہیں، اگر احادیث سے ماخوذ فقہ میں اس طرح کے مسائل ہوں تو پھر اعتراض کی کیا وجہ؟ سوائے تعصب کے اس کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، غور کیجیے کہ کیا احادیث میں کچھ شرم وحیاء کے مسائل بہ ضرورت بیان کئے جانے کی وجہ سے وہ قابل اعتراض ولائق رد قرار پائیں گی؟ یا اعتراض کرنے والے ہی قابل اعتراض قرار پائیں گے؟

معلوم ہونا چاہئے کہ فقہ پر جس طرح غیر مقلدین کا یہ اعتراض ہے کہ اس میں فحش باتیں ومسائل ہیں۔ بعینہ یہی اعتراض منکرین حدیث (جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں) نے درج ذیل احادیث پر کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم (ازواج نبی) میں سے کوئی حائضہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ازار پہننے کا حکم دیتے اور ازار کے اوپر سے مباشرت فرماتے۔(۱)

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لیٹی، اچانک مجھے حیض آ گیا، میں اٹھ کر چلی گئی اور میں نے حیض کے وقت کے کپڑے لیے آپ نے فرمایا کہ کیا حیض آ گیا؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں، آپ نے مجھے بلایا اور میں آپ کے ساتھ لیٹ گئی۔(۲)

(۳) حضرت ابوسلمہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عائشہ کے رضاعی بھائی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور حضور علیہ السلام کے غسل کے بارے میں پوچھا، انہوں نے برتن منگوایا جو صاع کے برابر تھا اور غسل فرمایا اور سر پر پانی بہایا، ابوسلمہ کہتے ہیں کہ ہمارے اور حضرت عائشہ کے درمیان ایک پردہ تھا۔(۳)

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام اپنی ازواج کا روزہ کی حالت میں بوسہ لیتے تھے، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں، بعض روایات میں ہے کہ روزہ کی حالت میں مباشرت (بوس وکنار) فرماتے تھے۔(۴)

اور مسند احمد کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ روزے کی حالت میں آپ ان سے مباشرت (بوس وکنار) فرماتے؛ اور آپ کے اور ان

---

(۱) البخاري :۲۹۱،مسلم:۴۴۰، النسائی:۳۷۰، ابوداود:۲۳۹، ابن ماجه:۶۴۷،احمد:۲۳۸۷۲

(۲) البخاري:۲۸۹، مسلم:۴۴۴، النسائی:۴۸۱، ابن ماجه: ۶۴۹، دارمی:۱۰۲۶، احمد:۲۵۳۰۰

(۳) البخاري:۲۴۳،مسلم :۴۸۱، النسائی:۲۲۷، احمد:۲۳۴۹۳

(۴) البخاري:۱۷۹۳، مسلم:۱۸۵۱، الترمذي:۶۶۱، ابوداود:۲۰۳۴،ابن ماجه : ۱۶۷۴

کے درمیان یعنی شرم گاہ پر ایک کپڑا ہوتا تھا۔(۱)

(۵)حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک رات میں حضور علیہ السلام اپنی ساری بیویوں سے ملتے تھے اوراس وقت آپ کی نو بیبیاں تھیں۔(ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آپ نے ایک رات میں اپنی عورتوں سے ملاقات کی ایک غسل کے ساتھ۔(۲)

ان احادیث پر منکرین حدیث کا بعینہٖ وہی اعتراض ہے جو غیر مقلدین و منکرین فقہ کا فقہ پر ہے کہ ان میں فحش باتیں ہیں، بوس و کنارو جماع وغیرہ کی جو حدیث میں نہ ہونا چاہیے۔کیا ان جاہلوں کے اس اعتراض سے حدیث مخدوش ہوگئی؟ اسی طرح فقہ پر یہ اعتراض کیا اس کو مخدوش کردے گا؟ کیا غیر مقلدین کے نزدیک منکرین حدیث کا اعتراض صحیح ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر فقہ پر اعتراض بھی اسی طرح غلط ہے۔

فقہ میں اختلاف کا جواب

غیر مقلدین کے وسوسوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فقہی کتابوں میں مذکور ائمہ کے اختلافات کو پیش کرکے کہتے ہیں کہ فقہ میں اختلاف ہے اور خود حنفی فقہ میں بھی اختلافات ہیں، اگر ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا ایک قول ہے تو ان کے شاگردوں کا دوسرا قول ہے۔پھر فقہ میں چار مسلک ہیں، حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی، تو اس اختلاف کے ہوتے ہوئے کس طرح عمل ہوگا؟ اور کس پر عمل ہوگا؟

اس وسوسہ کا جواب یہ ہے کہ چاروں مسلکوں میں سے کسی پر بھی عمل کرلیا جائے وہی اس کے لیے کافی ہے، چاروں مسالک اپنی اپنی جگہ حق پر ہیں، جس طرح قرآن

(۱) احمد:۲۴۱۷۸

(۲) البخاري:۲۷۵، مسلم:۴۶۷، الترمذي:۱۳۰، ابوداود:۱۸۸، ابن ماجه: ۵۸۱، احمد:۱۲۴۹۹

مجید کی سات قرأتوں میں سے کسی ایک قرأت پر تلاوت کر لینے سے تلاوت کا پورا پورا ثواب مل جاتا ہے اور ساتوں قرآتیں حق ہیں، اور غیر مقلدین بھی انہی قرأتوں پر تلاوت کرتے ہیں، کیا سات مختلف قرأتوں کی وجہ سے کوئی عقل مند تلاوت کو چھوڑ سکتا ہے؟ ہر گز نہیں، اسی طرح چار مسلکوں کے اختلاف کو سات قاریوں کے اختلاف کی طرح سمجھنا چاہیے، رہا یہ کہ خود حنفی مسلک میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف کے موقعہ پر اصحاب ترجیح فقہاء، صحیح و مفتی بہ و معتبر قول کی نشان دہی بھی کر دیتے ہیں، پھر پریشانی کیا ہے، یہ تو تحقیقی جواب ہے، اس کے علاوہ ہم ان غیر مقلدین سے پوچھتے ہیں کہ روایات کا اختلاف تو احادیث میں بھی پایا جاتا ہے، خود بخاری میں مختلف احادیث ہیں اور دیگر کتب حدیث میں بھی ہزاروں احادیث میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ مثلاً:

(۱) امام بخاری نے متعدد صحابہ سے روایت کیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی اپنی عورت سے جماع کرے مگر منی نہ نکلے تو صرف وضو کافی ہے۔

حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت طلحہ و حضرت کعب، اور حضرت ابوایوب، رضی اللہ عنہم سب نے یہی فرمایا۔ (۱)

مگر خود امام بخاری اور دیگر محدثین نے اس کے خلاف یہ حدیث نقل کی ہے کہ اگر عورت سے جماع کیا اور شرم گاہیں مل گئیں تو غسل واجب ہوگا۔ (۲)

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ "تَوَضَّئُوا مِمَّامَسَّتِ النَّارُ" کہ آگ میں پکی ہوئی چیز کے استعمال پر وضو کرنا چاہئے۔ (۳)

---

(۱) مسلم واحمد نے حضرت عثمانؓ سے نقل کیا ہے، البخاری: ۲۸۳، مسلم: ۵۲۴، احمد: ۴۲۰

(۲) البخاری: ۲۸۲، مسلم: ۵۲۵، النسائي: ۱۹۱، ابو داود: ۸٦، ابن ماجه: ٦۰۲، احمد: ۰۰ ٦۹، دارمي: ۷۵۴

(۳) مسلم: ۵۲۹، النسائي: ۱۷۴، الترمذي: ۷۴، ابو داود: ۱٦٦، ابن ماجه: ۴۷۸، احمد: ۷۳۸۷

مگراس کے خلاف دوسری احادیث انہی محدثین نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت یا سالن (جو کہ آگ سے ہی پکا ہوا ہوتا ہے) کھایا پھر بغیر وضو کے نماز پڑھی۔(۱)

(۳) ضبع (بجو جانور) کے بارے میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے کو فرمایا ہے یعنی اجازت دی ہے۔(۲)

مگراس کے خلاف یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا کوئی (بجو) بھی کھاتا ہے۔(یعنی یہ کھایا نہیں جاتا)(۳)

(۴) ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر پڑھتے اور عورتیں (مسجد سے) واپس ہوتیں؛ تو اندھیرے کی وجہ سے وہ پہچانی نہ جاسکتیں تھیں (یعنی اندھیرے ہی میں نماز فجر ادا فرماتے)۔(۴)

مگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فجر کو اِسفار یعنی اجالے میں پڑھو کہ یہ بڑے اجر کا سبب ہے۔(۵)

امام ترمذی اس حدیث کو حسن صحیح فرماتے ہیں اور اوپر کی حدیث بھی صحیح ہے۔یہ احادیث جو کہ آپس میں مختلف ومتعارض ہیں، ان کی بنا پر کیا ذخیرۂ حدیث کو غیر معتبر قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہر گز نہیں، بل کہ ان میں روایتی و درایتی اصول کے پیشِ نظر کہیں

---

(۱) مسلم:۵۳۱-۵۳۸، البخاري:۲۰۳، احمد:۲۵۵۸۵، ابو داود:۱۵۹

(۲) الترمذي:۱۷۱۳، النسائي:۲۷۸۷، ابو داؤد:۳۳۰۷، ابن ماجه:۳۲۲۷، احمد:۱۳۶۴۹

(۳) الترمذي:۱۷۱۴، ابن ماجه:۳۲۳۸

(۴) البخاري:۳۵۹، مسلم:۱۰۲۰، النسائي:۵۴۲، ابن ماجه:۶۶۱، احمد: ۲۲۹۷۸، مالک:۳، دارمی:۱۱۹۰، الترمذی:۱۴۱

(۵) الترمذي:۱۴۲، النسائي:۵۴۶، ابو داود:۳۶۰، ابن ماجه:۶۶۴، احمد:۱۶۶۲۰، دارمی:۱۱۹۱

تنسیخ، کہیں تطبیق، کہیں ترجیح کا اصول کام میں لایا جائے گا، اسی طرح فقہ کی مختلف روایات کا مسئلہ ہے، تو غیر مقلدین کو اس پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟

فقہ میں چار ہی امام کیوں؟

غیر مقلدین کا ایک وسوسہ یہ ہے کہ فقہ میں چار ہی امام کیوں؟ اور یہ کہ کس آیت یا حدیث میں ہے کہ ائمہ چار ہیں اور ان کے نام کہاں مذکور ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال جہالت پر مبنی ہے اور محض دھوکہ کے لیے عوام میں چلایا جاتا ہے، اس وسوسہ کا جواب درجہ ذیل نکات میں غور کرنے سے ملے گا۔

(۱) دنیا میں بے شمار علما و ائمہ گذرے ہیں لیکن جو مقبولیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان چار ائمہ فقہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد) کو حاصل ہوئی دوسروں کو حاصل نہ ہوئی، جس طرح محدثین تو بہت سے گذرے ہیں مگر ان میں جو مرتبہ اصحاب صحاح ستّہ (امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداوٗد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ) کو ملا وہ دوسرے محدثین کے حصہ میں نہیں آیا اور پھر ان میں بھی جو مقبولیت امام بخاری و امام مسلم کو ملی، دیگر حضرات وہ نہ پا سکے، اگر کوئی جاہل یہ سوال کرے کہ حدیث کے فن میں ان چھ محدثین کو کیوں مانا جاتا ہے، کیا قرآن وحدیث میں ان کا ذکر ہے اور کیا ان کے نام مذکور ہیں؟ تو اس سوال کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ جہالت پر مبنی سوال ہے۔

(۲) قرآن پاک کے سات قاری مشہور ہوئے اور ساری دنیا میں ان ہی کی قرأت کے مطابق تلاوت کی جاتی ہے، اگر یہ سوال کیا جائے کہ سات ہی قاری کیوں؟ اور یہ کہ ان کے نام قرآن وحدیث میں آئے ہیں؟ تو اس کا غیر مقلدین کیا جواب دیں گے؟

(۳) بات دراصل یہ ہے کہ ان چار فقہاء نے قرآن وحدیث کی تشریح وتوضیح ان کے مضامین کی ترتیب وتسہیل، ان کی توجیہ وتحقیق کا جو بے نظیر کارنامہ انجام دیا، وہ دوسرے حضرات کے حصہ میں نہیں آیا، نیز ان حضرات کی فقہ تمام ابواب کو جامع ہے اوراسی دور میں اللہ نے ان کے اصحاب وتلامذہ کو ان کی فقہ کی ترتیب وتدوین کی توفیق دی جس سے قرآن وحدیث کے تمام مضامین، ان کے اصول وکلیات، پھران سے مستنبط جزئیات وفروعات سب کے سب مدون ومرتب ہو گئے اوران حضرات کی امانت ودیانت، ان کی دین میں فقاہت وبصیرت ان کا اخلاص وللّٰہیت اوران کا تقوی وطہارت، ایک ایسی معروف چیز تھی کہ اس کی بنا پر لوگوں نے ان کی فقہ کو پورے اطمینان کے ساتھ قبول کرلیا اور صدیوں سے ان پر اعتماد کرتے ہوئے، ان کی فقہ پر عمل کیا جارہا ہے۔ جس طرح حضرات محدثین کی خدمات پر اعتماد کرتے ہوئے اوران کی دیانت وامانت داری پر بھروسہ کرتے ہوئے، ان کی مرتب کردہ کتبِ حدیث پر امت عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ حالاں کہ ان ائمہ محدثین کا نام وکام نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں، اگر قرآن وحدیث میں ان فقہاء کا ذکر ہونا ضروری ہے تو پھر امام بخاری وامام مسلم ودیگر محدثین کو اوران کی احادیث کو ماننے کے لیے بھی قرآن وحدیث میں ان کا ذکر ہونا چاہیے، کیا کوئی غیر مقلدین ان کا نام قرآن وحدیث میں دکھا سکتا ہے؟

فقہ ابو بکر وفقہ عمر کی تقلید کیوں نہیں کی جاتی؟

وساوس غیر مقلدین میں سے یہ بھی ایک ہے کہ جب امام ابوحنیفہ وامام شافعی وغیرہ ائمہ کے مقابلہ میں حضرات صحابہ کا علم، فہم وبصیرت بڑھی ہوئی ہے تو ان کی فقہ

وفتاویٰ کو قابل تقلید کیوں نہیں سمجھتے ، ابوحنیفہ وشافعی کی فقہ کو کیوں مانتے ہیں اور اپنے آپ کو ابوبکری وعمری کیوں نہیں کہلاتے ؟ حنفی وشافعی کیوں کہلاتے ہیں؟

اس وسوسہ کا جواب اوپر کے جواب سے سمجھا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ صحابہ کرام اگر چہ علم وعمل ،تقویٰ و دیانت ،فہم وبصیرت میں ان ائمہ کرام سے بہت بڑھے ہوئے ہیں ؛ اوران ائمہ کرام نے قرآن وحدیث کے ساتھ صحابہ کرام کی فقہ وفتاویٰ کو بھی حرز جان بنایا ہے اوران فتاویٰ کی روشنی میں ہی اپنی فقہ کو مرتب فرمایا ہے؛ تاہم کسی ایک صحابی سے بھی تمام ابواب وجزئیات کے متعلق تفصیلی مسائل وفتاوی مرتب ومدون نہ ہوئے کسی سے سو مسائل ثابت ہیں تو دوسرے صحابی سے پچاس مسائل ثابت ہیں ،اس طرح ایک سے تمام ابواب کے بارے میں تفصیلی مسائل ثابت نہ ہونے کی وجہ سے فقہ ابوبکر وفقہ عمر کی طرف لوگوں کا انتساب نہ ہوا، اوران ائمہ کرام سے چوں کہ ہر ہر باب میں تفصیلی مسائل مرتب ومدون ہو گئے ان کی طرف انتساب کیا جانے لگا، باقی حضرات صحابہ کے فتاوی وفقہ پر عمل تو ان ائمہ کی فقہ کے ضمن میں ہو جاتا ہے کیوں کہ فقہ کی بنیاد جن چیزوں پر ہے ان میں ایک صحابہ کے اقوال وفیصلے بھی ہیں، چناں چہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے امام احمد کے مسلک و مذہب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”امام احمد بن حنبل کے فتاوی کی دوسری اصل وبنیاد، وہ مسائل ہیں جن پر حضرات صحابہ نے فتوی دیا ہے۔(۱)

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”میں کتاب اللہ سے سند لیتا ہوں، اگر اس میں کوئی مسئلہ نہ ملا تو حدیث

---

(۱) اعلام الموقعین:۱/۳۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیتا ہوں اور اگر اس میں بھی نہ ملے تو
اقوال صحابہ سے دلیل لیتا ہوں۔ (اگر صحابہ میں اختلاف ہو تو) ان میں
سے جس کا قول چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں
اور ان حضرات کے اقوال سے کسی اور قول کی طرف نہیں جاتا۔ (۱)

معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ و دیگر ائمہ نے فقہ میں جہاں قرآن و حدیث سے اخذ فرمایا ہے وہیں حضرات صحابہ کے اقوال و فتاویٰ کو بھی لیا ہے؛ مگر چوں کہ فقہ کے تمام ابواب پر سیر حاصل بحث اور ایک فن کی حیثیت سے کلام صحابہ سے مروی نہ تھا تو نسبت ان کی طرف نہیں کی گئی، بل کہ ان ائمہ کرام کی طرف کی گئی جن سے تدوین فقہ کا کام منصۂ مشہود پر ظاہر ہوا؛ بالکل اسی طرح جیسے قرآن پاک کی سات قرأتیں، صحابہ کے دور میں تھیں اور بعض صحابہ کا اس سلسلہ میں بہت اونچا مقام بھی تھا، جیسے حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت سالم مولی ابو حذیفہ اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہم۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان چار حضرات سے قرآن حاصل کرو۔ (۲)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ اُبَی ہم میں سب سے بڑے قاری ہیں۔ (۳)

مگر اس کے باوجود ساری دنیا میں آج حضرت عاصم کوفی اور دوسرے قاریوں کی قرأت پڑھی جاتی ہے۔ غیر مقلدین بھی کہتے ہیں کہ فلاں قاری کی روایت

---

(۱) تهذيب الكمال: ۲۹/۴۴۲، تاريخ بغداد: ۱۳/۳۶۸، تهذيب ۱۰/۴۵۱

(۲) البخاري: ۴۶۱۵، مسلم: ۴۵۰۴، الترمذي: ۳۷۴۶

(۳) البخاري: ۴۶۲۱، احمد: ۲۰۱۷۲

کے مطابق یہ قرأت ہے، وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے قرأت پر مستقل کام کر کے اس کی تدوین کی اور پھر یہ نقل ہوتے چلی آرہی ہیں، لہٰذا ان کی طرف منسوب کر دیا اور کہا جاتا ہے کہ یہ قاری عاصم کوفی اور فلاں کی قرأت ہے، اسی طرح بخاری کی حدیث ومسلم کی حدیث جو کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان حضرات نے قربانی دے کر اس فن کو دیانت وامانت سے ہم تک پہنچایا، لہٰذا ان کی طرف اس کو منسوب کر دیا جاتا ہے۔ کیا کوئی عاقل یہ سوال کرسکتا ہے کہ حدیث بخاری وحدیث مسلم کیوں کہتے ہو؟ حدیث ابو بکر وحدیث عمر کیوں نہیں کہتے؟ افسوس کہ غیر مقلدین کو یہ واضح باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں اور وہ لوگوں کو الجھاتے ہیں۔

کیا بخاری ومسلم کی حدیث سب پر مقدم ہے؟

غیر مقلدین کے وساوس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فقہ حنفی میں، بخاری ومسلم کی حدیثوں کے خلاف مسائل ہیں اور دوسری حدیثوں پر بخاری ومسلم کی حدیث مقدم ہے لہٰذا فقہ حنفی غیر معتبر ہے۔

یہ وسوسہ دراصل انتہائی بُودہ ولغو قسم کا ہے؛ کیوں کہ نہ قرآن میں ہے اور نہ کسی حدیث میں کہ بخاری ومسلم کی حدیث سب سے مقدم ہے، اگر یہ اللہ ورسول کی بات ہوتی؛ تو بلا شبہ حنفی اس کے پابند ہوتے، اور نہ ہوتے تو اس پر جرح وتنقید کا بھی دوسروں کو حق ہوتا؛ مگر جو بات قرآن وسنت میں ثابت نہیں اور وہ کسی کا قول ہے تو حنفی فقہ اس کی پابندی کیوں کرے؟ پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا میں امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے تشریف لانے سے پہلے ''فقہ حنفی'' کی تدوین ہوچکی تھی اور ہزارہا علما وائمہ اس فقہ کی اتباع اور اس کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے، اس کے بعد امام بخاری وامام مسلم تشریف لائے تو فقہ حنفی ان حضرات کے پہلے

ہی صحیح سندوں کی جانچ پڑتال کر کے مرتب ہو چکا؛ اس کو یہ کہہ کر ٹھکرانا کہ بعد میں آنے والے امام بخاری و امام مسلم کی حدیث کے موافق نہیں ہے محض بے سمجھی کا نتیجہ ہے یا تعصب کا کرشمہ؛ کیوں کہ صحیحین کے مقدم ہونے کا سوال بعد والوں کے لیے ہوسکتا ہے نہ کہ ان سے پہلے والوں کے لیے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فقیہ ہونے کے ساتھ بڑے محدث تھے اور بڑے بڑے محدثین سے انہوں نے حدیث سنی اور ان سے بھی بڑے بڑے محدثین نے روایت کی ہے، اور اس کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ حدیث کی روایت میں اور اس کے قبول کرنے میں کڑی شرائط کے پابند تھے انہوں نے چھان پھٹک کر احادیث کو لیا اور ان پر اپنے فقہ کی بنیاد رکھی۔

امام ذہبی اور علامہ ابن حجر رحمہما اللہ نے ان سے روایت کرنے والے اور جن سے آپ نے روایت کی ہے ان کے بہت سے نام گنائے ہیں۔ (۱)

اور حضرت یحیٰ بن معین سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

> ابوحنیفہ رحمۃ اللہ ثقہ تھے؛ اور اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو حفظ ہوتی تھی اور جو حفظ نہ ہوتی اس کو بیان نہ کرتے، نیز فرمایا کہ ابوحنیفہ حدیث میں قابل اعتماد تھے۔ (۲)

امام ابویوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب بھی غور کیا تو یہی پایا کہ امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید کسی نہ کسی حدیث واثر سے ہورہی ہے۔ (۳)

غرض یہ کہ فقہ حنفی کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اور ان کے اصحاب نے قرآن وحدیث وآثار صحابہ واجماع وقیاس (اس کی تفصیل گذر چکی ہے) سے مدون ومرتب فرمایا ہے؛

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۶۸، تہذیب: ۱۰/۴۴۹

(۲) تہذیب: ۱۰/۴۵۰

(۳) الخیرات الحسان، بہ حوالہ" ابو حنیفۃ و اصحابہ": ۵۰

اور اس کے بعد امام بخاری وغیرہ تشریف لائے ہیں تو ان کی حدیث مقدم ہو جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ قول نہ اللہ کا ہے نہ رسول اللہ کا، اسی لیے حنفی بزرگ وفقیہ ومحدث علامہ ابن الھمام نے فتح القدیر میں فرمایا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بخاری ومسلم کی حدیث سب سے اصح ہے، پھر وہ جو صرف بخاری میں ہو پھر وہ جو صرف مسلم میں ہو الخ یہ محض تحکم وسینہ زوری کی بات ہے جس کی تقلید جائز نہیں؛ کیوں کہ اصح ہونے کا مدار تو اس پر ہے کہ راوی میں وہ شرائط پائی جائیں جن کا خود امام بخاری ومسلم نے اعتبار کیا ہے۔(۱)

پھر غیر مقلدین کے اس وسوسہ پر اس طور پر بھی نظر کرنا چاہیے کہ بخاری ومسلم کی حدیث یا اور کسی حدیث صحیح کے ثابت ہو جانے سے اس پر عمل ضروری نہیں ہو جاتا بل کہ یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ حدیث کی دلالت اپنے مضمون پر کس درجہ کی ہے اور یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ کہیں منسوخ تو نہیں، یا مؤول تو نہیں، مثلاً:

(۱) بخاری ومسلم دونوں نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی عورت سے جماع کرے مگر انزال نہ ہو تو صرف وضو کر لے اور شرم گاہ دھو لے۔(۲)

مگر اس پر کسی کا عمل نہیں ہے اور اس کو دوسری حدیث کی وجہ سے منسوخ مانا جاتا ہے اور خود غیر مقلد بھی اس حدیث پر عمل نہیں کرتے۔

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں نماز پڑھتے تھے کہ آپ (اپنی نواسی) حضرت اُمامہ بنتِ زینب کو اپنے اوپر اٹھا لیتے تھے

(۱) فتح القدیر:۱/۴۶۲

(۲) البخاري:۲۸۳، مسلم:۵۲۴

اور جب سجدہ کرتے تو ان کو اتار دیتے۔(۱)

بخاری و مسلم کے علاوہ نسائی، ابو داؤد، مسند احمد، وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔(۲)

مگر کیا اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ ہر آدمی کو نماز کے وقت اپنی نواسی کو کندھے پر سوار کرا کر نماز پڑھنا سنت ہے؟ اور کیا بخاری و مسلم کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے سارے غیر مقلدین اپنی اپنی نواسیوں کو یا کسی بچی کو نماز میں کندھے پر بٹھا لیتے ہیں؟

(۳) بخاری و مسلم دونوں حضرات نے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا۔(۳)

اور بخاری میں اس کے خلاف بیٹھ کر پیشاب کرنے کی کوئی حدیث نہیں ہے اور ابن ماجہ ترمذی و نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی تم سے بیان کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے؛ تو اس کی تصدیق نہ کرو۔(۴)

اب غور کرنا چاہئے کہ کیا صرف اس وجہ سے کہ پہلی حدیث بخاری و مسلم میں ہے؛ پیشاب کھڑے ہو کر کرنے کو سنت قرار دیا جائے گا؟ ہر گز نہیں، بل کہ اس میں تاویل کی جائے گی اور دوسری حدیث کو جو کہ دوسری کتب کی ہے ترجیح دی جائے گی؛ کہ اصل عادت تو آپ کی بیٹھ کر پیشاب کرنے کی تھی، کبھی کبھی کسی عذر سے یا بیان جواز

---

(۱) بخاری:۴۸۶،مسلم:۸۴۴

(۲) نسائی:۱۱۸۹، ابو داود :۷۸۲، مسند احمد:۲۱۴۸۱

(۳) البخاري :۲۱۷،۳۶۱،مسلم :۱۳۲،۱۴۰۲

(۴) الترمذي :۱۲،النسائي:۲۹،ابن ماجه:۳۰۳

کے لیے آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا ہے، اگر کوئی شخص اس تاویل کے بغیر صرف بخاری و مسلم کی حدیث کے ظاہر پر یہ حکم لگا دے کہ کھڑے ہو کر ہی پیشاب کرنا سنت رسول ہے تو یہ جفا و ظلم ہے۔

حاصل کلام یہ کہ کسی حدیث کے بخاری و مسلم میں ہونے سے اس کا صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کی اپنے مضمون پر دلالت اور دوسری حدیثوں سے اس کی تطبیق ترجیح، یا اس کا منسوخ ہونا یا مؤول ہونا وغیرہ امور ایک مستقل چیز ہے۔ اس لیے فقہ حنفی کو بخاری و مسلم کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔

کیا فقہ حنفی، ضعیف احادیث پر مبنی ہے؟

غیر مقلدین کے وسوسہ میں سے ایک وسوسہ یہ ہے کہ فقہ حنفی کو ضعیف احادیث پر مبنی قرار دیتے ہیں اس کا جواب امور ذیل میں درج ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ فقہ حنفی ضعیف حدیثوں پر مبنی ہے یا صحیح حدیثوں پر، اس کا فیصلہ تو وہ کر سکتا ہے جو فن حدیث سے واقف ہو اور اس میں درجہ امامت و اجتہاد پر فائز ہو اور یہ غیر مقلدین جن کو اردو کی کتاب بھی ٹھیک سے پڑھنا نہیں آتا اور بخاری و مسلم کی چند حدیثوں پر ناقص طور پر عمل کر کے اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں؛ اور فن حدیث سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں؛ ان کے کہنے اور فیصلہ کرنے کا کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے؟۔

(۲) اور ان کے مقابلہ میں ہمیشہ سے ساری دنیا کے علما و ائمہ امام ابوحنیفہ کی فقہ پر اعتماد کرتے آئے ہیں، اور تعریف و توصیف و توثیق و تصدیق فرمائی ہے، اگر ان کی فقہ ضعیف احادیث پر مبنی ہوتی تو یہ ائمہ و علما ان کی فقہ پر اعتماد اور اس کی تعریف و توثیق کیسے فرما سکتے ہیں؟

مثلاً مشہور محدث امام جرح وتعدیل حضرت یحیٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ہم جھوٹ نہیں بولتے، ہم نے امام ابوحنیفہ کی رائے سے بہتر کوئی رائے نہیں سنی اور ہم نے آپ کے اکثر اقوال کو اختیار کیا ہے۔ (۱)

اور امام شافعی رحمۃ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ''سارے لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے محتاج ہیں''۔ اور یحیٰ بن معین رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ''حضرت وکیع بن الجراح رحمۃ اللہ (جو امام شافعی کے استاذ اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں) امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے''۔ اور امام جعفر صادق نے فرمایا کہ ''ابوحنیفہ اپنے شہر کے سب سے بڑے فقیہ ہیں''۔ اور ابن معین نے فرمایا کہ ''میرے نزدیک قرأت تو حضرت حمزہ کی ہے اور فقہ امام ابوحنیفہ کی فقہ ہے اور میں نے لوگوں کو اسی پر پایا ہے''۔ اور محدث یزید بن ہارون نے فرمایا کہ ''میں نے ایک ہزار آدمیوں سے ملاقات کی ہے اور ان میں سے اکثر حضرات سے میں نے حدیث لکھی ہے، لیکن پانچ حضرات سے زیادہ فقیہ، عالم اور متقی میں نے کسی کو نہیں دیکھا، اور ان میں سے ابوحنیفہ اول نمبر پر ہیں''۔ (۲)

یہ سارے اقوال کتب اسماء الرجال میں درج ہیں؛ جن سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی فقہ پر علما وائمہ کا اعتماد ظاہر ہو رہا ہے، کیا ضعیف احادیث پر مبنی فقہ پر یہ فن حدیث کے ائمہ فن اسماء الرجال کے ماہرین، ایسا اعتماد ظاہر کر سکتے ہیں؟ اور کیا اس کے مطابق فتوی دے سکتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ غیر مقلدین کا فقہ حنفی کے خلاف یہ پروپگنڈا، محض جھوٹ پر مبنی ہے۔

---

(۱) تھذیب: ۱۰/ ۸، ۴۵۰

(۲) تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۶۸، تھذیب: ۱۰/ ۴۴۹، تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۰۰

(۳) تیسرے یہ کہ کسی حدیث کا صحیح یا ضعیف ہونا بھی ایک اجتہادی معاملہ ہے، اور اس میں بھی آراء کا اختلاف ہوسکتا اور ہوتا ہے۔ چناں چہ امام مسلم اور امام بخاری کے مابین بھی بعض احادیث میں اختلاف ہے کہ امام بخاری کے نزدیک ''عنعنہ'' والی حدیث میں راوی اور اس کے شیخ کا لقاء ثابت ہونا ضروری ہے محض معاصرت و امکان لقاء کافی نہیں ،مگر امام مسلم نے امام بخاری کے مسلک پر مقدمہ میں سخت تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ راوی اور اس کے شیخ کا محض معاصر ہونا اور دونوں میں لقاء کا امکان ہونا صحت حدیث کے لیے کافی ہے، اس طرح اور بھی بعض شرائط میں ائمۂ حدیث کا اختلاف ہے۔ نیز راوی کے بارے میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے، ایک محدث ایک راوی کو ثقہ قرار دیتا ہے؛ مگر وہ دوسرے محدث کے نزدیک ضعیف ہوتا ہے خود بخاری اور مسلم میں متعدد ایسے راوی ہیں جن کے بارے میں دوسرے محدثین نے جرح کی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث پر صحیح وضعیف ہونے کا حکم اجتہادی امر ہے؛ جس میں اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کسی روایت و حدیث کے امام بخاری یا دوسرے بعض ائمہ کے نزدیک ضعیف ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ تمام ائمہ کے نزدیک ضعیف ہو۔ ہوسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ احادیث صحیح ہوں، جن کو ضعیف کہا جارہا ہے جس طرح کہ دارقطنی کے نزدیک بخاری ومسلم کی متعدد احادیث ضعیف ہیں چناں چہ دارقطنی نے امام بخاری وامام مسلم کی ان احادیث پر ''استدراک'' لکھا ہے۔ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں۔ غرض یہ کہ غیر مقلدین کا یہ اعتراض یا وسوسہ کہ فقہ حنفی ضعیف احادیث پر مبنی ہے محض اٹکل اور نا قابل التفات ہے۔

(۴) ہاں ایک بات غور سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کسی باب میں کوئی صحیح حدیث

نہ ہو اور صرف ضعیف حدیث ہو تو امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ قیاس کے بہ جائے ضعیف حدیث ہی کو قبول فرما لیتے ہیں اور یہی مسلک امام احمد بن حنبل کا بھی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک رائے وقیاس سے اولی ہے اور اسی پر ان کا مذہب مبنی ہے۔ (۱)

نیز علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے اور اس میں تمام ائمہ ان کے ساتھ متفق ہیں (اعلام الموقعین ۱/ ۳۱) اور ابن حزم ظاہری نے بھی اپنی کتاب ''الاحکام فی اصول الاحکام'' (۷/۵۴) میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے اس مسلک کا ذکر کیا ہے۔

اندازہ کیجیے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ ضعیف احادیث کے ہوتے ہوئے بھی قیاس کو نہیں اختیار کرتے، چہ جائے کہ صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے قیاس کریں؟ معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ صحیح احادیث اور اگر صحیح احادیث نہ ہوں تو ضعیف احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر اس بات کو بگاڑ کر یوں تعبیر کرنا کہ فقہ حنفی کی بنیاد ضعیف حدیثوں پر ہے۔ محض تعصب وجہالت ہے۔

امام ابوحنیفہ کا علمی مقام

غیر مقلدین نے محض تعصب و عناد سے ایک وسوسہ یہ پیدا کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو قرآن وحدیث کا علم نہیں تھا اور یہ کہ ان کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں اور غیر مقلدین کے ایک مشہور عالم مولانا صدیق حسن خان بھوپالی نے تو حد ہی

(۱) اعلام: ۱/ ۷۷

کردی اور یہ لکھ دیا کہ ابوحنیفہ عربی زبان سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔(۱)

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض تعصب وعناد کی بنا پر ہے اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ہم نے اوپر ائمہ کبار سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی فقہ پر اعتماد اور اس کی تعریف وتوثیق نقل کی ہے اور یہ ائمہ بڑے بڑے محدثین اور جرح و تعدیل کے ماہرین تھے۔ اگر امام ابوحنیفہ کو علم نہ تھا حدیث سے واقفیت نہ تھی اور صرف سترہ حدیثیں ان کو یاد تھیں تو ان ائمہ نے ان کی اور ان کے فقہ کی تعریف و توثیق کیسے فرمادی؟

دوسرے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے قرآن وحدیث کے ماہر ہونے پر صراحت کے ساتھ ائمہ کرام کے اقوال کتب رجال وسیر میں موجود ومحفوظ ہیں ان کے ہوتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو قرآن وحدیث سے بے خبر کہنا انتہائی جسارت اور ائمہ اسلاف سے بدظنی اور ان کی شان میں گستاخی کے ساتھ ساتھ درپردہ اسماء الرجال کے مقدس علم سے اعتماد ختم کرنے کی ناپاک کوشش وسازش بھی ہے، آخر اسی فن اسماء الرجال کی بنا پر لوگ امام بخاری وامام مسلم اور دیگر محدثین کی جلالت و بزرگی اور ان کے علم وعمل اور قربانیوں وخدمات کو جانتے اور مانتے ہیں؟ اگر اسی علم کی بنا پر امام ابوحنیفہ کی بزرگیاں ثابت ہوں اور کوئی ان کو نہ مان کر ان کے خلاف غلط پروپگنڈا کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ علم اسماء الرجال کے خلاف سازش کررہا ہے۔
اب آیئے امام ابوحنیفہ کا علمی مقام انہی کتب سے معلوم کریں۔

امام شمس الدین الذہبی رحمۃ اللہ نے "تذکرۃ الحفاظ" چار جلدوں میں لکھی ہے اور اس میں ان کے بہ قول صرف ان لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جو "علم نبوی" کے حاملین

(۱) ابجد العلوم:۳/۱۰۰

ہیں جو عادل ومتقی ہیں اور احادیث کی توثیق وتضعیف اور تصحیح وتضعیف کے سلسلہ میں جن کے اجتہاد کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اس کتاب میں علامہ ذہبی نے علم نبوی (حدیث) کے ماہرین اور حدیث کی جانچ پرکھ کے سلسلہ میں قابل اعتماد بزرگوں کا تذکرہ لکھا ہے۔

اس تذکرۃ الحفاظ میں ''الامام ابوحنیفہ'' کا بڑے بلند الفاظ میں تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

كَانَ اِمَامًا وَرِعًا عَالِمًا عَامِلاً مُتَعَبِّدًا كَبِيْرَ الشَّانِ. (۲)

ذہبی اور دیگر حضرات نے نقل کیا ہے کہ مشہور محدث امام ابوداؤد نے فرمایا کہ اللہ ابوحنیفہ پر رحم کرے کہ وہ امام تھے۔(۳)

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے امام ابوحنیفہ کے مناقب میں مستقل رسالہ ''تبییض الصحیفه'' لکھا ہے اس میں خلف ابن ایوب رحمۃ اللہ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ علم، اللہ تعالی کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آیا پھر صحابہ کی طرف پھر تابعین کی طرف پھر ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کی طرف۔(۴)

عبداللہ بن داؤد الحربی نے فرمایا کہ اہل اسلام پر ضروری ہے کہ وہ اپنی نماز میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے لیے دعا کریں پھر انہوں نے امام ابوحنیفہ کے اس کارنامہ کا ذکر کیا کہ حدیث وفقہ کو محفوظ ومدون کیا۔(۵)

---

(۱) تذكرة الحفاظ:۱/۲

(۲) تذكرة:۱/۱۶۸

(۳) تذكرة:۱/۱۶۹

(۴) ابو حنيفه و اصحابه:۹

(۵) تاريخ بغداد:۱۳/۳۴۴، تهذيب الكمال :۲۹/۴۲۲

مکی بن ابراہیم وشداد بن حکیم نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔(۱)

یزید بن ہارون محدث رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ میں نے ایک ہزار آدمیوں سے ملاقات کی اوران میں سے اکثر سے حدیث لکھی؛ لیکن پانچ حضرات سے زیادہ فقہ میں؛علم اور تقویٰ میں کسی کو نہیں دیکھا اوران پانچ میں اول نمبر پر ابوحنیفہ ہیں۔(۲)

امام بخاری رحمۃ اللہ کے شیخ امام یحیٰ بن آدم رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے اپنے شہر کوفہ کی ساری حدیثیں جمع کر لی تھیں اورانہوں نے اس میں غور کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری وقت میں کس بات پر تھے یعنی آخری سنت کیا تھی؟

امام ابویوسف رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ میں جب بھی کسی حدیث کی طرف مائل ہوتا توابوحنیفہ کو صحیح حدیث کے بارے میں میرے سے زیادہ صاحب بصیرت پاتا۔(۳)

یہ سارے اقوال صاف بتارہے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے امام وعالم وفقیہ ومحدث تھے،فن حدیث میں مہارت رکھتے تھےاوراسماءالرجال کےفن کے بھی ماہر تھےاورآپ کی طرف اس فن میں رجوع کیا جاتا تھااس کے باوجود یہ کہنا کہ آپ کوحدیث کا علم نہ تھاانتہائی جہالت کی بات ہے پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپ نے ہزاروں احادیث سے انتخاب کرکے حدیث کی روایت کی ہے؛ اوروہ روایات مختلف کتب حدیث میں جمع ہیں۔نیز آپ کے شاگردوں نے اس مروی مجموعہ

---

(۱) تاریخ بغداد:۱۳/۳۴۵

(۲) جامع العلم :۱/۲۹، تاریخ بغداد: ۱۳/۳۶۳، تہذیب الکمال : ۲۹/۴۳۹

(۳) تاریخ بغداد ۱۳/۳۴۰

کو کتاب کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ جو ''مسند ابو حنیفه'' و ''کتا ب الآثار'' کے نام سے دنیا میں معروف ومشہور اور علما کے درمیان میں مستند ومتداول ہے، آخر میں ایک بات ابن خلدون مؤرخ کی نقل کر کے اس جواب کو ختم کرتا ہوں۔
وہ اپنے معرکۃ الآراء ''مقدمہ'' میں فرماتے ہیں:

''بعض بغض وعناد رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ مجتہدین میں سے بعض حدیث کے بارے میں قلیل البضاعت تھے، اسی لیے ان کی روایت حدیث کم ہوگئی مگر ائمہ کبار کے بارے میں اس اعتقاد کی کوئی گنجائش نہیں، کیوں کہ شریعت تو کتاب وسنت ہی سے اخذ کی جاتی ہے اور جو حدیث میں کم سرمایہ رکھنے والا ہو اس پر یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی طلب وجستجو میں لگے؛ تا کہ اصول صحیحہ سے دین حاصل کرے اور احکام کو ان کے اصل مبلغ سے حاصل کر سکے، اور امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللّٰهُ نے جو روایت کم کی ہے تو اس کی وجہ روایت اور اس کے تحمل کی شرائط میں ان کا سخت ہونا ہے، یہ نہیں کہ انہوں نے عمداً حدیث کی روایت ترک کردی تھی اور حدیث کے علم میں آپ کے کبار مجتہدین میں سے ہونے پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ علما کے درمیان آپ کے مذہب پر اعتماد وبھروسہ ہے اور رداً وقبولاً اس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللّٰهُ کے بارے میں یہ کہنا کہ آپ حدیث نہیں جانتے تھے غلط پروپگنڈہ ہے اور جھوٹ ہے۔
رہی یہ بات کہ آپ سے احادیث کی روایت کم ہوئی ہے، تو معلوم ہونا چاہیے

---

(۱) مقدمه ابن خلدون: ۴۴۴

کہ حدیث کا جاننا الگ بات ہے؛ اور روایت کرنا دوسری چیز ہے، ایک محدث حدیث جاننے کے باوجود روایت کرنے میں کمی کرسکتا ہے اور اس کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں، کون نہیں جانتا کہ تمام صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب و مصاحبت سب سے زیادہ حاصل تھی، اور تمام صحابہ میں علم و عمل کے لحاظ سے یہ حضرات سب سے فوقیت رکھتے تھے، مگر اس کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے صرف ایک سو بیالیس احادیث اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کل پانچ سو انچالیس احادیث مروی ہیں اور ان کے مقابلہ میں بعض اور صحابہ جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پانچ ہزار تین سو چونسٹھ احادیث مروی ہیں، وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو دیگر ذمے داریوں کی وجہ سے اس کے لیے فرصت نہ ملی کہ وہ احادیث روایت کریں؛ یا یہ کہ وہ روایت کرنے میں احتیاط برتتے تھے، یہی حال امام اعظم ابوحنیفہ کا تھا کہ ان کے یہاں حدیث کی روایت کے لیے سخت شرائط تھیں، تو احتیاطاً وہ کم روایت کرتے تھے اور یہ دراصل خوبی و کمال ہے نہ کہ عیب و نقص۔

کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حدیث میں ضعیف تھے؟

غیر مقلدین نے ایک وسوسہ لوگوں کے درمیان یہ پیدا کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ حدیث میں ضعیف تھے، غیر مقلد عالم مولانا صدیق حسن خان صاحب نے ''ابجد العلوم'' میں لکھا کہ ابوحنیفہ کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے؛ اور بات ایسی ہی ہے، جیسا کہ ان کے مذہب میں نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔(۱)

مگر یہ وسوسہ بھی بغض و عناد و تعصب کا نتیجہ ہے، کیوں کہ کتب اسماء رجال میں متعدد کبار ائمہ سے آپ کی توثیق و تعدیل اور حدیث میں ثقہ و قابل اعتماد ہونا اور

(۱) ابجد العلوم: ۳/۱۰۰

آپ کا حفظ حدیث میں جید ہونا صراحت سے مذکور ہے، یہاں چند حوالے پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) امام یحيٰ بن معین جوفن جرح وتعدیل کے امام ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ابوحنیفہ حدیث میں ثقہ (قابل اعتماد) تھے اور صرف وہی حدیث بیان کرتے تھے جو حفظ ہوتی اور جو حفظ نہ ہوتی تو بیان نہ کرتے۔ (۱)

(۲) امام ابن معین ہی نے ایک روایت میں فرمایا کہ ابوحنیفہ میں کوئی خرابی نہیں (لا باس بہ) (حوالہ سابق) اور ابن معین کی اصطلاح میں ''لا باس بہ'' توثیق کے لیے استعمال ہوتا تھا جیسا کہ اس فن سے مناسبت رکھنے والے جانتے ہیں۔ (۲)

(۳) ابن معین سے پوچھا گیا کہ ابوحنیفہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو فرمایا کہ وہ ثقہ ہیں، میں نے کسی کو ان کی تضعیف کرتے نہیں سنا، یہ شعبہ بن الحجاج ہیں جو ابوحنیفہ کو لکھتے ہیں کہ آپ حدیث بیان کریں اور اس کا حکم دیتے ہیں اور شعبہ تو شعبہ ہیں۔ (۳)

مطلب یہ کہ شعبہ جیسے محتاط محدث؛ جو کسی ضعیف سے روایت نہیں کرتے جب انہوں نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو حدیث بیان کرنے کا حکم دیا تو اس کا کیا وزن ہوگا، اندازہ کیا جائے۔

(۴) امام بخاری رحمۃ اللہ کے استاذ علی بن المدینی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ سے سفیان ثوری وابن المبارک نے روایت کیا ہے، اور وہ ثقہ تھے جن میں

---

(۱) تهذيب الكمال:۲۹/۴۲۴، تهذيب التهذيب۱۰/۴۴۹

(۲) تدريب الراوی:۱/۱۸۶،فتح المغيث :۱/۳۹۶

(۳) الإنتقاء:۱۲۷

کوئی خرابی نہیں۔(۱)

(۵) امام ابن لمبارک رحمۃ اللہ نے امام ابوحنیفہ کی توثیق وتعدیل فرمائی ہے، چناں چہ ابن عبد البر نے الانتقاء میں اپنی سند کے ساتھ اسماعیل بن داؤد سے نقل کیا ہے کہ امام ابن المبارک رحمۃ اللہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں، ہر خوبی بیان کرتے اور ان کی توثیق وتعدیل کرتے اور ان کی تعریف فرماتے۔(۲)

(۶) امام ابوداؤد نے فرمایا کہ اللہ ابوحنیفہ پر رحم کرے، وہ امام تھے۔(۳)

یہ امام ابوداؤد کی طرف سے امام ابوحنیفہ کی توثیق ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ کسی کے بارے میں ''امام'' کہنا بڑے اونچے درجہ کی توثیق ہے۔(۴)

(۷) امام شعبہ رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ابوحنیفہ ''جیّد الحفظ'' (اچھے حافظہ) والے ہیں۔(۵)

یہ بطور نمونہ چند کبار محدثین کے اقوال پیش کیے گئے ہیں؛ جن سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ ضعیف نہیں بل کہ ثقہ وقابل اعتماد تھے، حتیٰ کہ امام ابوداؤد نے لفظ امام کہہ کر آپ کی توثیق وتعریف کا حق ادا فرمادیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ حافظہ کے لحاظ سے بھی قابل اعتماد تھے، جیسا کہ امام شعبہ رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ آپ ''جید الحفظ'' تھے۔

ان ائمہ کبار کی توثیق وتعریف جو یہاں نقل کی گئی وہ محض نمونہ کے لیے ہے ورنہ

---

(۱) الجواهر المضیة:۱/۴۹

(۲) الانتقاء:۱۴۰

(۳) تذکرۃ الحفاظ :۱/۱۶۹

(۴) فتح المغیث:۱/۱۶۹

(۵) الخیرات الحسان بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن :۱/۱۹۸

بڑے بڑے محدثین وائمہ نے آپ کے فضائل ومناقب میں ضخیم کتابیں لکھی ہیں، جیسے:

(۱) امام ابن عبدالبر مالکی رحمۃ اللہ نے **الانتقاء**۔

(۲) امام ابن حجر مکی شافعی رحمۃ اللہ نے **الخیرات الحسان**۔

(۳) امام سیوطی شافعی رحمۃ اللہ نے **تبییض الصحیفۃ**۔

(۴) امام شمس الدین الذہبی رحمۃ اللہ نے ایک جزء ورسالہ۔

(۵) علامہ محمد بن یوسف صالحی شافعی رحمۃ اللہ نے **عقود الجمان فی مناقب النعمان**۔

لکھی، ان کے علاوہ ہزاروں کتب ورسالوں میں آپ کا تذکرہ موجود ہے اور آپ کی تعریف وتوصیف بیان کی گئی ہے۔

ہاں! بعض حضرات نے اس جلیل القدر وعظیم المرتبت امام کی تنقیص وتضعیف کی ہے؛ مگر اس کا کوئی وزن علمی دنیا نے نہیں مانا، بل کہ خود ان تنقیص کرنے والوں پر تنقید کی، کیوں کہ ان میں اکثر نے یا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے بارے میں صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے یا حسد کی وجہ سے کی ہے۔

چنانچہ عبداللہ بن داؤد محدث رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے بارے میں لوگ دو طرح کے ہیں، یا تو آپ کے مقام سے ناواقف ہیں یا آپ سے حسد کرنے والے ہیں۔(۱)

علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمۃ اللہ نے فرمایا:

''ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے جن محدثین نے روایت کی اور آپ کی توثیق

(۱) تہذیب الکمال: ۲۹/۴۴۱، تہذیب التہذیب: ۱۰/۴۵۰

کی وہ ان کے مقابلہ میں زیادہ ہیں جنہوں نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے۔(۱)

آخر میں علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمۃ اللہ کی یہ عبارت پیش کر کے، دعوت غور و فکر دیتا ہوں وہ فرماتے ہیں:

"وا لصحیح فی ھذاالباب ان من صحت عدالته و ثبتت فی العلم امانته و بانت ثقته وعنایته بالعلم ، لم یلتفت فیه الی قول احد الا ان یاتی فی جرحته ببینةٍ عادلةٍ."(۲)

(اس باب میں صحیح بات یہ ہے کہ جس کی عدالت صحیح طور پر ثابت ہو جائے اور علم میں اس کی امانت معلوم ہو جائے اور اس کی ثقاہت اور علم کے بارے میں اس کی عنایت ظاہر ہو جائے اس کے بارے میں کسی کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائیگی مگر یہ کہ اس کی جرح کے بارے میں وہ عادل گواہ پیش کرے۔)

اس عبارت میں غور کرنے کے بعد فیصلہ کیجئے کہ سیدنا الامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ جن کی ثقاہت وعدالت تواتر کے ساتھ ہر زمانہ وعلاقے میں معروف ومشہور رہی ہے؛ ان کو جہالت یا حسد یا سنی سنائی باتوں کی وجہ سے ضعیف کہنا ؛علمی دنیا میں کیا وزن رکھتا ہے؟

اگر کسی کے بارے میں محض جرح کا ہو جانا ، بلاتحقیق ، قابل قبول ہوتو پھر شاید ہی کوئی امام ومحدث جرح سے بچے گا؛ کیوں کہ ہر امام کے بارے میں کچھ نہ کچھ لوگ

(۱) جامع العلم:۲/۱۴۹

(۲) جامع العلم:۲/۱۸۶

کسی نہ کسی معقول یا غیر معقول وجہ سے جرح کرنے والے مل جائیں گے، حتیٰ کہ بعض حضرات نے امام بخاری رحمۃ اللہ کو مدلس کہہ کر اور بعض نے خلق قرآن کے قائل ہونے کا الزام لگا کر متروک قرار دیا ہے، ابن معین رحمۃ اللہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ کو ضعیف کہا ہے یہ سب امور اہل فن پر پوشیدہ نہیں، اگر ان باتوں کو قبول کر لیا جائے تو پھر کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔

ان سطور پر اپنی تحریر کو ختم کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالے عقل سلیم اور فہم سلیم عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقلید ائمہ، اجماع وقیاس کا شرعی حکم

امامِ حرم کا ایک اہم فتویٰ

یہاں تقلید ائمہ کرام واجماع وقیاس شرعی سے متعلق حرم مکی کے امام اور امور مسجد حرام ومسجد نبوی کے رئیس عمومی فضیلۃ الشیخ محمد عبداللہ السبیل حفظہ اللہ تعالیٰ کا ایک اہم وتفصیلی فتویٰ بھی درج ہے، تاکہ یہ بات لوگوں کے سامنے صاف طریقہ پر آجائے کہ غیر مقلدین کے مسلک میں؛ اور علماء عرب اور بالخصوص سعودی عرب کے علما اور حرم شریف کے ائمہ کے مسلک میں کتنا فرق ہے۔

جب کہ یہ غیر مقلدین اپنے مسلک کو علماء عرب وائمہ حرم کے مطابق کہہ کر عوام کو دھوکہ دیتے ہیں، یہ فتویٰ عربی میں ہے اس کا ترجمہ ماہنامہ ''دارالعلوم'' میں شائع ہوا ہے؛ اور عربی فتویٰ بھی اسی میں شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

فتویٰ

از: فضیلة الشیخ محمد بن عبد اللہ السبیل امام الحرمین الشریفین

سیکریٹریٹ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نمبر ۱۰-۲۹۶ مورخہ ۸/محرم ۱۴۱۶ھ

عنوان: سوالات کا جواب:

مکرم ڈاکٹر عدنان حکیم حفظہ اللہ تعالیٰ بواسطہ شیخ غلام بن عبدالحکیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے ۱۹/ ۷/ ۱۹۹۵ء کے مکتوب میں بعض سوالات کا جواب طلب کیا گیا ہے اس خط کے حوالہ سے فضیلۃ الشیخ محمد بن عبداللہ السبیل امور مسجد حرام ومسجد نبوی کے سربراہ کا مکمل جواب ارسال کرنے پر خوشی محسوس کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے۔

ڈاکٹر احمد مقری: مدیر "المجمع الفقھی الاسلامی"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزی ادارہ برائے امور مسجد حرام ومسجد نبوی
مملکت عربیہ سعودیہ
(ڈاکٹر عدنان حکیم کے سوالات کا جواب)

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے میں درود و سلام کہتا ہوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ہمارے آقا ہیں اور اس کے بندے اور رسول، نیز آپ کی آل پر اور تمام اصحاب پر۔

سوال: (۱) کیا صحابہ کرام، تابعین عظام، اور فقہا امت کا اجماع حجت شرعیہ ہے یا نہیں؟ اور کیا اجماع تشریع اسلام کا تیسرا ماخذ ہے یا نہیں؟ اجماع کے حجت ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اور بالکلیہ اجماع کے منکر کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بہ اتفاق علما؛ صحابہ کرام کا اجماع حجت شرعیہ ہے، اسی طرح تابعین اور فقہا کا اجماع بھی حجتِ شرعیہ ہے البتہ اس میں داؤد ظاہری نے اختلاف کیا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ غیر صحابہ کا اجماع حجت شرعیہ نہیں لیکن حجت ہونے کا قول صحیح

ہے کیوں کہ حجیت اجماع کے دلائل عام ہیں، صحابہ ﷺ غیر صحابہ سب کے اجماع کو شامل ہیں اس لیے صرف صحابہ کرام کے اجماع کو حجت کہنا سینہ زوری ہے، اس پر کوئی دلیل قائم نہیں! کتاب وسنت کے بعد اجماع کو تشریع اسلامی کے مآ خذ میں سے تیسرا مآ خذ تسلیم کیا گیا ہے۔

دلائل حجیت اجماع

جمہورِ علماء کے نزدیک اجماع حجت شرعیہ ہے اس پر عمل کرنا واجب ہے اس پر کتاب وسنت کے بہت سے دلائل ہیں ہم ان میں سے چند ایک ذکر کرتے ہیں۔

(۱) فرمان خداوندی ہے "﴿ومن يشاقق الرسول من بعد﴾ "(الآیۃ:) جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرتا ہے اور سبیل المومنین کے علاوہ کسی دوسرے راستہ پر چلتا ہے ہم اُس کو ادھر پھیر دیتے ہیں جدھر وہ پھرتا ہے اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ (النساء :۱۱۵)

اللہ تعالی نے سبیل المومنین کے ترک پر وعید فرمائی ہے اگر یہ حرام نہ ہوتا تو اس پر وعید نہ وارد ہوتی، اور اس وعید میں سبیل المومنین کے ترک کو اور مخالفت رسول کو جو حرام ہے جمع نہ کیا جاتا اور جب غیر سبیل المومنین کی اتباع حرام ہے تو سبیل المومنین کی اتباع واجب ہوگی اور اجماعی حکم سبیل المومنین ہے، لہٰذا اس کی اتباع واجب ہے۔

(۲) اور سنت سے دلیل یہ ہے کہ حضرت انس بن مالک ﷺ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالی نے میری امت کو یہ فرمایا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہی پر جمع نہ کرے گا۔ (۱)

(۱) الترمذي:۲۰۹۳

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہ کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو جماعت سے کٹا وہ آگ میں پڑا۔(۱)

ان سب احادیث کا اختلافِ الفاظ کے باوجود مفہوم ایک ہے، یعنی مجموعی طور پر امت کا خطا سے معصوم ہونا، اس سے ثابت ہوا کہ علما کا اجماع حجتِ شرعیہ ہے۔ ہمیشہ ان احادیث سے بغیر کسی ردوقدح کے پہلے صحابہ کرام پھر ان کے بعد والے علما عظام حجتِ اجماع کو ثابت کرتے رہے ہیں، تا آں کہ بعد میں مخالفینِ اجماع پیدا ہو گئے۔

منکرین اجماع کا حکم

اجماعِ قطعی کے منکر کے بارے میں علما کے تین قول ہیں:

(۱) مطلقاً اجماعِ قطعی کا انکار کفر ہے۔

(۲) مطلقاً اجماعِ قطعی کا انکار کفر نہیں۔

(۳) اگر اجماعی حکم کا دین میں سے ہونا امرِ قطعی ہو جیسے پانچ نمازیں تو اس کا انکار کفر ہے اور اگر اس کا دین میں ہونا امرِ قطعی نہ ہو تو اس کا انکار کفر نہیں، تاہم اجماع کی مخالفت جائز نہیں جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اجماع حجت شرعیہ ہے اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

سوال: (۲) قیاس کی بنیاد ظن پر ہے اور جس چیز کی بنیاد ظن پر ہو وہ ظنی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ظن کی اتباع سے منع فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''اور اس چیز کے پیچھے مت چل جس کا تجھے علم نہیں۔'' (الإسراء: ۳۶)

لہٰذا ''قیاس کے ساتھ حکم بتانا درست نہیں کیوں کہ یہ اتباعِ ظن ہے۔''

الجواب: قیاس ''فقہ اسلامی'' کے مآخذ میں سے چوتھا ماخذ ہے اور اس کی

---

(۱) ترمذي: ۲۰۹۳

حجیت کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے اس پر صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء امت نے قرنہا قرن عمل کیا ہے، جمہور علما کے نزدیک قیاس پر عمل کرنا واجب ہے جب کہ داود ظاہری اور ان کے پیرو کاروں نے اس کا انکار کیا ہے، انہوں نے کہا کہ قیاس حجت شرعیہ نہیں ہے، ان کے دلائل میں سے ایک دلیل وہی ہے جس کا آپ نے سوال میں ذکر کیا ہے؛ علما نے ان کے دلائل کے جوابات بھی دیئے ہیں، ہم مختصر طور پر بعض جواب ذکر کرتے ہیں؛ اور اگر آپ کو مزید وسعت درکار ہو تو کتبِ اصول فقہ کی طرف مراجعت کیجئے۔ مثلاً علامہ جوینی رحمہ اللہ کی " البرھان" امام رازی رحمہ اللہ کی" المحصول"،"الاحکام للآمدی "،" شروح مختصر ابن حاجب "، " اصول سرخسی "، اور عبدالعزیز بخاری رحمہ اللہ کی"کشف الاسرار" ان کتابوں میں منکرین قیاس کا تفصیلی رد ہے۔

بہ ہر کیف وہ آیات جن میں اتباع ظن سے نہی کی گئی ہے، ان کا قیاس شرعی سے کوئی تعلق نہیں نہ اس پر منطبق ہوتی ہیں کیوں کہ ان آیات میں جس چیز سے نہی کی گئی ہے؛ وہ ہے عقائد میں ظن کی اتباع۔ رہے احکامِ عملیہ سو ان کے اکثر دلائل ظنی ہیں اگر ہم اس شبہ کا اعتبار کرلیں تو ہمیں وہ تمام دلائل شرعیہ ترک کرنے پڑیں گے جو ظنی الدلالت ہیں اور یہ باطل ہے، رہا ان کا اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ سے استدلال سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے مقصود نہی ہے اس بات سے کہ کوئی انسان محل یقین میں امکانِ تیقن کے باوجود حصول یقین سے انحراف کرکے ظن وتخمین پر اعتماد کرے؛ پس یہ بھی قیاس شرعی کو شامل نہیں کیوں کہ فرع واصول کے درمیان علت جامعہ پائے جانے کی وجہ سے حکم کے اعتبار سے فرع کو اصل کے ساتھ لاحق کرنا اس حکم کے قبیل سے نہیں جس سے آیت میں منع کیا گیا

ہے، یعنی بغیر علم کے قول کرنا، کیوں کہ مجتہد اسی چیز کو اختیار کرتا ہے جو اس کے نزدیک راجح ہوتی ہے اور اس کا اجتہاد اس تک پہنچتا ہے۔

سوال: (۴) قیاس شرعی کے حجت ہونے کی کیا دلیل ہے؟

جواب: علما نے قیاس کی حجیت کو کتاب وسنت اور اجماع سے نیز عقلی دلیل سے ثابت کیا ہے، ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں اور اگر مزید دلائل معلوم کرنے کا ارادہ ہو تو ان کتب اصول کی طرف مراجعت کی جائے جن کا میں نے منکرین قیاس کے شبہات کے رد میں پہلے ذکر کیا ہے۔

کتاب اللہ سے دلیل فرمان الٰہی ہے۔﴿**هو الذی اخرج الذین کفروا من اهل الکتاب... الخ**﴾۔ اللہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں کافروں کو ان کے گھروں سے نکالا پہلے حشر کے وقت تمہارا گمان نہیں تھا کہ وہ نکلیں گے اور انہوں نے گمان کیا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ کے عذاب سے بچالیں گے سو ان پر اللہ کا عذاب ایسے طور پر آیا جس کا وہ گمان بھی نہیں رکھتے تھے اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا گیا وہ گراتے تھے اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور مؤمنین کے ہاتھوں، پس عبرت پکڑو اے ارباب بصیرت۔

محلِ استدلال اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿**فاعتبروا یا اولی الابصار**﴾ ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو اس عذاب کی خبر دی جو بنو نضیر پر نازل ہوا تو ان کو حکم دیا کہ وہ عبرت پکڑیں؛ اور الاعتبار، العبور سے مشتق ہے، اور العبور کا معنی ہے المجاوزۃ یعنی گذرنا مقصود یہ ہے کہ اپنے نفوس کو ان پر قیاس کرو کیوں کہ تم بھی ان جیسے بشر ہو اگر تم ان جیسے کام کرو گے تو تمہارے اوپر بھی وہی عذاب اتر پڑے گا جو ان پر اترا۔

پس یہ آیت تمام انواع اعتبار کو شامل ہے،اور جب قیاس میں فرع واصل کے درمیان موجود علت جامعہ کی وجہ سے فرع سے اصل کی طرف مجاوزت ہوتی ہے،تو یہ بھی اس اعتبار کے انواع میں داخل ہوگا جس کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے اور سنت سے دلیل یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو دریافت فرمایا کہ آپ کیسے فیصلہ کریں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا کتاب اللہ کے ساتھ،فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔آپ نے فرمایا: اگر آپ کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نہ ملے تو پھر؟ کہنے لگے میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا،اوراس میں کوتاہی نہ کروں گا،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پہ ہاتھ مارا اور فرمایا اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

اوراس کی بہت سے محققین نے تصحیح کی ہے۔وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کرنے میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے کتاب و سنت سے اجتہاد کی طرف منتقل ہونے کو درست قرار دیا ہے،اور قیاس بھی اجتہاد کے انواع میں سے ایک نوع ہے۔

علاوہ ازیں عمل بالقیاس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔اور ہر وہ امر جس پر صحابہ کرام کا اجماع ہو وہ حق ہے اس کا التزام واجب ہے اس کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف اپنا مشہور حکم نامہ تحریری طور پر بھیجا کہ اشباہ و نظائر کو پہنچانے اور امور میں اپنی رائے

کے ساتھ قیاس کیجئے (سنن کبری للبیهقی، الفقیه و المتفقه للخطیب)
عقلی دلیل یہ ہے کہ کتاب وسنت کی نصوص محدود اور متناہی ہیں اور لوگوں کو درپیش مسائل غیر متناہی ہیں کیوں کہ ہر زمان و مکان میں نئے مسائل ظہور پذیر ہوتے ہیں سوا گران کے احکام معلوم کرنے کے لیے کتاب وسنت کی نصوص پر قیاس نہ کریں تو وہ بغیر حکم شرعی کے باقی رہ جائیں گے اور یہ باطل ہے؛ کیوں کہ شریعت مقدسہ عام ہے اور تمام نئے پیش آمدہ مسائل کو شامل ہے: ہر ہر واقعہ کے لیے شریعت میں حکم موجود ہے اور مجتہدین پر لازم ہے کہ وہ استنباط کے قواعد معروفہ کے موافق استنباط کریں۔

سوال: (۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے جو درست اجتہاد کرے اس کے لیے دو اجر ہیں اور جو غلط اجتہاد کرے اس کے لیے ایک اجر ہے؟

جواب: اس سے مراد حاکم یا قاضی یا عالم مجتہد ہے، جب اس نے اجتہاد کیا اور اپنی ممکنہ استطاعت کسی مسئلہ کے حکم معلوم کرنے میں صرف کی؛ اس کے باوجود اس سے حکم میں غلطی ہوگئی تو وہ گنہ گار نہ ہوگا، بل کہ اپنے اجتہاد پر ماجور ہوگا اور اگر اس نے حق کو پالیا تو اس کے لیے دو گنا اجر ہوگا؛ ایک اجر اجتہاد پر دوسرا اصابتِ حق پر، بہ شرطے کہ وہ شرائط اجتہاد کا عالم و حامل ہو، اور اگر شرائط اجتہاد کا عالم و حامل نہ ہو اور محض تکلف کر کے اجتہاد کرے اور علم کا دعویٰ کرے تو یہ حدیث اس کو شامل نہیں۔

سوال: (۵) جب تمام فقہا مجتہدین کی آراء کسی واقعہ کے ایک حکم پر متفق ہوں تو کیا وہ قانون شرعی ہو جاتا ہے؟ کیا اس کی اتباع واجب ہے؟ یا اس کی مخالفت جائز ہے؟

جواب: جب تمام فقہا مجتہدین کسی واقعہ کے ایک حکم پر متفق ہو جائیں تو اس کو اجماع شمار کیا جاتا ہے جس کی مخالفت ناجائز اور اتباع واجب ہے اور جو اس اجماع

کی مخالفت کرتا ہے وہ اس وعید کی زد میں آتا ہے جس کو ہم نے حجیتِ اجماع کے دلائل میں ذکر کیا ہے۔

سوال: (۶) کیا احکام شرعیہ کے لیے قیاس کا چوتھے ماخذ کے طور پر اعتبار کیا جاتا ہے؟

جواب: کتاب وسنت اور اجماع کے بعد احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لیے قیاس چوتھا ماخذ ہے، اس کے ذریعے احکام شرعیہ معلوم کئے جاتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

> امام بخاری نے ''کتاب الاعتصام بالکتاب و السنه'' میں فرمایا ہے: ''مطلب یہ ہے کہ کسی کے لیے بچاؤ نہیں مگر کتاب اللہ میں یا سنت نبویہ میں یا علما کے اجماع میں جب کہ ان میں حکم موجود ہو پس اگر ان میں حکم موجود نہ تو پھر قیاس ہے۔ اس پر امام بخاری نے ترجمۃ الباب قائم کیا **باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و کیف معنی الدلالة و تفسیرھا**۔ یعنی یہ باب ہے ان احکام کے بیان میں جو دلائل سے معلوم کئے جاتے ہیں اور دلالت کیسے ہوتی ہے اور اس کی کیا تفسیر ہے؟(۱)

سوال: (۷) اس آدمی کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ سب سے پہلے شیطان نے قیاس کیا ہے؟

جواب: اگر قائل کی مراد ﴿ **انا خیر منه خلقتنی من نارو خلقته من طین** ﴾ والا قیاس ہے تو قائل کا یہ قول درست ہے کیوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حسن بصری اور ابن سیرین رحمہما اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا سب

(۱) الترمذي:۲۰۹۳

سے پہلے شیطان نے قیاس کیا اور غلط قیاس کیا۔ اور حکما نے کہا ہے اللہ کے دشمن نے غلط کہا؛ کیوں کہ اس نے آگ کو مٹی پر فضیلت دی؛ حالاں کہ وہ دونوں ایک درجہ میں ہیں کہ وہ دونوں بے جان مخلوق ہیں۔ اور اگر قائل کا مقصد قیاس شرعی کا انکار، ورد ہے اور اس پر طعن !تو یہ ناجائز ہے، کیوں کہ ماہرین علما کا اجماع ہے اخذ بالقیاس پر: اور اجماع کی مخالفت حرام ہے، جب کہ شاذ اقوال کا کوئی اعتبار نہیں۔

سوال: (۸) اسلامی شریعت میں ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید (یعنی تقلید شخصی) کا کیا حکم ہے؟

جواب: مسئلہ تقلید کے اعتبار سے مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں: (۱) مجتہدین یعنی وہ علماء جو دلائل سے مسائل مستنبط کرنے کی قدرت رکھتے ہیں ان کے لیے تقلید جائز نہیں بل کہ ان پر اجتہاد واجب ہے۔ (۲) عوام، یعنی وہ لوگ جو اجتہاد کی قدرت و اہلیت نہیں رکھتے؛ ان لے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید جائز ہے۔ اور تقلید سے مراد یہ ہے کہ فقہی مسائل میں دلیل جانے بغیر مجتہد کے قول کی اتباع کرنا۔ اس پر دلیل اللہ تعالی کا یہ قول ہے: "پس! پوچھو اہل علم سے اگر تم نہیں جانتے"۔ (الأنبیاء: ۷) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان زخمی صحابی کے مشہور واقعہ میں کہ "جب وہ نہیں جانتے تھے تو انہوں نے پوچھ کیوں نہ لیا: عاجز آدمی کے لیے بہ جز سوال کے کسی بات میں شفاء نہیں"۔

اور عامۃ الناس کو اجتہاد کا مکلّف بنانا متعذر رہے، کیوں کہ اجتہاد کا تقاضہ ہے کہ مجتہد میں خاص ذہنی صلاحیت ہو۔ علم میں پختگی ہو اور لوگوں کے احوال اور وقائع کی معرفت اور طلب علم اور اس پر صبر کی عادت؛ اور اگر سب لوگ ان شرائط کو پورا کرنے کے لیے ان کے حصول میں مشغول ہو جائیں تو کاروبار معیشت باطل ہو جائیں گے اور نظام دنیا درہم برہم ہو جائے گا۔

سوال: (۹) کیا یہ آیت کریمہ " اتخذو ا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ" ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی تقلید پر منطبق ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب: آیت سے مقصود یہ ہے کہ انہوں نے اپنے احبار کوارباب کی طرح بنالیا؛ کیوں کہ انہوں نے ان کی ہر چیز میں اطاعت کی، چناں چہ امام ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس حالت میں آیا کہ میری گردن میں سونے کی صلیب تھی؛ آپ نے فرمایا اے عدی! اس کو اتار پھینک۔ یہ بت ہے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے سورہ براءۃ کی یہ آیت تلاوت کی ﴿اتخذو احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ و المسیح بن مریم﴾ پھر فرمایا خوب سن لو وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے یہ اس کو حلال سمجھتے اور جب وہ ان پر کوئی چیز حرام کرتے تو یہ اس کو حرام سمجھتے۔ سو کہاں ائمہ اربعہ اور کہاں وہ احبار جو اللہ کی حرام کردہ چیز کو حلال قرار دیتے ہیں اور اللہ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیز کو حرام ٹھہراتے ہیں؟ اللہ کی پناہ!! اس بات سے کہ ائمہ اعلام کو؛ ان احبار جیسا سمجھا جائے کیوں کہ ان ائمہ نے شریعت اسلامیہ کی خدمت میں اپنی پوری قوت صرف کی اور اس میں اپنی زندگیاں لگادیں اور ان کے درمیان جو مسائل میں اختلاف ہے وہ درحقیقت اختلاف اجتہادات کی وجہ سے ہے۔ ان کا یہ اختلاف باعث اجر ہے۔ اور یہ کہنا کہ مذکورہ بالا آیت ائمہ اربعہ کو بھی شامل ہے جھوٹ ہے، بہتان ہے اس کا سبب جہالت عظیمہ ہے۔

سوال: (۱۰) کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید شرک وکفر کے زمرہ میں داخل ہے؟

جواب: ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید غیر مجتہد کے لیے جائز ہے اس کا کفر وشرک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ائمہ اربعہ حق اور دین حق کے داعی ہیں۔ انہوں نے اپنے نفوس کو علم شریعت کے سیکھنے سکھانے کے لیے وقف کر دیا۔ حتیٰ کہ اس علم کا بڑا حصہ پایا جس کی وجہ سے ان میں اجتہاد کی قدرت وصلاحیت پیدا ہوگئی۔ سو عامۃ المسلمین جو ان کے مقلد ہیں وہ راہ ہدایت اور راہ نجات پر ہیں انشاءاللہ۔

سوال: (۱۱) اور جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ مقلدین شرک اور کفر کرتے ہیں اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا یہ عقیدہ غلط ہے اس کی قطعاً کوئی بنیاد نہیں اور یہ عقیدہ دلالت کرتا ہے شریعت اسلامیہ سے بڑی جہالت پر کیوں کہ شریعت اسلامیہ نے کفر وایمان شرک وتوحید کے درمیان فرق کیا ہے ایسے شخص پر لازم ہے کہ وہ دین کا اتنا حصہ ضرور سیکھے جس کے ساتھ وہ شرک و کفر اور اجتہاد کے درمیان فرق کر سکے۔

سوال: (۱۲) کیا لوگ ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی تقلید کے محتاج ہیں یا نہیں ؟ اور جس مسئلہ میں نص نہ ہو اس میں تقلید گمراہی ہے یا نہیں؟

جواب: اس کا جواب ویسا ہی ہے جیسا ہم نے پہلے تفصیلاً لکھا ہے کہ غیر مجتہد محتاج ہے مجتہد کی طرف اور مجتہد کی تقلید خواہ غیر منصوص مسئلہ میں ہو یا نص کے سمجھنے میں ہو جائز ہے، یہ تقلید گمراہی کی طرف مفضی نہیں؛ بل کہ اس کا گمراہی سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے توفیق کا سوال ہے۔

فقط

(مولانا مفتی) محمد شعیب اللہ خان

احکام عید الاضحیٰ و قربانی

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
و خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : احکام عید الاضحیٰ وقربانی

مصنف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۲۸

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۷ھ مطابق اپریل ۲۰۱۶ء

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور

موبائل نمبر : 09634307336 \ 09036701512

ای میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

الفہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۂ تحقیق

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین

اما بعد: زیرِ نظر رسالہ حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ایک جامع تحریر ہے جو آپ کی کتاب ''جواہر الفقہ'' جلد اول میں شامل ہے۔ عید الاضحیٰ اور قربانی کے اہم اور ضروری مسائل و احکام اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ میں نے اس میں بعض ضروری مسائل کا اضافہ کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ترتیب بھی کر دی ہے اور چونکہ حضرتؒ نے اختصار کے پیشِ نظر مکمل حوالے درج کرنے کا اہتمام نہیں فرمایا تھا، اس لیے میں نے اس میں درج احکام و مسائل کے حوالے بھی لکھ دیے ہیں۔ امتیاز کے لیے اپنی تحریر کے شروع میں لفظ ''اضافہ'' اور آخر میں (م ش) لکھ دیا ہے۔ اللہ سے دعاء ہے کہ اللہ تعالے اس کو شرفِ قبول بخشے۔

آمین یا رب العالمین۔ فقط:

۲/ ذی الحجہ/ ۱۴۲۳

۴/ فروری/ ۲۰۰۳

محمد شعیب اللہ خان

(جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالے کی عبادت کے لیے عشرۂ ذی الحجہ سے بہتر کوئی زمانہ نہیں ۔ ان میں ایک دن کا روزہ ایک سال کے برابر اور ایک رات کی عبادت کرنا شبِ قدر کی عبادت کے برابر ہے۔ [1]

قرآن مجید میں سورۃ الفجر میں اللہ تعالے نے دس راتوں کی قسم کھائی ہے، وہ دس راتیں جمہور کے قول میں یہی عشرۂ ذی الحجہ کی راتیں ہیں، خصوصا نویں تاریخ یعنی عرفہ کا دن اور عرفہ اور عید کی درمیانی رات ان تمام ایام میں بھی خاص فضیلت رکھتے ہیں ۔ عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ کا کفارہ ہے اور عید کی رات میں بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہنا بہت بڑی فضیلت اور ثواب کا موجب ہے۔

اضافہ: مستحب ہے کہ ذی الحجہ کے چاند دیکھنے کے بعد عید کی نماز وقربانی کرنے تک قربانی کا ارادہ رکھنے والے بال اور ناخن نہ کاٹیں ۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی ذی الحجہ کا چاند دیکھے اور قربانی

---

(۱) ترمذی : ۶۸۹، ابن ماجہ : ۱۷۱۸

کرنے کی نیت رکھتا ہو تو وہ اپنے بالوں اور ناخنوں میں سے کچھ نہ کاٹے۔(۱)

تکبیر تشریق

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

عرفہ یعنی نویں تاریخ کی صبح سے تیرھویں تاریخ کی عصر تک ہر نماز کے بعد باآوازِ بلند ایک مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے۔فتویٰ اس پر ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے والے اور تنہا پڑھنے والے اس میں برابر ہیں۔اسی طرح مرد وعورت دونوں پر واجب ہے۔البتہ عورت باآوازِ بلند تکبیر نہ کہے۔(۲)

اضافه : اس تکبیر تشریق کا صرف ایک دفعہ پڑھنا احادیث سے ثابت ہے۔اس لیے صرف ایک مرتبہ پڑھنا چاہئے۔علامہ شامی نے ایک مرتبہ سے زائد پڑھنے کو خلافِ سنت قرار دیا ہے اس لیے احتیاط یہی ہے کہ ایک مرتبہ پڑھنے پر اکتفاء کیا جائے۔(۳)

تنبیہ: اس تکبیر کا متوسط بلند آواز سے کہنا ضروری ہے۔بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں، پڑھتے ہی نہیں یا آہستہ سے پڑھ لیتے ہیں، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

عیدالاضحیٰ کے روز یہ چیزیں مسنون ہیں

(۱) صبح کو سویرے اُٹھنا (۲) غسل و مسواک کرنا (۳) پاک صاف، عمدہ کپڑے

---

(۱) مسلم : ۳۶۵۴،ترمذی : ۱۴۴۳،نسائی : ۴۲۸۵،ابو داوٗد : ۲۴۰۹،ابن ماجه: ۳۱۴۱،احمد : ۲۵۲۶۹،دارمی: ۱۸۶۵(م ش)

(۲) در مختار مع شامی: ۶۱/۳

(۳) شامی: ۶۲/۳(م ش)

پہننا (۴) خوشبو لگانا (۵) عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا (۶) عید گاہ کو جاتے ہوئے تکبیر مذکور الصدر بآوازِ بلند پڑھنا۔ (۱)

نمازِ عید

نمازِ عید دو رکعت ہیں، مثل دوسری نمازوں کے، فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر رکعت کے اندر تین تین تکبیریں زائد ہیں۔ پہلی رکعت میں ''سبحانک اللھم'' پڑھنے کے بعد قرأت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے ان زائد تکبیروں میں کانوں تک ہاتھ اُٹھانا چاہئے۔ پہلی رکعت میں دو تکبیروں میں سے ہر تکبیر پر ہاتھ چھوڑ دیں، اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں، دوسری رکعت میں تینوں تکبیروں میں سے ہر تکبیر پر ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، اور چوتھی تکبیر کے ساتھ رکوع میں چلے جائیں، نمازِ عید کے بعد خطبہ سننا سنت ہے۔

قربانی

قربانی ایک اہم عبادت ہے اور شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا، مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے، اسی طرح آج تک بھی دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ بتوں کے نام پر یا مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں۔ '' سورۂ انا اعطیناک'' میں اللہ تعالے نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی، قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہئے۔

'' فصل لربک و انحر'' کا یہی مفہوم ہے۔ دوسری ایک آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے ﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ

(۱) در مختار مع شامی : ۵۹/۳، عالمگیری: ۱۵۰/۱

وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعدِ ہجرت دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا، ہر سال برابر قربانی کرتے تھے۔ (۲)

جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظّمہ کے لیے مخصوص نہیں۔ ہر شخص پر ہر شہر میں بعدِ تحقق شرائط واجب ہے۔ (یہ شرائط آگے مذکور ہیں :م ش)اور مسلمانوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے، اسی لیے جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک قربانی واجب ہے۔ (۳)

اضافہ: قربانی کی فضیلت اور حکم

قربانی کے بڑے فضائل آئے ہیں۔ایک حدیث میں ہے کہ حضرت زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضراتِ صحابہ نے عرض کیا کہ

”یارسول اللّٰہ ! ما هذه الاضاحی ؟ قال : سنة ابیکم ابراهیم. قالوا: فما لنا فیها یا رسول اللّٰہ؟ قال بکل شعرة حسنة ، قالوا : فالصوف ؟ قال : بکل شعرة من الصوف حسنة“.

(یعنی حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ فرمایا کہ تمہارے باپ ابراھیم کی سنت ہے عرض کیا کہ اس میں ہم کو کیا ملے گا؟ فرمایا کہ ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی۔عرض کیا کہ پھر اُون کے

(۱) تفسیر ابن کثیر : ۲۰۲/۲،تفسیر طبری : ۳۲۰/۵

(۲) ترمذی: ۱۴۲۷،احمد : ۴۷۱۵

(۳) شامی: ۶۲/۳

بدلہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اُون کے ہر بال کے بدلہ ایک نیکی ملے گی)(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی آدمی قربانی کے دنوں میں جانوروں کے خون بہانے سے زیادہ کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو اللہ کو زیادہ پسند ہو، اور وہ آدمی قیامت کے دن اس جانور کی سینگوں اور بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور اس کا خون اللہ کے نزدیک زمین پر گرنے سے پہلے مقبول ہو جائے گا، لھذا ان قربانی کے جانوروں کو اچھی طرح پالو۔(۲)

قربانی کا حکم کیا ہے؟

اس میں ائمہ کا اختلاف ہے امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ کے نزدیک قربانی سنتِ مؤکدہ ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک واجب ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اللہ تعالے نے اس کا حکم دیا ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ احادیث میں اس کی تاکید آئی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس وسعت ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہمارے عیدگاہ میں نہ آئے۔(۳)

قربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟

(۱) قربانی ہر مسلمان عاقل بالغ مقیم پر واجب ہوتی ہے۔ جس کی ملک میں ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجاتِ اصلیہ سے زائد موجود ہو۔ یہ مال خواہ سونا چاندی یا اس کے زیورات ہوں یا مالِ تجارت یا ضرورت

---

(۱) ابن ماجہ: ۳۱۱۸، احمد: ۱۸۴۸۰

(۲) ترمذی: ۱۴۱۳، ابن ماجہ: ۳۱۱۷

(۳) ابن ماجہ: ۳۱۱۴، احمد: ۷۹۲۴ (م ش)

سے زائد گھریلو سامان یا مسکونہ مکان سے زائد کوئی مکان وغیرہ ہو۔ (۱)

اضافہ: مثلاً ایک شخص کے پاس دو مکان ہیں، ایک میں خود رہتا ہے اور دوسرا خالی ہے یا کرایے پر دیا ہوا ہے تو اس شخص پر قربانی واجب ہے، البتہ اس کا ذریعۂ معاش یہی مکان ہے تو چونکہ یہ مکان اس کی ضروریات میں داخل ہے اس لیے اس پر قربانی واجب نہ ہوگی۔ (۲)

اسی طرح کسی کے پاس دو گاڑیاں ہوں، ایک استعمال کے لیے اور ایک زائد تو اس پر بھی قربانی واجب ہے۔ (۳)

نیز اوپر کے مسئلہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت پر بھی اگر وہ مالکِ نصاب ہے تو قربانی واجب ہے۔ (۴)

اور اس کا ادا کرنا خود عورت کی ذمہ داری ہے۔ اکثر عورتیں اس سے غافل ہیں، اور یہ سمجھتی ہیں کہ زکوۃ وقربانی کا تعلق صرف مردوں سے ہے ہم سے نہیں، حالانکہ یہ بات سو فی صد غلط ہے، اس لیے عورتوں کو بھی قربانی دینا چاہئے، ہاں اگر اپنے پاس رقم نہ ہو تو اپنے میاں سے کہکر ان کے ذریعہ ادا کرنا چاہئے۔ اور مرد نے عورت کی اجازت کے بغیر اپنی طرف سے خود عورت کی قربانی کر دی تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک جائز نہیں اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے قول میں استحسانا جائز ہے۔ (۵)

---

(۱) شامی: ۹/۴۵۷، عالمگیری: ۵/۲۹۲

(۲) آپکے مسائل اوران کا حل: ۴/۱۰۶ (م ش)

(۳) آپکے مسائل اوران کا حل: ۴/۱۰۶ (م ش)

(۴) در مختا رمع شامی: ۹/۴۵۳ (م ش)

(۵) شامی: ۹/۴۵۷، عالمگیری: ۵/۲۹۳ (م ش)

ایک اہم انتباہ

اوپر کے مسئلہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر اس مسلمان پر قربانی واجب ہے جو عاقل بالغ اور حاجات اصلیہ سے زائد مذکورہ مالیت کا مالک ہو، بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ پورے گھرانے کی طرف سے ایک جانور قربان کردیتے ہیں یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اگر مثلاً ایک گھر میں پانچ بھائی رہتے ہوں اور سب کے سب عاقل بالغ اور مالدار ہوں تو سب کو الگ الگ اپنی طرف سے قربانی کرنا چاہیے۔(م ش)

ایک اور وضاحت

ایک اور بات بھی اس جگہ واضح کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قربانی شادی ہونے کے بعد سے لاگو ہوتی ہے، اس لیے بہت سے وہ نوجوان جو اچھی خاصی کمائی کرتے ہیں اور خوب مال جمع بھی رکھتے ہیں، وہ قربانی نہیں کرتے؛ کیوں کہ ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، یاد رہے کہ قربانی اور زکوۃ کے مسئلہ کو شادی شدہ ہونے اور نہ ہونے سے کچھ تعلق نہیں۔(م ش)

(۱) جس شخص پر قرض ہو، اگر قرض کو وضع کرنے کے بعد اس کے پاس اتنا مال بچا رہے جو نصاب (جس کا اوپر ذکر کیا گیا) کے برابر ہو، تو اس پر قربانی واجب ہے، ورنہ نہیں۔(م ش)

(۲) قربانی کے معاملہ میں اس مال پر سال بھر گذرنا بھی شرط نہیں۔[۱]

(۳) بچہ اور مجنون کی ملک میں اگر اتنا مال ہو تو بھی اس پر اس کی طرف سے اس کے ولی پر قربانی واجب نہیں۔ اسی طرح جو شخص شرعی قاعدہ کے موافق مسافر ہو اس پر بھی قربانی لازم نہیں۔[۲]

---

(۱) عالمگیری :۱/۱۹۱،در مختار مع شامی :۹/ ۴۵۷

(۲) شامی:۹/ ۴۵۷،عالمگیری:۵/۲۹۲

اضافہ: البتہ باپ پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے قول کے مطابق مستحب ہے کہ اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے بھی قربانی کردے۔(۱)

(۴) جس شخص پر قربانی واجب نہ تھی اگر اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا تو اس کی قربانی واجب ہوگئی۔(۲)

قربانی کے دن

قربانی کی عبادت صرف تین دن کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے دنوں میں قربانی کی کوئی عبادت نہیں۔ قربانی کے دن ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخیں ہیں، اس میں جب چاہے قربانی کرسکتا ہے، البتہ پہلے دن کرنا افضل ہے۔(۳)

اضافہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قربانی یوم الاضحیٰ (عید کے دن اور) اس کے بعد دو دن ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔(۴)

قربانی کے بدلہ میں صدقہ وخیرات

اگر قربانی کے دن گزر گئے، ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہیں کرسکا تو قربانی کی قیمت فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔(۵)

لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانوروں کی قیمت صدقہ کردینے سے یہ واجب

---

(۱) شامی: ۹/۴۵۷، عالمگیری: ۵/۲۹۲ (م ش)

(۲) شامی: ۹/۴۶۵، عالمگیری: ۵/۲۹۱

(۳) عالمگیری: ۵/۲۹۵

(۴) موطا مالک: ۹۲۳ (م ش)

(۵) در مختار مع شامی: ۹/۴۵۷، بدائع: ۴/۲۰۲

ادا نہ ہوگا۔(۱)

بلکہ وہ ہمیشہ گنہ گار رہے گا؛ کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا، ایسے ہی صدقہ خیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشادات اور تعامل اور پھر تعاملِ صحابہ اس پر شاہد ہیں۔

اضافہ: بعض لوگ شریعت سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ کہا کرتے ہیں کہ قربانی کی جگہ اگر ان جانوروں کی قیمت غریبوں میں بانٹ دی جائے تو غریبوں کا زیادہ فائدہ ہوگا مگر یہ جہالت کی بات ہے ایک تو اس لیے کہ اللہ کی شریعت میں کسی کو اختیار نہیں کہ اس میں ردو بدل کرے دوسرے اس وجہ سے کہ قربانی کا مقصد غریبوں کی مدد نہیں ہے اس کے لیے تو شریعت نے زکوٰۃ اور صدقات کا ایک مکمل نظام بنایا ہے بلکہ اس کا مقصد اللہ کی محبت کا مظاہرہ ہے جیسا کہ حضرت ابراھیم وحضرت اسماعیلؑ نے اس کا مظاہرہ فرمایا تھا۔ اس لیے قربانی میں جانوروں کے ذبح کرنے کو ان ایام کی سب سے زیادہ پسندیدہ عبادت قرار دیا گیا ہے۔ (م ش)

قربانی کا وقت

(۱) جن بستیوں یا شہروں میں نمازِ جمعہ وعیدین جائز ہے وہاں نمازِ عید سے پہلے قربانی جائز نہیں۔ اگر کسی نے نماز سے پہلے قربانی کر دی تو اس پر دوبارہ قربانی لازم ہے۔ البتہ چھوٹے گاؤں جہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں نہیں ہوتیں یہ لوگ دسویں تاریخ کی صبح صادق کے بعد قربانی کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی اگر کسی عذر کی وجہ سے نمازِ عید پہلے دن نہ ہو سکے تو نمازِ عید کا وقت گذر جانے کے بعد قربانی درست ہے۔(۲)

(۱) عالمگیری:۵/۲۹۳

(۲) در مختار مع شامی : ۹/۴۶۱، عالمگیری:۵/۲۹۵، البحر الرائق : ۸/۳۲۱

اضافہ: (۲) اگر قربانی کرنے والا خود شہر میں ہو اور اپنی قربانی کا جانور گاؤں دیہات میں بھیج دے تو اس کی قربانی وہاں صبح صادق کے فوراً بعد کی جاسکتی ہے، اور اگر قربانی کرنے والا گاؤں میں ہو اور اس کی قربانی شہر میں دی جائے تو ضروری ہے کہ نمازِ عید کے بعد ہی قربانی کی جائے عید کی نماز سے پہلے جائز نہیں، حاصل یہ ہے کہ قربانی کا جانور جس جگہ ہو اس کا اعتبار ہے، قربانی کرنے والا جہاں چاہے رہے۔ (۱)

(۳) قربانی رات کو بھی جائز ہے مگر بہتر نہیں۔ (۲)

قربانی کا جانور

اضافہ: (۱) قربانی میں صرف درج ذیل جانوروں کی قربانی جائز ہے: بکرا، بکری، دنبہ، بھیڑ، گائے، بیل، اُونٹ، اُونٹنی، بھینس، بھینسا، ان کے علاوہ کسی اور جانور کا قربانی میں دینا جائز نہیں۔ (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو مرغی کی قربانی کرتے ہیں یہ جائز نہیں، اور اس سے قربانی ادا نہیں ہوتی۔ (م ش)

(۲) ان جانوروں میں سے جو وحشی (جنگلی) ہوں، ان کی قربانی بھی جائز نہیں۔ (۴)

(۳) بکرا، دنبہ، بھیڑ، ایک ہی شخص کی طرف سے قربانی کیا جاسکتا ہے۔ گائے، بیل، بھینس، اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ایک کافی ہے بشرطیکہ سب کی نیت

---

(۱) شامی: ۹/۴۶۱ (م ش)
(۲) شامی: ۹/۴۶۳، عالمگیری: ۵/۲۹۵
(۳) عالمگیری: ۵/۲۹۷، بحر الرائق: ۸/۳۲۴ (م ش)
(۴) عالمگیری: ۵/۲۹۷، بحر الرائق: ۸/۳۲۴ (م ش)

ثواب کی ہو، کسی کی نیت محض گوشت کھانے کی نہ ہو۔(۱)

اضافہ: اس سے معلوم ہوا کہ محض گوشت کھانے کی نیت سے اگر کوئی شریک ہو جائے تو نہ اس کی قربانی ہوتی ہے اور نہ دیگر حصہ داروں کی قربانی ہوتی ہے، اس لیے قربانی میں دوسروں کو شریک کرنے میں بڑی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔(م ش)

(۴) اگر کوئی قربانی میں شریک ہونے والا غیر مسلم ہو، جیسے عیسائی، ھندو، تو کسی کی بھی قربانی جائز نہ ہوگی، اسی طرح شیعہ بھی چونکہ کافر ہیں، اس لیے ان کو شریک کر نے سے بھی کسی کی قربانی ادا نہ ہوگی۔(۲)

(۵) اگر قربانی کا جانور خریدنے سے پہلے ہی یہ نیت ہو کہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرنا ہے تو بہتر ہے، اور اگر جانور خرید لیا پھر یہ ارادہ ہوا کہ دوسروں کو اس میں شریک کیا جائے تو اس میں بعض علماء نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر وہ آدمی مالدار ہے تو اس کے لیے اس طرح دوسروں کو اس میں شریک کرنا درست ہے اور اگر وہ غریب ہے تو چونکہ غریب آدمی کے جانور خرید لینے سے اس جانور کی قربانی اس پر واجب ہو جاتی ہے اس لیے اس کو اس میں دوسروں کو شریک کرنے کی اجازت نہیں، اور بعض نے اس مسئلہ میں مالدار اور غریب دونوں کے لیے ایک ہی حکم بیان کیا ہے۔ تاہم خریدنے کے بعد شریک کرنا کراہت سے خالی نہیں۔(۳)

(۶) بکرا بکری ایک سال کا پورا ہونا ضروری ہے، بھیڑ اور دنبہ اگر اتنا فربہ اور تیار ہو کہ دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ گائے، بیل بھینس دو سال

---

(۱) عالمگیري:۲۹۷/۵

(۲) شامي: ۴۷۲/۹، عالمگیري:۳۰۴/۵، احسن الفتاوی: ۵۰۹/۷(م ش)

(۳) شامي: ۴۵۹/۹، عالمگیري:۳۰۴/۵(م ش)

کی، اور اونٹ پانچ سال کا ہونا ضروری ہے، ان عمروں سے کم کے جانور قربانی کے لیے کافی (وجائز) نہیں۔ (۱)

اضافہ: (۷) اگر ایک شریک قربانی کی نیت کرے اور دوسرا عقیقہ یا ولیمہ یا اور کسی قربت کی نیت کرے تو جائز ہے۔ (۲)

(۸) اگر جانوروں کا فروخت کرنے والا پوری عمر بتاتا ہو اور ظاہری حالات سے اس کے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی تو اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

(۹) خصی بکرے (جس کے فوطے نکالدئے گئے ہوں) کی قربانی جائز بلکہ افضل ہے۔ (۳)

اضافہ: (۷) بکرے، بکری کی قربانی کرنا، گائے وغیرہ کا ایک حصہ دینے سے افضل ہے۔ (۴)

(۸) قربانی کا جانور عمدہ سے عمدہ اور خوب موٹا تازہ اور تمام عیوب ظاہرہ سے پاک ہونا افضل ہے۔ (۵)

قربانی کا جانور ایسا نہ ہو

(۱) جس جانور کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں یا بیچ میں سے ٹوٹ گیا ہو اس کی قربانی جائز ہے، ہاں سینگ جڑ سے اُکھڑ گیا ہو جس کا اثر دماغ پر ہونا لازم ہے تو

---

(۱) شامی: ۹/ ۴۶۵، عالمگیری: ۵/ ۲۹۷، بحر الرائق: ۸/ ۳۲۵

(۲) شامی: ۹/ ۴۷۲، عالمگیری: ۵/ ۳۰۴ (م ش)

(۳) درمختار مع شامی: ۹/ ۴۶۷، عالمگیری: ۵/ ۲۹۹، بحر الرائق: ۸/ ۳۲۳

(۴) درمختار: ۹: ۴۶۶ (م ش)

(۵) عالمگیری: ۵/ ۳۰۰، شامی: ۹/ ۴۶۸ (م ش)

اس کی قربانی درست نہیں ہے۔(۱)

(۲) اندھے، کانے، لنگڑے جانور کی قربانی درست نہیں۔ اسی طرح ایسا مریض اور لاغر جانور جو قربانی کی جگہ تک اپنے پیروں سے نہ جاسکے اس کی قربانی بھی جائز نہیں ہے۔(۲)

(۳) جس جانور کا تہائی سے زیادہ کان یا دم وغیرہ کٹی ہوئی ہو اس کی قربانی جائز نہیں۔(۳)

(۴) جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں یا اکثر نہ ہوں، اس کی قربانی جائز نہیں۔(۴)

اضافہ: عالمگیری میں صحیح اس کو قرار دیا ہے کہ اگر بے دانت والا جانور چارہ کھالیتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔(۵)

(۵) اسی طرح جس جانور کے کان پیدائشی طور پر بالکل نہ ہوں، اس کی قربانی درست نہیں۔(۶)

اضافہ: اور اگر ایک کان پورا کٹ گیا ہو تو اس کی قربانی بھی جائز نہیں۔(م ش)

(۶) جو جانور خارش ہونے کی وجہ سے دبلا ہو گیا ہو، اس کی قربانی جائز نہیں اور اگر دبلا نہ ہوا ہو تو جائز ہے۔(۷)

---

(۱) شامی: ۹/ ۴۶۷، عالمگیری: ۵/ ۲۹۷، بحر الرائق: ۸/ ۳۲۳

(۲) درمختار مع شامی: ۹/ ۴۶۸، عالمگیری: ۵/ ۲۹۷، بحر الرائق: ۸/ ۳۲۳

(۳) درمختار مع شامی: ۹/ ۴۶۸، عالمگیری: ۵/ ۲۹۸، بحر الرائق: ۸/ ۳۲۳

(۴) درمختار مع شامی: ۹/ ۴۶۸، عالمگیری: ۵/ ۲۹۸

(۵) عالمگیری: ۵/ ۲۹۸(م ش)

(۶) عالمگیری: ۵/ ۲۹۸، شامی: ۹/ ۴۶۹

(۷) عالمگیری: ۵/ ۲۹۷(م ش)

(۷) اگر جانور کے تھن سوکھ گئے ہوں یا کٹ گئے ہوں یا جانور اپنے بچے کو دودھ پلانے پر قادر نہ ہو تو ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں۔(۱)

(۸) اگر جانور صحیح سالم خریدا تھا پھر اس میں کوئی عیب مانعِ قربانی پیدا ہو گیا تو اگر خریدنے والا غنی صاحبِ نصاب نہیں ہے، تو اس کے لیے اسی عیب دار جانور کی قربانی جائز ہے اور اگر یہ شخص غنی صاحبِ نصاب ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس جانور کے بدلہ دوسرے جانور کی قربانی کرے۔(۲)

قربانی کا مسنون طریقہ

(۱) اپنی قربانی کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے۔ اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے۔(۳)

اضافہ: احادیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے ہاتھ سے قربانی فرمایا کرتے تھے۔(۴)

نیز حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (قربانی کے موقعہ پر) فرمایا کہ اُٹھ اور اپنی قربانی میں حاضر ہو؛ کیونکہ اس کے اول قطرہ پر تیرے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔(۵)

(۲) قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں۔

---

(۱) شامی: ۹/۴۶۹، عالمگیری: ۵/۲۹۸ وغیرہ (م ش)

(۲) در مختار مع شامی: ۹/۴۷۱، عالمگیری: ۵/۲۹۹

(۳) بحر الرائق: ۸/۳۲۸

(۴) دیکھو: مسلم: ۳۶۳۷، مسند احمد: ۲۳۳۵، ابو دائود: ۲۴۱۰ (م ش)

(۵) مسند الرویانی: ۱/۱۳۴ (م ش)

البتہ ذبح کرنے کے وقت ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکۡبَرُ﴾ کہنا ضروری ہے۔

(۳) سنت ہے کہ جب جانور کو ذبح کرنے کے لئے رو بہ قبلہ لٹائے تو یہ آیت پڑھے:

﴿اِنِّیۡ وَجَّھۡتُ وَجۡھِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَ مَا اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ، اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ﴾

اور ذبح کرنے کے (پہلے یا) بعد یہ دعاء پڑھے:

﴿اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلۡہُ مِنِّیۡ کَمَا تَقَبَّلۡتَ مِنۡ حَبِیۡبِکَ مُحَمَّدٍ وَّ خَلِیۡلِکَ اِبۡرَاھِیۡمَ عَلَیۡھِمَا السَّلَامُ﴾ (۱)

اضافہ: حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی دعاء کے بعد ﴿اللھم لک و منک عن محمدو عن امتہ﴾ (اے اللہ یہ قربانی محمد اور ان کی امت کی جانب سے تیرے لئے ہے اور تیری ہی طرف سے عطا کردہ ہے) کے الفاظ ہیں۔

اس لیے اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں: اللّٰھم لک و منک عن فلان، اور "فلان" کی جگہ قربانی کرنے والے کا نام لیا جائے۔ (م ش)

آدابِ قربانی

(۱) قربانی کے جانور کو چند روز پہلے سے پالنا افضل ہے۔ (۲)

(۲) قربانی کے جانور کا دودھ نکالنا یا اس کے بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کسی نے

---

(۱) ابن ماجہ: ۳۱۱۲، ابو داود: ۲۷۹۵، احمد: ۱۴۴۹۱، دارمی: ۱۸۶۴

(۲) عالمگیری: ۵/۳۰۰، بدائع: ۴/۲۱۹

ایسا کرلیا تو دودھ اور بال یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔(۱)

(۳) قربانی سے پہلے چھری کو خوب تیز کریں۔(۲)

اضافہ: چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ہر چیز میں احسان کو ضروری قرار دیا ہے، لھذا اگر تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو اور ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو۔(۳)

اضافہ: جانور کو لٹانے کے بعد یا اس کے سامنے چھری تیز کرنا بھی منع ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ جانور کو لٹا کر اس کے سامنے چاقو تیز کر رہا ہے آپ نے فرمایا: کیا تو اس کو دو موتیں مارنا چاہتا ہے، تو نے اس کو لٹانے سے پہلے ہی چاقو کیوں نہیں تیز کر لی؟(۴)

(۴) ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کریں۔

اضافہ: (۵) جانور کے پیر پکڑ کر قربان گاہ کی طرف کھینچ کر لیجانا یا اور کوئی ایسا کام کرنا جس سے جانور کو اذیت پہنچے، مکروہ ہے، اس لیے ایسی باتوں سے بچنا چاہئے۔(۵)

(۶) ذبح کے بعد کھال اُتارنے اور گوشت کے ٹکڑے کرنے میں جلدی نہ کرے جب تک پوری طرح جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے۔(۶)

---

(۱) بدائع: ۴/۲۱۹، عالمگیری: ۵/۳۰۰

(۲) درمختار مع شامی: ۹/۴۲۶(۴)

(۳) مسلم: ۳۶۱۵، ترمذی: ۱۳۲۹، نسائی: ۴۳۲۹، ابوداؤد: ۲۴۳۲ ابن ماجہ: ۳۱۶۱، احمد: ۱۶۴۹۰(مش)

(۴) حاکم: ۴/۲۳۳(مش)

(۵) عالمگیری: ۵/۲۸۷و۲۸۸، بدائع: ۴/۲۱۹(مش)

(۶) درمختار مع شامی: ۹/۴۲۶، بدائع: ۵/۲۲۳

متفرق مسائل

(۱) عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں لیکن جس شہر میں کئی جگہ نمازِ عید ہوتی ہو تو شہر میں کسی جگہ بھی نمازِ عید ہوگئی تو پورے شہر میں قربانی جائز ہو جاتی ہے۔ (۱)

(۲) قربانی کے جانور کے اگر ذبح سے پہلے بچہ پیدا ہو گیا یا ذبح کے وقت اس کے پیٹ سے زندہ بچہ نکل آیا تو اس کو بھی ذبح کر دینا چاہئے۔ (۲)

(۳) جس شخص پر قربانی واجب تھی اگر اس نے قربانی کا جانور خرید لیا پھر وہ گم ہو گیا یا چوری ہو گیا تو واجب ہے کہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے۔ اگر دوسری قربانی کے بعد پہلا جانور مل جائے تو بہتر یہ ہے کہ اس کی بھی قربانی کر دے؛ لیکن اس کی قربانی اس پر واجب نہیں۔ اور اگر یہ شخص غریب ہے جس پر پہلے سے قربانی واجب نہ تھی، نفلی طور پر اس نے قربانی کے لیے جانور خرید لیا پھر وہ مر گیا یا گم ہو گیا تو اس کے ذمہ دوسری قربانی واجب نہیں۔ ہاں اگر گم شدہ جانور قربانی کے دنوں میں مل جائے تو اس کی قربانی کرنا واجب ہے اور ایامِ قربانی کے بعد ملے تو اس جانور یا اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ (۳)

(۴) اگر غریب آدمی جو قربانی نہیں کر سکتا، قربانی کرنے والوں کی مشابہت کے طور پر مرغی یا بطخ کی قربانی کرے، تو یہ مکروہ ہے اور مجوسیوں کا طریقہ ہے۔ (۴)

(۵) اگر سات آدمیوں نے مل کر ایک گائے قربانی کے لیے خریدی، پھر ان

---

(۱) بدائع : ۲۲۱/۵

(۲) بدائع : ۲۲۰/۵

(۳) بدائع : ۱۹۹/۵

(۴) عالمگیری : ۳۰۰/۵

میں سے ایک کا انتقال ہوگیا تو اگر اس مرحوم کے تمام وارث مرحوم کی طرف سے قربانی کی اجازت دیدیں تو جائز ہوگا، اور اگر وارثین کی اجازت کے بغیر باقی حصہ دار مرحوم کی طرف سے قربانی کریں گے تو کسی کی بھی قربانی ادا نہ ہوگی۔ (۱)

قربانی کا گوشت

(۱) جس جانور میں کئی حصہ دار ہوں تو گوشت وزن کرکے تقسیم کیا جائے، اندازہ سے تقسیم نہ کریں۔ (۲)

(۲) افضل یہ ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصہ کرکے ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے لیے رکھے، ایک حصہ احباب واعزہ میں تقسیم کرے، ایک حصہ فقراء ومساکین میں تقسیم کرے اور جس شخص کا عیال زیادہ ہو وہ تمام گوشت خود بھی رکھ سکتا ہے۔ (۳)

(۳) قربانی کا گوشت فروخت کرنا حرام ہے۔ (۴)

(۴) ذبح کرنے والے کی اُجرت میں گوشت یا کھال دینا جائز نہیں، (بلکہ اس کام کی) اُجرت علیحدہ دینی چاہئے۔ (۵)

قربانی کی کھال

(۱) قربانی کی کھال کو اپنے استعمال میں لانا مثلاً مصلی بنا لیا جائے یا چمڑے کی کوئی چیز ڈول وغیرہ بنوالیا جائے، یہ جائز ہے لیکن اگر اس کو فروخت کیا تو اس کی

---

(۱) درمختار مع شامی: ۹/۴۷۱، عالمگیری: ۵/۳۰۵

(۲) شامی: ۹/۴۶۰

(۳) شامی: ۹/۴۷۳، بدائع: ۵/۲۲۳،

(۴) البحرائق: ۸/۲۶، درمختار مع شامی: ۹/۴۷۵

(۵) شامی: ۹/۴۷۵، البحر الرائق: ۸/۳۲۷

قیمت اپنے خرچ میں لانا جائز نہیں، بلکہ صدقہ کرنا اس کا واجب ہے اور قربانی کی کھال کو فروخت کرنا بدون نیتِ صدقہ کے جائز بھی نہیں۔ (۱)

(۲) قربانی کی کھال کسی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں، اسی لیے مسجد کے مؤذن یا امام وغیرہ کے حق الخدمت کے طور پر ان کو کھال دینا درست نہیں۔ (۲)

اضافہ: اسی سے معلوم ہوگیا کہ بعض مشترکہ قربانی کا انتظام کرنے والے جو قربانی کے چمڑوں کو جانور کی کٹائی وصفائی کی اجرت میں خود رکھ لیتے ہیں، یہ جائز نہیں۔ (م ش)

(۳) مدارس اسلامیہ کے غریب اور نادار طلباء ان کھالوں کا بہترین مصرف ہیں کہ اس میں صدقہ کا ثواب بھی ہے، احیاءِ علمِ دین کی خدمت بھی، مگر مدرسین اور ملازمین کی تنخواہ اس سے دینا جائز نہیں۔

اضافہ: (۴) قربانی کی کھال مسجد یا مدرسہ کی تعمیر ومرمت میں خرچ کرنا جائز نہیں، اسی طرح دینی کتابوں کی اشاعت، رسالوں کی طباعت، شفا خانوں کی تعمیر میں لگانا بھی جائز نہیں۔ (۳)

تمت بالخیر

---

(۱) عالمگیری: ۵/۳۰۱، بحر: ۸/۳۲۷

(۲) درمختار شامی: ۹/۴۷۵، بحر الرائق: ۸/۳۲۷

(۳) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۴/۱۱۰ (م ش)

قربانی کی کھالوں کا مصرف......ایک اہم فتویٰ

تحریر کردہ: حضرت مولانا مفتی شفیق احمد صاحب حفظہ اللہ
(جاری کردہ از: دارالافتاء جامعہ مسیح العلوم بیدواڑی بنگلور)

تصدیق کردہ

حضرت اقدس مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی مہتمم جامعہ ہذا

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس بارے میں کہ:

(۱) چرم قربانی کے مصارف کیا ہیں؟

(۲) کیا کوئی ادارہ جو مسلمانوں کے تعلیمی یا اقتصادی حالات کو درست کرنے کے لیے قائم ہے چرم قربانی اصول کرسکتا ہے؟

(۳) چرم قربانی تنخواہوں میں یا مساجد کے مصارف میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

بینوا توجروا الجواب ....وھو ملھم لِلصّواب

(۱) قربانی کی کھال کا حکم مثل قربانی کے گوشت کے ہے جس طرح اس کا گوشت اپنے استعمال میں لانا اور غریب وامیر کو ہبہ کرنا یا صدقہ کرنا درست ہے اسی طرح قربانی کی کھال بھی یا تو خود اپنے استعمال میں لائے کہ اس سے مصلّیٰ یا کوئی باقی رہنے والی استعمال کی چیز بنا کر اپنے استعمال میں لائے یا پھر اس کھال کو دے کر بدلہ میں کوئی باقی رہنے والی استعمال کی چیز لے لے، یا پھر کسی کو وہ کھال ہدیہ یا صدقہ

کر کے مالک بنادے؛ کیونکہ بلا مالک بنائے قربانی کی کھال دینا درست نہیں۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ نے درمختار میں فرمایا ہے:

"ویتصدق بجلدها أو یعمل منه نحو غربال و جراب ..

.... أو یبدله بماینتفع به باقیاً الخ" (۱)

وقال: الصدقة كالهبة بجامع التبرع وحينئذ لاتصح

غیر مقبوضة. (۲)

اور صاحب تنویر الابصار نے فرمایا ہے:

"هي تمليك العين مجّاناً." (۳)

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ قربانی کی کھال صدقہ کی جاتی ہے اور صدقہ کے صحیح ہونے کے لیے مالک بنانا ضروری ہے ورنہ صدقہ صحیح نہیں ہوگا لہٰذا ہر وہ ادارہ جہاں قربانی کی کھال دی جائے وہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ اس کھال کا کسی متعین شخص کو مالک بنایا جاتا ہو وہاں وہ کھال دینا درست ہے ورنہ نہیں، اسی طرح اگر وہ کھال بیچی گئی خواہ قربانی کرنے والے بیچیں یا کھال اصول کرنے والے بیچیں تو اس کھال کی قیمت صرف وہاں خرچ کی جاسکتی ہے جہاں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ اور زکوٰۃ کے مصارف آیات قرآنی میں متعین کردیے گئے ہیں ان مصارف میں غربا و مساکین بھی ہیں جن میں مدارس کے وہ طلبہ بھی شامل ہیں جن کا قیام و طعام مدرسہ کے ذمہ ہے۔ اگر یہ رقم ان لوگوں کو دے کر مالک بنادیا جاتا ہے یا بشکل طعام یا

---

(۱) شامی: ۶/ ۳۲۸

(۲) ایضا: ۵/۷۰۹

(۳) ایضا: ۵/۶۸۷

لباس یا کتابیں وغیرہ اشیاء انہیں دے کر مکمل طور پر مالک بنادیا جاتا ہے تو قربانی کی کھال ان اداروں میں دینا درست ہے ورنہ جائز نہیں، دینے والے بھی گنہ گار ہوں گے اور لینے والے بھی گنہ گار ہوں گے۔ (۱)

(۲) ادارہ کے ذمہ دار خواہ مہتمم ہوں یا صدر وسکریٹری ہوں یا کوئی اور ہوں، قربانی کی کھالوں کے مالک نہیں ہیں وہ بطور وکیل کے ہیں۔ان کے ذمہ ضروری اور واجب ہے کہ کھالوں کو صحیح مصرف میں لگائیں ورنہ عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔اور جن کے ہاں اب تک قربانی کی کھالوں کو اس کے صحیح مصرف میں نہیں لگایا گیا ہے ان کے ذمہ ان کھالوں کی قیمت کا صدقہ واجب ہے۔ (۲)

بنایہ میں ہے:

"فاذا تمولته بالبيع وجب التصدق لأن هذا الثمن حصل بفعل مكروه فيكون خبيثاً فيجب التصدق." (۳)

اسی طرح قربانی کی کھالوں کو تعمیر میں لگانا بالکل جائز نہیں خواہ وہ مسجد کی تعمیر ہو یا مدرسہ کی یا شفاخانہ یا دواخانہ کی یا اسکول یا کنویں کی یا کسی بھی ادارۂ رفاہ عام کی تعمیر میں لگانا ہرگز جائز نہیں۔

تنویر الأبصار اور اس کی شرح میں لکھا ہے: "لایصرف الی بناء نحو مسجد" علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ فرماتے ہیں

"(نحو مسجد) كبناء القناطير والسقايات " واصلاح

---

(۱) احسن الفتاوی: ۷/۵۳۱

(۲) احسن الفتاوی: ۷/۵۳۲وفتاوی رحیمیه: ۶/۱۶۷

(۳) كذافي الهدايه عن الكافي: ۴/۴۵۰

الطرقات وكرى الانهار والحج والجهاد وكل مالا تمليک فيه". (۱)

(۳) قربانی کی کھالوں کو اساتذہ وملازمین کی تنخواہوں میں یا مساجد کے مصارف میں دینا بھی جائز نہیں؛ کیونکہ صدقہ میں بلاعوض دینا شرط ہے اور مدرسین وغیرہ خدام کو ان کی خدمت کے عوض میں دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جن اداروں میں قربانی کی کھالوں سے اشیاء برائے تعلیم مثلاً کتابیں خرید کر غریب بچوں کو برائے تحصیل علم عارضی طور پر دی جاتی ہیں لیکن انہیں ان چیزوں کا مالک نہیں بنایا جاتا بلکہ سال ختم ہونے پر یہ کتابیں واپس لے لی جاتی ہیں، وہاں بھی قربانی کی کھال دینا درست نہیں؛ کیونکہ تملیک جو صدقہ صحیح ہونے کی شرط ہے نہیں پائی گئی -ان سب تفصیلات کو آپ فتاویٰ عالمگیری، شامی ج ۶-۲ میں، ہدایہ ج ۴ میں، فتاویٰ محمودیہ جلد ۱۴-۴ میں، فتاویٰ رحیمیہ ج ۶-۲ میں، احسن الفتاویٰ جلد ۷ میں، دیکھ سکتے ہیں-فقط واللہ تعالیٰ اعلم

العبد شفيق أحمد القاسمي خادم دار الإفتاء
جامعہ مسیح العلوم بیدواڑی بنگلور/۱

---

(۱) زیلعی ردالمحتار: ۳۴۴/۲

سفر آخرت کے اسلامی احکام

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

و خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : سفر آخرت کے اسلامی احکام

مصنف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۱۴۹

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۷ھ مطابق اپریل ۲۰۱۶ء

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 09634307336 \ 09036701512

ای میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

الفہرس

التقريظ

حضرت استاذی مولانا مفتی نصیر احمد صاحب رحمۃ اللہ

خلیفہ حضرت فقیہ الاسلام مفتی مظفر حسین صاحب دامت برکاتھم
وسابق مفتی جامعہ مفتاح العلوم (جلال آباد، یوپی،)

حمداً وسلاماً: امابعد احقر نے رسالہ ''سفر آخرت کے اسلامی احکام'' مؤلفہ مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب (مہتمم جامعہ مسیح العلوم) بنگلور، از اول تا آخر مطالعہ کیا، عام مسلمانوں کی حالتِ دینی کے پیشِ نظر نہایت سلیس اور آسان زبان میں لکھ کر بالکل ناواقف مسلمانوں کو بھی میت کے بارے میں تمام حالات کے احکام اور ہر ہر کام کو انجام دینے کے آداب وطریقے اس میں درج کر دئے ہیں، الغرض اس سے معمولی استعداد کے لوگ بھی پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، حق تعالی مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مسلمانوں کو اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

فقط : نصیر احمد عفی عنہ

(مہتمم ادارہ وخطیب مرکزی مسجد پھونس والی، بڑوت، ضلع میرٹھ)

۹/ رمضان المبارک/ ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۵/ نومبر/ ۱۹۹۵ء

التقریظ

فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی شاہ مظفر حسین رحمہ اللہ

ناظم ومتولی مدرسہ مظاہر العلوم (وقف) سہارنپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیًا و مسلماً

امابعد:

عزیزی مفتی محمد شعیب اللہ خان مہتمم مدرسہ مسیح العلوم، بنگلور ایک ہونہار عالم دین ہیں، جو" شاب نشأفي عبادة الله "کا مصداق ہیں اللہ نے انہیں لکھنے پڑھنے کا پاکیزہ ذوق عطا فرمایا ہے، جس کا ثبوت موصوف کے متعدد رسائل ہیں، جو علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔ پیش نظر کتاب ''سفرآخرت کے اسلامی احکام'' اپنے عنوان سے متعلق مختلف آیات وروایات، احکام ومسائل پر مشتمل معتبر کتاب کا نچوڑ اور لب لباب ہے جو تیسری بار مفید اضافوں کے بعد شائع ہو رہی ہے۔ ماشاءاللہ موصوف نے اس کتاب کی ترتیب میں کافی محنت کی ہے اور مختلف کتاب سے مراجعت میں اپنے علمی ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان شاءاللہ یہ مجموعہ ان کی دیگر کتب کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز مولف کو اخلاص کے ساتھ مزید خدمت دین کی توفیق مرحمت فرمائے۔

فقط

العبد مظفر حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش نامہ

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم : اما بعد

اسلام اور اس کی تعلیمات سے واقفیت رکھنے والا ادنی مسلمان بھی اس حقیقت سے بے بہرہ نہیں ہوسکتا؛ کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام اور دستورالعمل ہے، خواہ وہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی ہو، پھر اجتماعی زندگی خواہ عائلی ہو یا قبائلی ہو یا شہری پھر ان زندگیوں کا کوئی بھی شعبہ اور پہلو ہو، اسلام ہر موقعہ پر انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ کائنات کی دائمی ضرورتوں کو حاوی اور تدبیرِ منزل سے لے کر سیاستِ مُدن تک کے، ہر نظام کے اصولوں کا بہترین اور مرتب ہدایت نامہ ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر اسلام میں موت اور اس کے متعلقات کے بارے میں بھی مکمل ہدایات وتعلیمات کا ہونا ضروری ہے۔ چناں چہ اسلام نے موت کے متعلق ہمیں تفصیلی احکامات وہدایات سے آگہی بخشی ہے اور ہماری رہنمائی فرمائی ہے؛ مگر افسوس کہ آج..... جیسا کہ اور بہت سارے شعبہ ہائے دین میں بدعات وخرافات کو داخل کیا گیا ..... موت کے متعلق بھی بے شمار من گھڑت رسموں، غیر شرعی رواجوں اور مجرمانہ بدعتوں کو لوگوں نے اپنا کر اسلام کی تعلیمات وہدایات سے غفلت وجہالت کا ثبوت دیا ہے۔ موت دراصل ''سفرِ آخرت کی ابتدائی کڑی ہے، اس موقعہ پر نہ صرف مرنے والے کو؛ بل کہ اس کے دوست احباب اور رشتہ داروں اور دیکھنے والوں کو بھی، سرتاپا خوف بن جانا چاہئے اور دنیا کی مادی وفانی چیزوں سے دوری اختیار کرلینا چاہئے اور اللہ ورسول کی خوشنودی کی خاطر سنت اور شریعت کی پیروی کو لازم کرلینا چاہئے تھا؛ مگر بڑے دکھ کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ لوگ اس کے بہ جائے

بے ہودہ رسموں اور غیر شرعی دعوتوں کی فکر کرتے ہیں، کسی کو چہلم کی فکر ہے، کسی پر برسی کا مسئلہ سوار ہے۔ میت کو سامنے رکھ کر ان دعوتوں کے لیے تاریخیں طے کی جاتی ہیں، پھر اس کے لیے حلال اور حرام جو ملے، حاصل و فراہم کرتے ہیں۔ اور مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ دین اور اسلام کے نام پر کیا جاتا ہے۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر دل میں ایک کڑھن اور چبھن محسوس ہوتی تھی اور بار بار خیال آتا تھا کہ موت اور اس کے متعلقات کے احکام پر ایک رسالہ آسان و عام فہم انداز میں اختصار و ایجاز کے ساتھ لکھا جائے؛ تاکہ ان غیر شرعی رسومات کی اصلاح ہو اور اصل احکامِ شرع لوگوں کے سامنے آجائیں۔ اسی خیال سے تقریباً پانچ سال قبل ایک رسالہ احقر نے لکھا اور وہ شائع ہو گیا؛ مگر بعض مقامات پر کچھ تشنگی محسوس ہوتی تھی، لہٰذا اب ان مقامات پر نظرِ ثانی کی گئی اور احادیث کی تخریج کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، اور جہاں فقہا کے اقوال ذکر کرنے کی ضرورت تھی وہاں فقہی کتابوں کے حوالے بھی پورے اہتمام سے درج کئے گئے ہیں۔

جب پہلی دفعہ یہ رسالہ شائع ہوا تو بہت سوچ بچار کے بعد اس کا نام ''سفرِ آخرت کے اسلامی احکام'' تجویز ہوا۔ آسان تو یہ تھا کہ موت کے احکام یا اس کے ہم معنیٰ کوئی نام ہوتا؛ مگر بار بار خیال آتا رہا کہ موت کے لفظ ہی سے لوگوں کو کراہت و نفرت ہے، لہٰذا مذکورہ نام تجویز کرنا پڑا، کیونکہ موت ''سفرِ آخرت'' ہی کا نام ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو مقبول اور نافع بنائیں اور ہمیں ہر معاملہ میں شریعت کے احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

(جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم)

۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۶ھ ہجری

موت کی یاد

موت ایک لازمی اور قطعی چیز ہے جس سے کسی کو مفر نہیں، نیز اس کی یاد انسان کے لیے عبرت وموعظت کا سبب وباعث ہوتی ہے اس لیے احادیث میں موت کو یاد کرنے اور اس سے نصیحت حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہاں اس سلسلہ کی چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

« اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ. » (۱)

(لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو یعنی موت کو)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

« اَكْثِرُوْا ذِكْرَ الْمَوْتِ فَمَا مِنْ عَبْدٍ اَكْثَرَ ذِكْرَهُ اِلَّا اَحْيَى اللّٰهُ قَلْبَهُ وَهَوَّنَ عَلَيْهِ الْمَوْتَ. » (۲)

(موت کو کثرت سے یاد کرو، کیوں کہ کوئی بندہ ایسا نہیں جس نے موت کو کثرت سے یاد کیا ہو؛ مگر اللہ اس کے دل کو زندہ کر دیتے ہیں اور اس پر موت کو آسان فرما دیتے ہیں)

---

(۱) ترمذی:۲۲۲۹، نسائی:۱۸۰۱،ابن ماجہ:۴۲۲۸،احمد:۷۵۸۴

(۲) بہ حوالہ کنز العمال:۴۲۰۹۹

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم لذات کو ختم کردینے والی چیز کو (یعنی موت کو) کثرت سے یاد کرتے، تو یہ بات تم کو ان چیزوں سے باز رکھتی جو میں (تم میں ہنسی مذاق کی) دیکھ رہا ہوں۔ لہٰذا الذات کو ختم کرنے والی چیز (موت) کو کثرت سے یاد کرو۔ کیوں کہ قبر پر کوئی دن نہیں گذرتا؛ مگر وہ کہتی ہے کہ:

"انا بیت الغربة وانا بیت الوحدة وانا بیت التراب وانا بیت الدود" (یعنی میں مسافرت کا گھر ہوں، میں تنہائی کا گھر ہوں، میں مٹی کا گھر ہوں، اور میں کیڑوں کا گھر ہوں)۔(۱)

موت کی تیاری

اللہ نے انسان کو جو زندگی عطا فرمائی ہے، وہ درحقیقت آخرت کی تیاری کے لیے ہے، جیسا کہ حدیث میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« خُذْ مِنْ صِحَّتِکَ لِمَرْضِکَ وَ مِنْ حَیَاتِکَ لِمَوْتِکَ »

(اپنی صحت میں سے اپنی بیماری کے لیے اور زندگی میں سے موت کے لیے حصہ لے لو۔)(۲)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"معنی یہ ہیں کہ اپنی صحت کے زمانے میں عبادت و طاعت میں مشغول رہو، اس طرح کہ اگر بیماری کے دنوں میں اس میں تقصیر و کمی ہو جائے تو اس کے ذریعہ اس کی تلافی ہو جائے اور اپنی زندگی میں ایسے

(۱) ترمذی:۲۳۸۴، کنز العمال:۴۲۷۹۰

(۲) بخاری:۶۴۱۶، ترمذی:۲۲۵۵، ابن ماجہ:۴۱۰۴، احمد:۴۵۳۴

اعمال انجام دو، جو مرنے کے بعد نفع دیں اور تندرستی کے دنوں میں عمل صالح میں جلدی کرو؛ کیوں کہ کبھی مرض و بیماری طاری ہو کر عمل سے روک دیتی ہے"۔(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ:

« اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ » (۲)

(عقل مند انسان وہ ہے، جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرتا رہے۔)

غرض اللہ عزوجل نے زندگی اسی لیے دی ہے کہ اس میں ایمان و عمل والا طریقہ اختیار کر کے سفرِ آخرت کا توشہ تیار کیا جائے، اور جو شخص یہ کام کرتا ہے وہی دراصل، حقیقی عقل مند ہے۔

موت کے قریب

موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں، اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم کہ ہماری موت کب آئے گی؟ اس لیے موت کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے اور موت کو ہر وقت قریب ہی خیال کرنا چاہئے اور اس میں ہم سے غفلت ہو جاتی ہے، تو موت کے داعی ہم کو آ کر جگاتے بھی ہیں، جیسے بیماریاں، ناگہانی حوادث وغیرہ، لہٰذا ایسے مواقع پر تو انسان کو سنبھل جانا چاہئے اور اس دستور العمل پر کاربند ہونا چاہئے۔

☆ موت سے نفرت نہ کرے، کیوں کہ موت مؤمن کے لیے خیر و بھلائی ہے۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ آدمی دو چیزوں کو ناپسند کرتا ہے ایک موت کو،

---

(۱) فتح الباری:۱۱/ ۲۳۵

(۲) ترمذی:۲۳۸۳، ابن ماجہ:۴۲۵۰، احمد:۱۶۵۰۱

حالاں کہ مؤمن کے لیے فتنہ سے بہتر ہے۔ دوسرے مال کی کمی کو، حالاں کہ مال کی کمی (قیامت میں) حساب میں تخفیف کا سبب ہے۔(١)

اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موت مومن کا تحفہ ہے۔(٢)

☆ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خواہش رکھے۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا پسند کرتا ہے، اللہ بھی اس سے ملنا پسند فرماتے ہیں اور جو اللہ سے ملنا نہیں چاہتا اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا نہیں چاہتے۔(٣)

☆ اگر کوئی بات وصیت کے قابل ہو مثلاً اپنے ذمے کسی کا قرض ہو یا کسی کی امانت وغیرہ ہو تو اس کی وصیت کر دے یا لکھ کر رکھ دے۔ چناں چہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''کسی مسلمان کو اس کا حق نہیں کہ اس کے پاس کوئی بات وصیت کے قابل ہوتے ہوئے اس پر دو راتیں بھی گذر جائیں؛ الاّ یہ کہ اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی ہو''۔(٤)

☆ اللہ تعالیٰ کی جناب میں حسن ظن (نیک گمان) رکھے، کہ وہ اپنی مغفرت و رحمت سے محروم نہ کرے گا۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کو مرتے وقت اللہ سے نیک گمان رکھنا چاہئے۔(٥)

---

(١) احمد:٢٢٥١٩
(٢) مشکوٰۃ:١٤٠، کنز العمال:٤٢١٠٣
(٣) بخاری:٦٥٠٧، مسلم:٤٨٤٤، ترمذی:٩٨٦، نسائی:١٨١٣، احمد:٢١٦٣٨، دارمی:٢٦٣٨
(٤) بخاری:٢٧٣٨، مسلم:٣٠٧٤، ترمذی:٨٩٦، ابو داود:٢٤٧٨ نسائی:٣٥٥٧، ابن ماجه:٢٦٩٠، احمد:٤٢٣٩، مؤطا امام مالک:١٢٥٦
(٥) مسلم:٥١٢٥، ابو داود:٢٧٠٦، ابن ماجه:٤١٥٧، احمد:١٣٦١١

سکراتِ موت

جب انسان موت کی سختیوں اور سکرات کے عالم میں ہو تو، خود اس کے لیے اور اس کے پاس موجود رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے بعض احکام و آداب ہیں:

مرنے والے کے لیے احکام

مرنے والے انسان کے لیے یہ احکام و آداب ہیں:

وضو کرنا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وضو کی حالت میں موت پانے والے کو شہید کا مرتبہ ملتا ہے۔(۱)

مسواک کرنا، چناں چہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے ذرا پہلے موت کی سختی کے عالم میں مسواک کے لیے اشارہ فرمایا اور مسواک لے کر خوب اچھی طرح منہ کو صاف فرمایا۔(۲)

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا اور اس کے عذاب سے خوف کھانا، حدیث میں فرمایا گیا کہ اس موقعہ پر امید اور خوف دونوں جس کے دل میں جمع ہوتے ہیں اللہ تعالے اس کو وہ چیز عطا کر دیتے ہیں جس کی اس نے امید رکھی اور اس چیز سے اس کو بچاتے ہیں جس کا اس نے خوف کیا۔(۳)

یہ دعا کرتا رہے:

---

(۱) مروزی، احتظاظ العفور فی احوال الموتیٰ والقبور:۳

(۲) بخاری:۴۴۳۸، احمد:۲۴۴۶۰

(۳) ترمذی:۹۰۵

« اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی سَکَرَاتِ الْمَوْتِ. »

(اے اللہ موت کی پریشانیوں اور سختیوں میں میری مدد فرما۔)

حدیث میں ہے کہ وفات کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیالہ میں جس میں پانی تھا، ہاتھ ڈال کر اپنے چہرہ پر ملتے جاتے تھے اور یہ دعا پڑھتے جاتے تھے۔(۱)

اسی طرح ایک اور دعا پڑھنا بھی آپ علیہ السلام سے ثابت ہے وہ یہ ہے:

« اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَ ارْحَمْنِیْ وَ اَلْحِقْنِیْ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی. »(۲)

کوشش کرے کہ اپنا آخری کلام " لا الٰہ الا اللہ "ہو، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا آخری کلام "لا الٰہ الا اللہ " ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا۔(۳)

حاضرین کے لیے احکام

مرنے والے کے پاس جو لوگ، اس کے رشتہ داروں یا دوست احباب میں سے موجود ہوں، ان کو ان باتوں کا اہتمام کرنا چاہیے:

جو مرنے کے عالم میں ہو اس کو قبلہ رخ لٹا دیں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ قبلہ سے داہنی طرف سر اور قبلہ سے بائیں طرف پیر کر کے، داہنی کروٹ لٹادیں؛ تاکہ چہرہ قبلہ کی طرف رہے، جیسا کہ کتبِ فقہ میں تصریح کی گئی ہے۔(۴)

---

(۱) ترمذی:۹۰۰، ابن ماجہ:۱۶۱۲، احمد:۲۳۳۲۰

(۲) بخاری:۴۴۴۰، مسلم:۴۴۷۴، ترمذی:۳۴۱۸، احمد:۲۳۶۳۰، مالک:۵۰۱

(۳) ابو داؤد:۲۷۰۹، احمد:۲۱۰۲۴، مستدرکِ حاکم:۱۲۹۹

(۴) الدر المختار مع حاشیۃ الشامی:۱۸۹/۲، البحر الرائق:۱۷۰/۲، الہدایۃ:۱۵۸/۱

''در مختار'' اور'' البحر الرائق'' میں تصریح کی گئی ہے کہ یہی طریقہ سنت سے مروی وثابت ہے اوراس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کوامام حاکم رحمۃ اللہ نے اپنی ''مستدرک'' میں روایت کیا ہے:

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو حضرت براء بن معرور کے بارے میں پوچھا، حضراتِ صحابہ نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو چکا اورانہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کوقبلہ رخ کردیا جائے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہوں نے فطرت کو پالیا۔ پھر آپ گئے اور نماز (جنازہ) پڑھی''۔(١)

ابن حجر رحمۃ اللہ نے درایہ میں نقل فرمایا ہے کہ حاکم نے اس حدیث کوصحیح قرار دیا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کوقبلہ رخ لٹانا چاہئے اوراس کا طریقہ وہ ہے جواوپر مذکور ہوا،بعض علما نے لکھا ہے کہ قبلہ کی طرف پیر کرکے سرکوذرا اونچا کردیا جائے،تو یہ بھی جائز ہے؛مگر سنت وہی ہے جواوپر مذکور ہوا۔

مرنے والے کے پاس جاکر کلمات خیرہی کہنا چاہئے کوئی غلط اور مایوسی کی بات نہ کہنا چاہئے۔حدیث میں ہے کہ مرنے والے کے پاس صرف خیر کی بات کہو، کیوں کہ اس پر فرشتے آمین کہتے رہتے ہیں۔(٢)

مرنے والے کے پاس بیٹھ کر زور زور سے لاالٰہ الا اللّٰہ کاوردکریں؛تاکہ مرنے والے کوبھی شوق ہوکر وہ بھی پڑھنے لگے۔چناں چہ احادیث میں اس کی تعلیم

---

(١) الدرایة مع الھدایة:١/١٥٨،نصب الرایة :٢/٢٥٩،السنن الکبری للبیھقی:٥/٢٣٥

(٢) مسلم :١٥٢٧، ترمذی:٨٩٩، نسائی:١٨٠٦،ابن ماجه:١٤٣٧،احمد:٢٥٢٨٩

فرمائی گئی ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.»

(اپنے مرنے والوں کو لا الہٰ الا اللّٰہ کی تلقین کرو۔)(۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ مرنے والوں کو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو، کیوں کہ وہ زبان پر ہلکا و آسان، ترازو میں وزنی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ وہ کلمہ خطایا اور گناہوں کو اس طرح منہدم کردیتا ہے، جیسے سیلاب عمارتوں کو منہدم کردیتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ پھر وہ کلمہ زندوں کے لیے کیسا ہے؟ فرمایا کہ زندوں کے لیے وہ اور زیادہ گناہوں کو منہدم کرنے والا ہے۔(۲)

تنبیہ اول: یاد رکھنا چاہیے کہ مرنے والے آدمی کے پاس کلمۂ طیبہ پڑھنے کا حکم ہے؛ لیکن اس کا حکم نہیں کہ مرنے والے کو مخاطب بنا کر، اس کو کلمہ پڑھنے کا حکم کیا جائے؛ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ موت کی سختیوں اور پریشانیوں میں تنگ آ کر وہ انکار کر دے۔ چناں چہ دیلمی رحمۃ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ مرنے والوں کو لا الہ الا اللّٰہ کی تلقین کرو؛ مگر ان کو تنگ نہ کرو؛ کیوں کہ وہ موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں۔(۳)

تنبیہِ ثانی: تلقین میں صرف لا الہ الا اللّٰہ پڑھنا چاہیے یا اس کے ساتھ محمد رسول اللّٰہ بھی پڑھنا چاہیے؟ اس میں علما کے دو قول ہیں: اکثر علما نے صرف لا الہ الا اللّٰہ پڑھنے کو لکھا ہے؛ مگر بعض علما نے اس کے ساتھ محمد

---

(۱) مسلم: ۱۵۲۳، ترمذی: ۸۹۸، نسائی: ۱۸۰۳، ابو داؤد: ۲۷۱۰، ابن ماجہ: ۱۴۳۵، احمد: ۱۰۵۷۰

(۲) کنز العمال: ۴۲۱۹۶

(۳) کنز العمال: ۲۱۹۶

رسول اللہ کو بھی ملا لینے کی گنجائش دی ہے۔(۱)

مرنے والے آدمی کے پاس سورۂ یٰسٓ کی تلاوت کی جائے کیوں کہ حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے والوں کے پاس سورۂ یٰسٓ پڑھو۔(۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس میت کے پاس سورۂ یٰسٓ پڑھا جاتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ آسانی فرماتے ہیں۔(۳)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے بلوغ المرام میں ابن حبان سے پہلی حدیث کا صحیح ہونا نقل کیا ہے۔(۴)

مرنے والے کو اس کی نیکیاں اور اچھائیاں یاد دلائیں، حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند کرتے تھے کہ مرنے والے آدمی کو اس کی نیکیاں یاد دلائیں؛ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھے۔(۵)

جب غرغرہ ہونے لگے، تو تلقین بند کردیں؛ کیوں کہ غرغرہ کے وقت کچھ پڑھا نہیں جاسکتا۔(۶)

مناسب ہے کہ حالتِ نزع میں اس کے پاس، اس کے اہل خاندان میں سے نیک اور متقی اور اس سے زیادہ تعلق رکھنے اور اس کے حالات سے زیادہ واقفیت رکھنے

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھو: در مختار مع رد المحتار: ۲/۱۹۰

(۲) ابو داؤد: ۳۱۲۱، ابن ماجہ: ۱۴۴۸، احمد: ۱۹۴۲۷

(۳) کنز العمال: ۴۲۱۷۹

(۴) بلوغ المرام: ۳۸

(۵) کنز العمال: ۴۲۸۰۱

(۶) شامی: ۲/۱۹۰

والے لوگ حاضر ہوں؛ کیوں کہ اس وقت اللہ کے مقدس فرشتے وہاں آتے ہیں، اور اس لیے کہ اس کو وہ لوگ توبہ کی طرف اور اللہ کی طرف متوجہ کر سکیں۔(۱)

مرنے والے آدمی کے پاس خوشبو جلائی یا رکھی جائے، نیز اس کو لٹانے کے لیے بھی پاک کپڑے استعمال کیے جائیں۔(۲)

سکرات اور غیر شرعی رسومات

سکرات کے موقعہ پر جو آداب و احکام، شریعت میں ہیں ان کو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ بعض جگہ پر بعض غیر شرعی رسومات کی پابندی یا ارتکاب کیا جاتا ہے ان سے بچنا چاہئے، مثلاً بعض لوگ مرنے والے کے پاس بیٹھ کر، ذکر و تلاوت کے بہ جائے دنیوی باتیں کرتے ہیں، یہ سخت بری بات ہے۔ بعض لوگ تلقین کے بہ جائے جس کا حاصل کلمۂ طیبہ کا ورد ہے، اُس پر زور دیتے ہیں اور اس کو پڑھنے کا حکم کرتے ہیں، حالاں کہ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ بعض لوگ خصوصاً خواتین، مرنے والے کے سامنے دنیوی مسائل، بیوی، بچوں کی پریشانیاں بیان کر کے، اس کو ان فانی و مادی چیزوں کی طرف مائل کر دیتی ہیں، اس کے بچوں کو پیار کرنے کہتی ہیں، بچوں کو اس کے سینہ پر ڈال دیتی ہیں، حالاں کہ یہ وقت ایسا ہے کہ اس میں انسان کو اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور دنیا سے دور اور بے نیاز ہونے کی شدید ترین ضرورت ہے؛ مگر افسوس کہ لوگوں کو مرنے والے کی تو کوئی فکر نہیں ہوتی، زندوں کی فکر ہوتی ہے۔ لہٰذا یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت مرنے والے آدمی کو اللہ کی

---

(۱) عالمگیری:۱/۱۵۷، مقدماتِ ابنِ رشد مالکیؒ مع المدونة :۱/۱۶۶، المغنی لابن قدامہ:۲/۲۸۵

(۲) عالمگیری:۱/۱۵۷، مقدمات ابن رشد مالکیؒ:۱/۱۶۶

طرف متوجہ کرنے اور ذکر کی تلقین کرنے میں مصروف ہونا چاہئے۔ چناں چہ علما نے لکھا ہے کہ مرنے والے کے پاس اس کے لوگوں میں سے اہل صلاح وتقویٰ رہیں اور اس کو ذکر وتوبہ کی یاددہانی کریں۔(۱)

(۱) المغنی :۲/۲۸۵

موت ہونے کے بعد

جب موت واقع ہو جائے تو تمام حاضرین اور غائبین، جن کو موت کی خبر پہنچے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھیں، حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی مصیبت پہنچنے پر ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھتا ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے اس مصیبت میں اجر عطا فرما اور اس کا نعم البدل عطا فرما، تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بہتر چیز عطا فرماتے ہیں۔(۱)

میت کے حق میں درجات کی بلندی، مغفرت اور قبر میں کشادگی کے لیے دعا کریں۔ حضرت ابوسلمہ ﷺ کا انتقال ہوا تو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی:

> ''اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرمادے اور ان کے درجات کو بلند کردے کہ وہ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہو جائیں اور ان کے پس ماندگان (بیوی، بچوں) کے حق میں تو کارساز بن جا، اور اے رب العالمین! ہماری اور ان کی مغفرت فرما اور ان کی قبر کو کشادہ و منور فرمادے۔(۲)

میت کی آنکھیں بند کردی جائیں اور منہ کو کسی پاک کپڑے سے باندھ دیا جائے اس طرح کہ کپڑا ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر سر پر لے جائیں؛ تاکہ منہ کھل نہ جائے، پیٹ پر کوئی وزنی چیز رکھ دی جائے؛ تاکہ پیٹ پھول نہ جائے اور تمام اعضا کو

(۱) مسلم:۱۵۲۵، ابو داؤد:۲۷۱۲،احمد:۲۵۴۱۷،مالک :۴۹۸

(۲) مسلم:۱۵۲۸،ابو داؤد:۲۷۱۱، احمد:۲۵۳۳۲

درست کردیا جائے۔(۱)

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کی آنکھیں بند کردو؛ کیوں کہ اس کی نظر روح کے پیچھے جاتی ہے۔(۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ان کی آنکھوں کو کھلا ہوا دیکھا، تو ان کو بند فرمایا۔(۳)

میت کے کپڑے نکال دیے جائیں اور اس پر چادر ڈال دی جائے، جیسا کہ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک پر (روئی یا کتان کی بنی ہوئی) چادر ڈالی گئی تھی۔(۴)

میت کی آنکھوں کو بند کرنے والا یہ دعا پڑھ لے تو اچھا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَللّٰهُمَّ يَسِّرْ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ وَ سَهِّلْ عَلَيْهِ وَ اَسْعِدْهُ بِلِقَائِكَ وَ اجْعَلْ مَاخَرَجَ اِلَيْهِ خَيْراً مِمَّا خَرَجَ عَنْهُ. (۵)

یہ دعا کسی حدیث میں نظر سے نہیں گذری؛ البتہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنن کبریٰ میں حضرت بکر بن عبد اللہ رحمہ اللہ جو تابعین میں سے ایک جلیل القدر فقیہ

(۱) هدايه:۱/۱۵۸، رد المحتار:۱۹۳، البحر الرائق:۲/۱۷۱، المغنی:۱/۲۸۵، شرح المهذب:۵/۱۰۹

(۲) ابن ماجه:۱۴۴۵، احمد:۱۶۵۱۳

(۳) مسلم:۱۵۲۸، ابن ماجه:۱۴۴۴، ابو داؤد:۲۷۱۱، احمد:۲۵۳۳۲

(۴) بخاری:۵۸۱۴، مسلم:۱۵۶۶، ابو داؤد:۲۸۱۳، احمد:۲۳۴۴۰

(۵) البحر الرائق:۲/۱۷۱، در مختار مع الشامی:۲/۱۹۳، نور الایضاح:۱۲۶

گذرے ہیں، ان سے اتنا نقل کیا ہے کہ جب میت کی آنکھیں بند کرو تو یہ کہو "بسم اللّٰہ و علی ملۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "(۱)

جس پلنگ پر میت کو رکھنا ہو، اس کو خوش بو سے تین دفعہ دھونی دے کر، اس پر اس کو رکھا جائے اور اس کا رخ قبلہ کی طرف کردیا جائے، جیسا کہ موت سے پہلے رکھا گیا تھا، "البحر الرائق" میں ہے کہ بعض فقہا کے نزدیک اس طرح رکھنا چاہئے جیسے بیماری کی حالت میں نماز پڑھنے والا لیٹتا ہے، یعنی پیر قبلہ رخ کر کے سر کو اونچا کردیا جائے؛ مگر بعض کا مختار قول یہ ہے کہ داہنی کروٹ پر لٹائیں اور قبلہ سے داہنی طرف سر اور بائیں طرف پیر ہوں، جیسے قبر میں رکھتے ہیں؛ لیکن اگر اس طرح لٹانے میں کوئی مشکل پیش آئے، تو جس طرح سہولت ہو اس طرح لٹایا جاسکتا ہے۔(۲)

حیض و نفاس والی عورت اور ناپاک لوگ جن پر غسل فرض ہے، وہ وہاں سے باہر چلے جائیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حائضہ اور جنبی (جس پر غسل واجب ہو) وہ میت کے قریب نہ ہو۔(۳)

نیز تلاوتِ قرآن بند کردیں، جب تک کہ اس کو غسل نہ دے دیا جائے۔ ہاں میت سے دور بیٹھ کر پڑھنا چاہیں تو اس کی اجازت ہے۔ چناں چہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر میت سے دور (مثلاً دوسرے کمرے میں) بیٹھ کر تلاوت کی جائے تو مکروہ نہیں، اسی طرح اگر میت کو پوری طرح کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا ہو، تو

---

(۱) السنن الکبریٰ :۵/۲۳۶، امام نووی رحمہ اللہ نے "شرح المهذب" :۵/۱۱۰ میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔
(۲) البحر الرائق :۲/۱۷۱، اسی طرح عالمگیری میں بھی ہے :۱/۱۵۸
(۳) البحر الرائق :۲/۱۷۱، در مختار مع رد المحتار :۲/۱۹۳، المغنی :۲/۲۸۶

وہاں بیٹھ کر تلاوت کرنا درست ہے۔(۱)

میت کے متعلقین اور بالخصوص وارثین کے لیے مستحب ہے کہ میت پر اگر کسی کا قرض ہو تو اس کو ادا کرنے کی فکر کریں۔ یہ میت کے حق میں بہت ہی فائدہ مند ہوگا۔

کیوں کہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا نفس اس کے قرض کی وجہ سے معلق (لٹکا ہوا) رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی ادائیگی ہوجائے۔(۲)

اور احمد و دارمی کی روایت میں اس طرح آیا ہے کہ مومن کا نفس معلق رہتا ہے جب تک کہ اس پر قرض ہو۔(۳)

متعلقین اور دوست احباب کو چاہئے کہ صبر و ضبط سے کام لیں۔ ہاں اگر آنکھوں میں خود بہ خود آنسو جاری ہوجائیں، تو مضائقہ نہیں اور نہ صبر کے خلاف ہے، جیسا کہ آگے چل کر ہم اس کی وضاحت کریں گے۔ ایسے مواقع پر صبر کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے اور صبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ زبان پر اللہ کی شکایت نہ آئے اور دل سے اللہ کے فیصلہ پر راضی رہے۔

فائدہ : متعدد احادیث میں اپنے عزیز و قریب کے مرنے پر صبر کے فضائل وارد ہوئے ہیں:

ایک حدیث میں حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) شامی:۲/۱۹۴

(۲) ترمذی:۹۹۹،ابن ماجہ:۲۴۰۴

(۳) احمد:۹۳۰۲،دارمی :۲۴۷۸

« اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی لِعَبْدِہِ الْمُؤْمِنِ اِذَا ذَھَبَ بِصَفِیِّہٖ مِنْ اَھْلِ الْاَرْضِ فَصَبَرَ وَاحْتَسَبَ وَقَالَ مَا اُمِرَ بِہٖ بِثَوَابٍ دُوْنَ الْجَنَّۃِ ۔ »(۱)

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس بندۂ مؤمن کے لیے جنت سے کم پر راضی نہیں ہوتا، جس کا کوئی رشتہ دار انتقال کر جائے اور وہ اس پر صبر کرے اور ثواب کی امید رکھے اور وہی بات زبان سے کہے جس کا اس کو حکم دیا گیا ہے۔)

ایک حدیث میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا مِنَ النَّاسِ مِنْ مُسْلِمٍ یُتَوَفّٰی لَہٗ ثَلَاثٌ لَمْ یَبْلُغُوْا الْحِنْثَ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ بِفَضْلِ رَحْمَتِہٖ اِیَّاھُمْ ۔ » (۲)

(انسانوں میں سے جس مسلمان کی تین اولاد جو بلوغ کی عمر کو نہ پہنچی ہو نہیں مرتی؛ مگر اللہ تعالیٰ ان بچوں پر اپنی رحمت کی بنا پر اس آدمی کو جنت میں داخل فرماتے ہیں۔)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہی مضمون آیا ہے اور اس میں مزید یہ اضافہ بھی ہے کہ ان مرحوم بچوں سے کہا جائے گا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ؛ مگر وہ بچے اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ جب تک ہمارے ماں باپ جنت میں داخل نہ ہوں گے ہم نہیں جائیں گے، اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہا جائے گا کہ تم اور تمہارے ماں باپ دونوں جنت میں داخل ہو جاؤ۔(۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) نسائی:۱۸۴۸

(۲) بخاری:۱۲۴۹، نسائی:۱۸۴۹، ابن ماجہ:۱۵۹۴، احمد:۱۲۰۷۷

(۳) نسائی:۱۸۵۳، احمد:۱۰۲۱۳

کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس کے ساتھ ایک بچہ تھا، اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اس بچہ پر خوف معلوم ہوتا ہے اور اس سے پہلے میں تین بچوں کو بھیج چکی ہوں (یعنی میرے تین بچے مر چکے ہیں، کہیں یہ بھی مر نہ جائے) اس پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَقَدِ احْتَظَرْتِ بِحِظَارٍ شَدِيدٍ مِنَ النَّارِ.» (۱)

(تو نے تو دوزخ سے بڑی سخت باڑھ بنالی ہے۔)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ عورتوں میں وعظ فرمایا، اس میں آپ نے یہ بھی کہا کہ جس عورت کے تین بچے مر جائیں، تو وہ بچے اس کے لیے دوزخ سے حجاب بن جائیں گے، ایک عورت نے عرض کیا کہ اگر کسی کے صرف دو بچے مریں تو؟ آپ نے فرمایا کہ دو مریں تب بھی (وہ دو بچے اس کے لیے دوزخ سے آڑ اور حجاب بنیں گے۔)(۲)

اس قسم کی متعدد احادیث کتبِ حدیث میں مروی ہیں، جن میں سے بعض میں مطلق اس بات کا ذکر ہے کہ دو یا تین بچے مرنے پر ماں باپ کو جنت میں داخلہ اور دوزخ سے نجات ملے گی اور بعض میں صبر و احتساب (یعنی ثواب کی نیت کرنے) کی قید بھی مذکور ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ جن احادیث میں یہ قید مذکور نہیں ہے ان کو بھی اسی قید پر محمول کیا جائے گا۔ (۳)

خلاصہ یہ کہ صبر و احتساب پر یہ فضیلت وارد ہے۔ لہٰذا کسی کے مرنے پر، اور بالخصوص اولاد کے مرنے پر خوب خوب صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے۔

---

(۱) مسلم:۴۷۷۰، نسائی:۱۸۵۴، احمد:۹۰۶۸

(۲) بخاری:۱۲۵۰، مسلم:۴۷۶۸، احمد:۱۰۸۶۹

(۳) فتح الباری:۳/۱۱۹

غیر شرعی رسومات

موت ہونے کے بعد معاشرے میں بہت سی غیر شرعی رسمیں رواج پا گئی ہیں، جن سے بچنا مسلمانوں کے لیے لازم وضروری ہے۔ یہاں ان اغلاط کا ذکر کیا جاتا ہے:

نوحہ کرنا : بہت سے لوگ، اور خاص طور پر عورتیں اپنے رشتہ داروں کی موت پر چیختی چلاتی ہیں اور اس مرنے والے کا نام پکار پکار کر روتی ہیں، اس کو عربی میں ''نوحہ'' کہا جاتا ہے۔ اسلام میں اس سے سختی سے منع کیا گیا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے، یعنی چیخنے چلانے کو جاہلیت کی باتوں میں شمار کیا ہے۔(۱)

اور اسی حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ نوحہ کرنے والی عورت کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا اور اس پر قطران (جو کولتار کے مانند ایک چیز ہوتی ہے) کے بنے ہوئے کپڑے ہوں گے اور آگ کی لپٹوں کی قمیص ہوگی۔(۲)

نیز حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عورتوں کو بیعت فرماتے تھے، تو ان سے اس بات کا بھی اقرار کراتے تھے کہ نوحہ نہیں کریں گی۔(۳)

ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر آئی، تو حضرت

---

(۱) مسلم:۱۵۵۰، ترمذی:۹۲۲، ابن ماجہ:۱۵۷۰، احمد:۲۱۸۲۹

(۲) مسلم:۱۵۵۰، ابن ماجہ:۱۵۷۰، احمد:۲۱۸۲۹

(۳) بخاری:۱۳۰۶، مسلم:۱۵۵۲، نسائی ۴۱۰۹، احمد:۱۹۸۶۱

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے، اسی دوران ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی عورتیں رو پیٹ رہی ہیں۔ آپ نے اس آدمی کو حکم دیا کہ وہ جا کر ان عورتوں کو اس سے منع کرے، وہ شخص گیا اور واپس آیا اور عرض کیا کہ میں نے ان عورتوں کو منع کیا؛ مگر وہ مانتی نہیں ہیں۔ آپ نے دوبارہ اس کو حکم دیا کہ وہ ان عورتوں کو جا کر منع کرے، وہ شخص پھر گیا اور واپس آ کر عرض کیا کہ وہ عورتیں مانتی نہیں ہیں اور مجھ پر واللہ! وہ غالب ہو رہی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال ہے کہ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا کہ ان عورتوں کے منہ میں مٹی ڈال دے۔(۱)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت پر چیخ پکار کر رونے والی اور (راضی ہو کر) اس کو سننے والی دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔(۲)

غرض یہ کہ اسلام میں چیخ پکار کر رونا، سخت ممنوع ہے اور اس پر شدید وعید آئی ہے، لہٰذا اس جاہلی طریقہ سے مسلمانوں کو پوری طرح پرہیز کرنا چاہئے۔

البتہ دل بھر کر خود بہ خود جو رونا آ جائے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں، تو اس میں کوئی مضائقہ و حرج نہیں؛ کیوں کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا رونا یہ فطری بات اور غیر اختیاری بات ہے اس کی شرع میں اجازت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحب زادی نے آپ کی خدمت میں قاصد بھیجا کہ آپ کو خبر دے کہ ان کا بچہ مرنے والا ہے، آپ

---

(۱) بخاری:۱۲۹۹، مسلم:۱۵۵۱، نسائی:۱۸۲۴، احمد:۲۳۱۷۷

(۲) ابو داود:۲۷۲۱، احمد:۱۱۱۹۲

نے قاصد سے فرمایا کہ ان کو جا کر کہہ دو کہ اللہ نے جو دیا، وہ بھی اسی کا ہے اور جو اس نے لے لیا وہ بھی اسی کا ہے، لھٰذا صبر کریں اور ثواب کی امید رکھیں۔ قاصد پھر آیا اور اس نے عرض کیا کہ وہ قسم دے رہی ہیں کہ آپ ضرور تشریف لائیں۔

آپ اٹھے اور ان کے مکان کی طرف چلے اور آپ کے ساتھ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی تھے، جب وہاں پہنچے تو آپ کے پاس وہ بچہ لایا گیا اور اس کی سانس اُکھڑ رہی تھی، آپ نے اس کو دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ (آنسو) کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا:

« هٰذِهِ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِ عِبَادِهِ وَاِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ. » (۱)

(یہ آنسو رحمت ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے، اور اللہ تعالیٰ صرف رحم کرنے والوں ہی پر رحم کرتا ہے۔)

اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے مرض الوفات میں ان کو غشی کی حالت میں دیکھ کر آپ رونے لگے اور جو صحابہ آپ کے ساتھ تھے وہ بھی رونے لگے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آنسو کے بہنے اور دل کے غمگین ہونے سے عذاب نہیں دیتا بلکہ اس (زبان) کی وجہ سے عذاب دیتا ہے یا رحم کرتا ہے یہ کہہ کر آپ نے اپنی زبانِ مبارک کی جانب اشارہ فرمایا۔ (۲)

نیز جب آپ علیہ السلام کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو

---

(۱) بخاری: ۱۲۰۴، مسلم: ۱۵۳۱، نسائی: ۱۸۴۵، ابو داؤد: ۲۷۱۸، احمد: ۲۰۷۷۷، ابن ماجہ: ۱۵۷۷

(۲) بخاری: ۱۲۲۱، مسلم: ۱۵۲۲

آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷛ نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی روتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ رحم کی وجہ سے ہے، پھر آپ نے ارشاد فرمایا:

«ان العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول الا ما يرضى ربنا وانا بفراقك يا ابراهيم لمحزونون.» (۱)

(بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے؛ لیکن ہم نہیں کہتے؛ مگر صرف وہ بات جو ہمارے رب کو پسند ہے۔ اے ابراھیم! تیری جدائی سے ہم غم گین ہیں۔)

حاصل یہ کہ طبعی غم اور غیر اختیاری رونا، الگ چیز ہے اور جائز ہے اور انسانی ہم دردی کا اور فطرت کا تقاضا بھی ہے، اور چیخنا، پکارنا، چلانا حرام اور ناجائز ہے۔

چہرہ پیٹنا یا نوچنا

بعض لوگ غم کے اظہار کے لیے چہرہ پر مار لیتے یا چہرہ کو نوچتے ہیں۔ حدیث میں اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے گالوں پر مارے اور اپنا گریبان پھاڑے، اور جاہلی رسوم کو اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ (۲)

کپڑے اور گریبان پھاڑنا

بعض لوگوں میں یہ رسم ہے کہ اظہارِ غم کے لیے اپنے کپڑے پھاڑ لیتے ہیں۔ یہ بھی جیسا کہ اوپر کی حدیث سے معلوم ہوا، ممنوع ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ

---

(۱) بخاری:۱۲۰۲، مسلم:۴۲۷۹، ابو داؤد:۲۷۱۹، احمد:۱۲۵۴۴

(۲) بخاری:۱۲۹۴، مسلم:۱۴۸، ترمذی:۹۲۰، نسائی:۱۸۳۷، ابن ماجہ:۱۵۷۳، احمد:۳۴۷۶

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ہم میں سے نہیں جو (اظہارِ غم کے لیے) سر مونڈے اور کپڑے پھاڑے اور چیخے چلائے۔(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس عورت سے بری ہوں جو چیخنے والی، سر مونڈنے والی اور کپڑے پھاڑنے والی ہو۔(۲)

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے اس عورت پر جو اپنے چہرہ کو نوچنے والی، اپنے گریبان کو پھاڑنے والی اور خرابی اور موت کو پکارنے والی ہو۔(۳)

ایک روایت میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو سر مونڈے، کپڑے پھاڑے اور چیخ کر روئے۔(۴)

ان احادیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ اظہارِ غم کے لیے کپڑے پھاڑنا اور گریبان چاک کرنا غیر اسلامی حرکت ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اظہارِ غم کے لیے بال نوچنا، سر مونڈنا، اور خرابی و موت کو پکارنا وغیرہ حرکات بھی غیر اسلامی اور ممنوع ہیں؛ مگر افسوس کہ بعض گھروں میں یہ ساری جاہلانہ رسمیں اور حرکات رائج ہیں۔ اہلِ اسلام کو چاہئے کہ ان تمام غیر اسلامی رسومات و حرکات سے دور رہیں۔

چوڑیاں پھوڑنا یا توڑنا

عوام میں یہ بھی دستور ہے کہ جب کسی کا شوہر مرجاتا ہے، تو اس کی عورت کی

---

(۱) نسائی:۱۸۶۰،ابو داؤد:۳۱۳۰؛ابن ماجہ:۱۵۸۵،احمد:۱۸۸۵۹

(۲) مسلم:۱۴۹، نسائی:۱۸۳۸،احمد:۱۸۷۲۶

(۳) ابن ماجہ:۱۵۸۴،حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔(فتح الباری: ۳/۱۶۶)

(۴) احمد :۱۸۸۰۰،نسائی:۱۸۴۴

چوڑیاں وبنگڑیاں دوسری عورتیں، یا وہ خود پھوڑ دیتی ہے، یہ بھی ایک فضول اور غیر اسلامی رسم ہے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے موقعہ پر عورت کو صرف یہ حکم ہے کہ وہ زیب وزینت کی چیزیں استعمال نہ کرے؛ مگر ان چیزوں کو توڑنے یا پھوڑنے کا حکم و اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ مال کی اضاعت ہے جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے، چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تین باتیں ناپسند کی ہیں: ایک قیل وقال یعنی بے فائدہ بحث و مباحثہ، دوسرے سوالات کی کثرت، تیسرے مال کی اضاعت، یعنی مال کو ضائع کرنا۔ (۱)

نیز اس رسم میں غیر قوموں (ہندوؤں) سے مشابہت بھی ہے، کیوں کہ ہندو لوگوں میں یہ رسم ہے کہ کسی عورت کا شوہر جب انتقال کر جاتا ہے، تو اس کی چوڑیاں توڑ دی جاتی ہیں، یا وہ عورت خود ہی اپنی چوڑیاں توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ غیروں کی رسموں کو اختیار کرنا ناجائز ہے، ایک حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« من تشبه بقوم فهو منهم . » (۲)

(جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اسی قوم میں سے شمار ہوگا۔)

اور دوسری حدیث میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے:

« ليس منا من تشبه بغيرنا . » (۳)

---

(۱) بخاری: ۲۴۰۸، مسلم: ۳۲۳۷، احمد: ۱۷۴۴۵، دارمی: ۲۶۳۳

(۲) ابو داؤد: ۳۵۱۲، احمد: ۴۸۶۸

(۳) ترمذی: ۲۶۱۹ قال الترمذی: هذا حديث ضعيف

ان احادیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص غیر قوموں سے مشابہت اختیار کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں؛ بل کہ وہ انہی میں شمار کیا جائے گا۔

گیہوں یا نمک کی تقسیم

اکثر لوگوں میں رواج ہے کہ گھر میں کسی کا انتقال ہوتے ہی نمک یا گیہوں تقسیم کرتے ہیں اور بعض جگہ دیکھا گیا کہ شربت پلاتے ہیں۔ یہ کام اگر ثواب کی نیت سے کریں تو اگرچہ فی نفسہ جائز ہے؛ مگر ظاہر ہے جس کام کا شریعت میں حکم نہ ہو اور وہ کام شرع نے مقرر نہ کیا ہو، اس کو اپنی طرف سے مقرر کر لینا دین میں اضافہ اور بدعت ہے۔ رہا ثواب تو وہ روپیہ، پیسہ، چاول، آٹا، کپڑا وغیرہ کسی بھی چیز کے دینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ نمک یا گیہوں کی تخصیص کی کوئی وجہ معقول نہیں ہے۔ اس لیے اس رسم کو بھی ترک کرنا چاہیے۔

موت کی خبر یا اعلان

موت ہونے کے بعد دوست، احباب، اور رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو اس کی اطلاع وخبر دینا چاہئے؛ تاکہ لوگ اس کا جو حق ان پر ہے یعنی اس کی نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے حق میں دعا کرنا، اس کو ادا کر سکیں۔(۱)

حضرات صحابہ کا معمول بھی حضور علیہ السلام کے زمانہ میں یہی تھا، چناں چہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم میں سے کسی کے انتقال کا وقت ہوتا، تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دیتے، آپ تشریف لاتے اور اس کے حق میں استغفار کرتے، یہاں تک کہ جب اس کا انتقال ہوجاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوجاتے، اور کبھی آپ اور آپ کے ساتھی تدفین تک تشریف رکھتے یہاں تک کہ تدفین ہوجاتی؛ مگر اس میں کبھی بہت تاخیر ہوجاتی، تو بعض صحابہ نے بعض سے کہا کہ اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے اطلاع نہ دیں اور انتقال کے بعد اطلاع دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس میں مشقت اور پریشانی نہ ہوگی، چناں چہ پھر ہم ایسا ہی کرنے لگے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کے انتقال کے بعد خبر دی جاتی اور آپ تشریف لاتے اور اس کی نماز جنازہ پڑھتے اور کبھی واپس ہوجاتے اور کبھی تدفین تک تشریف رکھتے، ایک زمانہ تک ہم ایسا ہی کرتے رہے، پھر ہم نے کہا کہ کیوں نہ ہم آپ کے پاس ہی جنازہ اٹھا کر لے جائیں، کہ اس میں آپ کے لیے

(۱) در مختار مع شامی:۲/۱۹۳، عالمگیری:۱/۱۵۷، الجوهرة النيرة:۱/۱۴۷

زیادہ راحت ہے؟ چناں چہ ہم ایسا ہی کرنے لگے اور یہی رواج آخر تک رہا۔(۱)

احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے کہ موت ہونے پر اس کی اطلاع دی جائے، چناں چہ ایک شخص کا انتقال ہوا اور اس کو راتوں رات دفن کر دیا گیا، صبح اس کا ذکر ہوا تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو کس بات نے مجھے اس کی خبر دینے سے منع کیا؟(۲)

اسی طرح ایک آدمی یا عورت تھی جو مسجد کی خدمت کرتی تھی اس کا انتقال ہوا تو صحابہ نے اس کے معاملہ کو معمولی سمجھ کر اس کو دفن کر دیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد میں اطلاع کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے مجھے کیوں اطلاع نہیں کی؟(۳)

بہ ہر حال موت کی خبر و اطلاع کرنا پسندیدہ ہے، کہ لوگ اس کے حق میں دعا کریں گے اور اس کی نماز جنازہ میں شرکت کریں گے، جیسا کہ بدائع اور شامی میں ہے، اور اگر مرنے والا کوئی مقتدا عالم و بزرگ ہے، تو اس کی خبر بازاروں اور سڑکوں پر بھی دی جا سکتی ہے۔(۴)

ایک جاہلی رسم

یہ تو ہوا موت کی خبر کا مسئلہ؛ مگر موت کی خبر کی ایک اور صورت ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اور وہ جاہلیت کی رسم ہے وہ یہ کہ کوئی شخص گھروں کے دروازوں پر اور

---

(۱) سنن البیہقی:۷۲۸۲

(۲) بخاری:۱۲۴۷،ابن ماجہ :۱۵۱۹، سنن کبریٰ للبیہقی :۷۱۱۱

(۳) بخاری:۱۵۸۸،مسلم:۴۵۸،ابو داؤد:۲۷۸۸،ابن ماجہ:۱۵۱۶، احمد:۸۴۸۰

(۴) بدائع الصنائع :۲/۲۲،شامی۲/۱۹۳

بازاروں میں موت کا اعلان کرتا پھرتا تھا اور زور زور سے چیختا تھا۔(۱)

شریعت میں اس سے منع کیا گیا ہے حدیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعی یعنی اعلانِ موت سے منع کیا ہے۔(۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

« ایاکم و النعی فان النعی من عمل الجاهلیة » (۳)

(تم موت کے اعلان سے بچو؛ کیوں کہ یہ جاہلیت کے کاموں میں سے ہے۔)

یہاں یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ موت کی خبر دینا تو سنت ہے؛ مگر اس کا اعلان عام لوگوں کے لیے جائز نہیں، اور خبر و اعلان کا فرق یہ ہے کہ خبر تو کسی شخص یا چند افراد تک پہنچ کر اس کو بتانا ہے اور اعلان یہ ہے کہ کسی جگہ سے آدمی اذان کی طرح موت کی خبر کا پروپگنڈا کرے۔ امام مالک رحمۃ اللہ نے اسی لیے فرمایا کہ میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ موت کے اعلان کے لیے مساجد کے دروازوں پر زور زور سے چیخیں۔ ہاں اگر مساجد میں لوگوں کے حلقوں کے پاس جا کر اس کی خبر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۴)

اسی سے معلوم ہو گیا کہ بعض جگہ جو مساجد کے میناروں سے اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ عام لوگوں کے انتقال کی خبر دی جاتی ہے، یہ درست نہیں۔ کیوں کہ یہ اعلانِ موت ہے، جس سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں اگر مساجد میں اطلاع کی خاطر نمازیوں کے درمیان بات پہنچا دی جائے، تو درست ہے۔

---

(۱) فتح الباری:۳/۱۱۶

(۲) ترمذی :۹۰۷،ابن ماجه:۱۴۶۵، احمد:۲۲۳۵۸

(۳) ترمذی :۹۰۶

(۴) سنن کبری:۴۴۹/۵

بعض لوگ موت کی خبر اخباروں میں شائع کراتے ہیں اور میت کی تصویر بھی شائع کراتے ہیں۔ خبر کسی ضرورت سے اخبار میں دیں، مثلاً کوئی معروف شخصیت ہے اس کی موت کی اطلاع پہنچانے کے لیے یا دعا کی درخواست کے لیے، تو جائز ہے؛ مگر تفاخر کے لیے ہو تو درست نہیں، پھر تصویر شائع کرنا تو کسی حال میں بھی جائز نہیں کیوں کہ اسلام میں تصویر حرام و ناجائز ہے اس لیے ان باتوں سے بچنا چاہئے۔

تعزیتِ اقرباءواحباء

جب کوئی مرجائے تو اس کے گھر والوں اور اس سے تعلقِ خاطر رکھنے والوں کو تسلی دینا اور صبر کی تلقین کرنا اور ان کے حق میں دعا خیر کرنا، بڑی عبادت اور مسلمان کا حق ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

« ما من مؤ من یعزی اخاہ بمصیبة الا کساہ اللّٰہ سبحانه من حلل الکرامة یوم القیامة . » (۱)

(جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی اس کی مصیبت میں تعزیت اور تسلی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن کرامت کے کپڑے پہنائے گا۔)

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مصیبت زدہ کی تسلی کرتا ہے اس کو اسی کی طرح اجر ملتا ہے۔(۲)

تعزیت کے شرعی احکام

(۱) تعزیت وتسلی کیسے کی جاتی ہے اس کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ یہ احادیث سے معلوم ہوگا:

تعزیت ان الفاظ میں کریں، جیسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

---

(۱) ابن ماجہ:۱۵۹۰

(۲) ترمذی:۹۹۳،ابن ماجہ:۱۵۹۱،

”جو اللہ نے لے لیا وہ بھی اللہ کا ہے اور جو اس نے دیا وہ بھی اللہ کا ہے اور اللہ کے پاس ہر چیز ایک مقررہ مدت تک کے لیے ہے لہٰذا تم صبر کرو اور ثواب حاصل کرو“۔(۱)

یہ جملے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحب زادیوں میں سے ایک کے لڑکے کی وفات پر ان صاحب زادی کو بہ طور تسلی و تعزیت قاصد کے ذریعہ فرمائے تھے۔

اور ایک حدیث میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے لڑکے کی وفات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعزیتی پیغام مذکور و مروی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کروا کر روانہ کیا تھا، اس خط کے چند جملے یہ ہیں:

”تمہارا لڑکا اللہ کی خوش گوار نعمتوں میں سے ایک نعمت تھا، تم کو اس کے ذریعہ اللہ نے قابل رشک و لائق سرور نفع دیا اور اب اجر عظیم، رحمت و مغفرت و ہدایت کے بدلے اس کو اٹھا لیا، اگر تم صبر سے کام لو۔ اور دیکھو! تمہارا رونا دھونا تمہارے اجر کو ضائع نہ کر دے، پھر تم کو پشیمانی ہوگی۔(۲)

اس طرح تسلی دینا چاہئے۔

(۲) میت کے گھر والوں اور ان کے مہمانوں کے لیے کھانا پکا کر بھیجا جائے، یہ بھی ایک طریقۂ تعزیت ہے اور سنت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیوں کہ ان پر ایسی مصیبت آئی ہے کہ وہ کھانا تیار کر نہیں سکتے۔(۳)

---

(۱) بخاری:۱۳۸۴،مسلم:۱۵۳۱،نسائی:۱۸۴۵،ابو داؤد:۲۷۱۸،احمد:۲۰۷۷۷

(۲) حصن حصین:۲۴۶

(۳) ترمذی:۹۱۹، ابو داؤد:۲۷۲۵، ابن ماجہ:۱۵۹۹

(۳) تعزیت تین دن تک کرنے کی اجازت ہے، اس کے بعد اجازت نہیں۔ ہاں! اگر کوئی موجود نہیں تھا یا اس کو موت کی خبر دیر سے ملی تو بعد میں بھی جائز ہے۔(۱)

تعزیت اور غیر اسلامی رواجات

تعزیت کے بارے میں بھی شرعی و اسلامی احکام و آداب سے ناواقفیت کی بنا پر لوگ بہت سی غیر اسلامی رسمیں اختیار کیے ہوئے ہیں جن کو ترک کرنا ضروری ہے۔

(۱) تعزیت کرنے والے میت کے وارثین کو تسلی و دعا دینے کے بہ جائے، ان کو اور زیادہ بے صبر او بے چین کر دیتے ہیں، لپٹ لپٹ کر روتے، ان کے بچوں کو دیکھ کر پریشانی کا اظہار کرتے ہیں؛ حالاں کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ تعزیت کیسی ہوتی ہے؟ اس میں تسلی، دعا و صبر کی تلقین ہونا چاہئے۔ مگر افسوس کہ آج معاشرہ اسلامی تعلیمات سے اتنا دور ہو چکا ہے کہ تعزیت کرنے والا اگر نہ روئے، بے قراری و بے چینی کا مظاہرہ نہ کرے، تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو میت سے نہ محبت ہے نہ اس کے مرنے پر غم۔ یہ دراصل اسلامی تعلیم سے غفلت و جہالت کا نتیجہ ہے۔

(۲) تعزیت تین دن کے بعد مکروہ ہے، اسی طرح بار بار تعزیت کرنا بھی مکروہ ہے۔(۲)

مگر بعض لوگ اس میں بھی خلاف کرتے ہیں اور جب جب جاتے ہیں، موت کا مسئلہ چھیڑ کر میت کے وارثین کے حزن و غم کو تازہ کرتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ ہاں کوئی شخص کہیں باہر گیا تھا اور موت کے تین دن بعد آیا، یا کسی کو تین دن کے بعد ہی اطلاع ہوئی تو اس کے لیے درست ہے کہ وہ تین دن کے بعد جا کر تعزیت ادا کرے۔(۳)

---

(۱) الجوهرة النيرة :۱/۱۵۹

(۲) الجوهرة النيرة :۱/۱۵۹ ، در مختار مع شامی:۲/۲۴۱ شرح المهذب:۵/۲۷۷

(۳) الجوهرة:۱/۱۵۹

(۳) قبر کے پاس تعزیت ادا کرنا بھی مکروہ ہے، کیوں کہ یہ موقعہ مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب اور دعا کا ہے، حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قبر کے پاس تعزیت بدعت ہے۔(۱)

(۴) بعض جگہ میت کا وارث گھر کے دروازہ پر یا راستہ میں کرسی یا حصیر ڈال کر بیٹھ جاتا ہے؛ تاکہ لوگ آکر تعزیت ادا کریں۔ یہ بھی مکروہ اور جاہلیت کی رسم ہے۔(۲)

علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اکثر ائمہ متاخرین نے فرمایا کہ میت کے گھر والوں کے پاس اجتماع مکروہ ہے۔ اور اس کے لیے اپنے گھر میں بیٹھا رہنا؛ تاکہ لوگ آکر تعزیت کریں، مکروہ ہے؛ بل کہ جب دفن سے فارغ ہوکر لوگ چلے جائیں تو سب کو اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جانا چاہئے، اسی طرح گھر والے کو بھی اپنے کام میں لگ جانا چاہئے۔(۳)

---

(۱) شامي :۲/۲۴۱

(۲) البحر الرائق:۲/۱۹۲،شامي:۲/۲۴۱،شرح المهذب:۵/۲۷۸،المغني:۲/۳۴۲

(۳) شامي :۲/۲۴۱

سوگ یعنی غم منانا

کسی کے مرجانے پر غم وحزن کا ہونا ایک فطری امر ہے۔ پھر تعلق ومحبت کی کمی بیشی کے اعتبار سے غم وحزن میں بھی کمی بیشی ہونا ایک واقعاتی چیز ہے۔ اسی لیے شریعت نے سوگ یعنی غم منانے کے بارے مین بھی شرعی احکام دے کر، اس فطری و واقعاتی امر کی رعایت فرمائی ہے، اس کے احکام کتب فقہ میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، یہاں چند اہم امور پیش کرتا ہوں:

کسی کے مرنے پر تین دن سوگ منانے کی اجازت ہے، تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں۔ البتہ عورت اپنے شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ منائے گی، یہ اس پر لازم وضروری ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی بھی عورت کے لیے، جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے، جائز نہیں کہ کسی کے مرنے پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے؛ مگر بیوی اپنے شوہر کے مرنے پر چار ماہ دس دن سوگ منائے گی۔(۱)

شوہر کے انتقال پر عورت کو سوگ میں رہنا واجب ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر تمام علما کا اجماع ہے۔(۲)

البتہ اس کی تفاصیل میں اختلاف ہوا ہے۔ مثلاً امام شافعی رحمۃ اللہ اور جمہور

(۱) بخاری: ۱۲۸۰، مسلم: ۲۷۳۰، ترمذی: ۱۱۱۲، نسائی: ۳۴۴۳، ابوداؤد: ۱۹۵۴، احمد: ۲۵۵۴۰، مالک: ۱۰۹۷، دارمی: ۲۱۸۳

(۲) شرح مسلم للنووی: ۱/۴۸۶

علما کے نزدیک نابالغ لڑکی بھی بیوہ ہو جائے، تو سوگ میں رہنا اس پر واجب ہے؛ مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے مسلک میں نابالغ لڑکی پر سوگ نہیں ہے۔(۱)

سوگ کے دنوں میں زیب وزینت کی تمام چیزوں کو ترک کر دینا ضروری ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سوگ میں رہنے والی عورت نہ سرمہ لگائے، نہ رنگین کپڑا پہنے، نہ عطر لگائے، البتہ حیض سے پاک ہونے پر اس کی اجازت ہے۔(۲)

نیز بعض احادیث میں اس عورت کو کنگھی کرنے سے بھی منع کیا ہے۔(۳)

اور بعض میں خضاب لگانے سے بھی روکا گیا ہے۔(۴)

نیز ایک حدیث میں ایسی عورت کو زیورات پہننے سے منع کیا گیا ہے۔(۵)

نیز خوش بودار تیل سے کنگھی کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔(۶)

ان تمام احادیث کے پیشِ نظر، علما نے عدت میں رہنے والی عورت کے لیے ہر اس چیز کو منع کر دیا ہے، جو زیب وزینت کی ہو۔ البتہ ضرورت کے موقعہ پر تیل ڈالنے کی اجازت دی گئی ہے۔

عورت سوگ کے ایام میں چوں کہ عدت میں ہوگی، اس لیے اس کو اپنے ہی شوہر کے گھر، ان ایام میں رہنا چاہئے، باہر نکلنا، ادھر ادھر جانا، کسی تقریب میں شرکت کرنا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کے انتقال پر حضورِ اکرم

---

(۱) در مختار مع شامی:۳/۳۲۷،شرح مسلم :۱/۴۸۶

(۲) بخاری:۳۱۳،مسلم:۲۷۳۹،نسائی: ۳۴۷۸،ابو داؤد:۱۹۵۹،ابن ماجہ:۲۰۷۸، احمد:۱۹۸۶۴

(۳) نسائی:۳۴۸۱،ابو داؤد:۱۹۶۱

(۴) نسائی:۳۴۸۰،ابو داؤد:۱۹۶۰

(۵) ابو داؤد:۱۹۶۰،احمد:۲۵۳۶۹

(۶) نسائی:۳۴۸۱،ابو داؤد:۱۹۶۱

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا، کہ میرے شوہر کے گھر سے میرے خاندان والوں میں منتقل ہو جانا چاہتی ہوں، پھر کچھ حالات پیش کیے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اجازت دی، پھر جب وہ جانے لگیں تو بلا کر فرمایا کہ نہیں، تم اسی اپنے گھر میں عدت ختم ہونے تک رہنا۔(۱)

اکثر علما کا یہی مذہب ہے، (کما قال الترمذی رحمۃ اللہ) البتہ کوئی شدید ضرورت ہو تو علما سے فتوی لے کر نکل سکتی ہے۔

سوگ اور غیر اسلامی رسومات

سوگ اور عدت سے متعلق غیر شرعی رسمیں جو عوام الناس میں رائج ہیں اور ان سے پرہیز کرنا لازم ہے، وہ یہ ہیں:

گھروں میں کئی کئی ماہ تک سوگ منایا جاتا ہے، جب کہ تین دن سے زیادہ سوگ کرنا، سوائے شوہر کے کسی کے لیے جائز نہیں، جیسا کہ اوپر احادیث شریفہ کے حوالے سے بیان ہوا۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا لڑکا فوت ہوا تو تیسرے دن انہوں نے زرد خوشبو منگوا کر استعمال کیا اور کہا کہ ہم کو شوہر کے سوا کسی اور پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔(۲)

بعض گھرانوں میں رواج ہے کہ کسی کے مرجانے پر پہلی عید منانے کو برا خیال کرتے ہیں اور عید و بقر عید کے دن سوگ مناتے ہیں۔ یہ ناجائز و بدعت ہے۔(۳)

---

(۱) ابو داؤد: ۱۹۵۷، ترمذی: ۱۱۲۵، نسائی: ۳۴۷۰، ابن ماجه: ۲۰۲۱، احمد: ۲۵۸۴، مالک: ۱۰۸۱، دارمی: ۲۱۸۵

(۲) بخاري: ۱۲۷۹

(۳) اصلاح الرسوم: ۱۲۴

بعض جدید ذہنیت کے لوگوں میں بیوی، اپنے شوہر کی وفات پر نہ سوگ کرتی ہے نہ عدت گذارتی ہے؛ بل کہ عام دنوں کی طرح زیب وزینت بھی کرتی ہے اور گھر کے باہر بازاروں اور تقریبوں میں بھی جاتی ہے، یہ حرام و ناجائز ہے۔

بعض جگہ سنا گیا کہ عورتیں، اپنے شوہر کی قبر پر جا کر، عدت کے دنوں میں باہر نکلنے کی اجازت لیتی ہیں اور جہاں چاہتی ہیں، جاتی ہیں۔ یہ اجازت شرعاً معتبر نہیں؛ بل کہ فضول اور لغو ہے اور کسی کے اجازت دینے سے بھی یہ حکمِ خداوندی ٹل نہیں سکتا، لہٰذا اس طرح کی جاہلی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

سوگ کے دن ختم ہونے پر بعض جگہ ایک رسم منائی جاتی ہے کہ تمام خاندان کی اور جان پہچان کی عورتین جمع ہوکر، بیوہ کو گھر سے باہر نکالتی ہیں۔ گویا عدت کو ختم کرنے کے لیے یہ سمجھتی ہیں کہ اس بیوہ کو پکڑ کر باہر نکالنا ضروری ہے۔ یہ بھی ایک فضول رسم ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جب سوگ کے ایام ختم ہوں گے تو خود بہ خود عورت عدت سے نکل جاتی ہے، اگر چہ وہ گھر ہی میں رہے اور باہر بھی نہ نکلے، اس کو نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔(۱)

---

(۱) اصلاح انقلاب امت:۲/ ۱۷۵

میت کا دیدار کرنا

کسی انسان کے مرنے کے بعد اس کا دیدار اور زیارت کرنا جائز ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کا چہرہ انور کھولا پھر جھک کر بوسہ دیا پھر روئے اور فرمایا کہ قسم بہ خدا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالی دو موتیں جمع نہیں کرے گا: ایک موت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی جا چکی تھی، وہ تو آ چکی۔ (۱)

اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد جا کر ان کو بوسہ دیا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (۲)

معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد دیدار کرنا درست ہے، ظاہر ہے کہ بوسہ دینا دیکھنے کے بعد ہی ہوگا؛ البتہ اس سلسلہ میں عوام میں بعض اغلاط رائج ہیں ان کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

دیدار کے متعلق بعض اغلاط

اکثر جگہ رواج ہے کہ میت نامحرم بھی ہو، تو اس کا دیدار کرتے ہیں؛ بل کہ عورتیں تو خاص طور پر میت کے پاس ہی جمع ہو کر بیٹھتی ہیں۔ یاد رہے کہ جس طرح زندگی میں

---

(۱) بخاری: ۱۲۴۲، نسائی: ۱۸۱۸، ابن ماجہ: ۱۶۱۶، احمد: ۲۳۷۱۸

(۲) ابو داؤد: ۲۷۵۰، ابن ماجہ: ۱۴۴۹، ترمذی: ۹۱۰، احمد: ۲۳۰۳۶

نامحرم کو دیکھنا جائز نہیں اسی طرح مرنے کے بعد بھی نامحرم کا دیدار نا جائز ہے۔(۱)

اسی لیے علما نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ میت کو غسل صرف وہ دے سکتا ہے جس کے لیے میت کو دیکھنا جائز ہے، جو میت کو دیکھ نہیں سکتا وہ میت کو غسل بھی نہیں دے سکتا۔(۲)

اگر ہر ایک کو دیکھنے کی اجازت ہوتی تو یہ لکھنا عبث و بیکار ہوتا۔لہٰذا معلوم ہوا کہ نامحرم مرد وعورت کو مرنے کے بعد بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔

بعض لوگوں میں مشہور ہے کہ مرنے کے بعد بیوی کا چہرہ شوہر نہیں دیکھ سکتا؛ مگر یہ بات غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو مرنے کے بعد دیکھ سکتا ہے، ہاں! بلا ضرورت اس کو چھو نہیں سکتا۔(۳)

میت کے دیدار کے لیے لوگوں کا ایسا انتظار کرنا کہ تاخیر ہونے لگے، یہ بھی جائز نہیں۔کیوں کہ میت کو جلد سے جلد اس کی منزل تک پہنچانے کا حکم ہے۔(۴)

بعض جگہ؛ بل کہ اکثر جگہ نماز جنازہ کے بعد اور بعض جگہ قبر کے پاس اور قبر میں رکھنے کے بعد بھی دیدار کراتے ہیں یہ سب رسمیں ترک کرنے کے قابل ہیں۔(۵)

---

(۱) اصلاح انقلاب:۱/ ۲۳۷

(۲) البحر الرائق :۲/۱۷۴،الشامی:۲/ ۱۹۸

(۳) در مختار مع شامی:۲/ ۱۹۸

(۴) حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میں گذارش کرتا ہوں کہ......رونمائی (دیدار) کی رسم نہ کی جائے، انتقال سے کفن تک جس قدر لوگوں کو چاہیں جمع کر لیں، اس کے بعد تاخیر کی گنجائش نہیں۔

(مجالس ابرار ملخصاً:۲/۸۹)

(۵) قبر میں رکھنے کے بعد دیدار کرانے کے بارے میں عالمگیری میں ہے:

"لابأس بان يرفع سترالميت ليرى وجهه وانما يكره ذلك بعد الدفن"۔ (الهنديه:۵/۳۵۱)..............................

اصول یہ ہے کہ میت کو جلد سے جلد اس کی منزل کو پہنچا دیا جائے، اور اس میں تاخیر نہ کی جائے اور قبر میں رکھنے کے بعد دیدار کرانا تو بہت سخت اور سنگین غلطی ہے۔

کفن و دفن میں جلدی

شریعت کا حکم یہ ہے کہ مرنے کے بعد فوراً غسل، کفن و دفن کا انتظام کیا جائے، اور جتنی جلدی ہو سکے اس کی فکر کی جائے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت طلحہ بن براء ﷺ بیمار ہوئے تو اللہ کے رسول ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لائے اور فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ طلحہ کی موت آگئی ہے، جب ان کا انتقال ہو جائے تو مجھے خبر دینا اور تم تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا؛ کیوں کہ مسلمان میت کو گھر والوں میں زیادہ دیر تک رکھنا مناسب نہیں۔(۱)

نیز احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ جنازہ میں جلدی کرو، میت اگر نیک و صالح ہے تو وہ جگہ اس کے لیے بہتر ہے جس کی طرف تم اس کو لے جا رہے ہو، اور اگر میت نیک نہیں ہے تو وہ شر ہے، اس کو جلدی سے اپنے سے دفع کرو۔(۲)

..............اس کا مفاد حسب اصطلاحِ فقہا، خلاف اولیٰ ہے اور اس سلسلہ میں ایک حدیث آئی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قبر میں مت جھانکو، قبر ایک امانت ہے، اگر جھانک کر دیکھو گے تو کہیں یہ منظر نہ دکھائی دے کہ کالا سانپ مردے کی گردن میں طوق کی طرح پڑا ہے، اور کہیں یہ حکم اللہ تعالیٰ نہ دیں کہ قبر سے زنجیر کی آواز تم کو سنائی دے؛ مگر اس حدیث کو علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ اور علامہ السیوطی رحمہ اللہ نے موضوع قرار دیا ہے۔

(الموضوعات:۳/۲۳۵،اللآلي المصنوعة:۲/۴۲۷)

(۱) ابو داؤد:۲۷۴۷

(۲) طحاوی:۱/۲۳۰،بخاری:۱۲۳۱، مسلم :۱۵۶۸،ترمذی،۹۳۶،نسائی :۱۸۸۴، ابو داؤد:۲۷۶۷، ابن ماجہ:۱۴۶۶،احمد:۶۹۶۹ ،مالک:۵۱۲

تاخیر کی غلط رسم

مگر افسوس کہ آج عام طور پر اس میں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے، بعض جگہ ایک ایک دن، بعض جگہ دو دو دن تک، میت کو گھر میں رکھے رہتے ہیں، بعض لوگ دور رہنے والے رشتہ داروں کے لیے تاخیر کرتے ہیں؛ حالاں کہ ان کا تجہیز و تکفین میں شریک ہونا ضروری نہیں، اصل تو دعا ہے، جو دور سے بھی ہو سکتی ہے۔ ایک غیر ضروری چیز کے لیے، ضروری کام میں غفلت نہایت درجہ غلط بات ہے۔ دیکھئے حضرت ابو بکر صدیق ﷛ دنیائے اسلام کے امیر و خلیفۃ المسلمین ہیں، ان کا انتقال رات میں ہوتا ہے اور صبح ہونے سے پہلے صحابہ ان کی تدفین سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ (۱)

---

(۱) بخاري: ۱۳۸۷، احمد: ۲۳۸۵۶، تاريخ الخلفاء للسيوطي: ص: ۷۹، البداية والنهاية: ۷/ ۱۵

میت کا غسل

غسل میت کا طریقہ

میت کو غسل دینے کے لیے، سب سے پہلے کسی تخت یا بڑے تختے کا انتظام کرلیں، اس کو اگربتی یا عود (لوبان) وغیرہ سے تین دفعہ یا پانچ دفعہ یا سات دفعہ چاروں طرف دھونی دیکر میت کو اس پر لٹادیں اور بدن سے کپڑے اتارلیں اور کوئی کپڑا ناف سے لے کر زانو تک اڑھادیں۔(۱)

پھر میت کو استنجاء کرائیں، لیکن اس کی رانوں اور شرم گاہ کو ہاتھ نہ لگائیں اور نہ اس پر نگاہ ڈالیں؛ بل کہ اپنے ہاتھ میں کوئی کپڑا لپیٹ لیں اور میت پر جو کپڑا پڑا ہے اس کے اندر ہاتھ ڈال کر استنجا کرائیں۔(۲)

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ:

« لا تبرز فخذک ولا تنظر الی فخذ حی ولا میت » (۳)

(اپنی ران کسی کے سامنے نہ کھولو اور نہ کسی زندہ یا مردہ کی ران کی طرف نظر کرو)

نیز حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد

---

(۱) مراقي الفلاح :۱۴۰،در مختار مع شامي:۲/ ۱۹۵

(۲) مراقي الفلاح :۱۴۰،در مختار مع شامي:۲/ ۱۹۵

(۳) ابو داؤد :۳۲ ۲۷،ابن ماجه:۱۴۴۹،احمد:۱۱۸۴،بيهقي :۶۷۲۰

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو غسل دیا تو اپنے ہاتھوں پر کپڑا لپیٹ لیا تھا۔(۱)

پھر وضو کرائیں جیسے نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے۔حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی لڑکی کا انتقال ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ پہلے وضو کے اعضا سے غسل شروع کریں۔(۲)

مگر کلی کرانے اور ناک میں پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں، ہاں اگر میت حیض، نفاس یا جنابت کی حالت میں ہے تو کلی کرانا اور ناک میں پانی ڈالنا چاہئے۔(۳)

پہلے منہ پھر کہنیوں سمیت ہاتھ دھلائیں پھر سر کا مسح کرائیں، پھر پیر دھلائیں اور کپڑے کو تر کر کے دانتوں کو صاف کریں اور ناک کے سوراخوں میں کپڑا پھیر دیں۔(۴)

ناک، منہ اور کان میں روئی رکھ دیں؛ تاکہ پانی اندر نہ جانے پائے، پھر سر کو صابون وغیرہ سے اچھی طرح دھودیں، پھر میت کو بائیں کروٹ پر لٹا کر بیری کے پتے ڈال کر، پکایا ہوا پانی نیم گرم، تین دفعہ سر سے پیر تک ڈالیں یہاں تک کہ وہ پانی تخت کو لگے ہوئے حصہ تک پہنچ جائے، پھر داہنی کروٹ پر لٹا کر، اسی طرح تین مرتبہ پانی ڈالیں، پھر میت کو کوئی شخص اپنے بدن سے ٹیک لگا کر بٹھائے اور پیٹ کو آہستہ آہستہ ملے اور دبائے، اگر نجاست نکلے تو اس کو صاف کردے، پھر میت کو بائیں کروٹ پر لٹا کر، کافور پڑا ہوا پانی سر سے پیر تک تین دفعہ ڈالیں اور کسی صاف کپڑے سے

---

(۱) بیہقی:۶۷۲۰

(۲) بخاری:۱۱۷۷، مسلم:۱۵۶۰، نسائی:۱۸۶۱،ابو داؤد:۲۷۳۵

(۳) کتاب الآثار للامام ابی یوسف رحمۃ اللہ :۷۶،در مختار مع شامی:۱۹۶/۲

(۴) مراقی الفلاح :۱۴۰،البحر الرائق:۱۷۳/۲

بدن کو صاف کر دیں۔(۱)

حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی لڑکی کے انتقال پر ان کے غسل کے بارے میں عورتوں کو حکم دیا کہ تین دفعہ یا پانچ دفعہ یا اس سے زیادہ اس کو غسل دو اور ہو سکے تو بیری کے پتوں اور پانی سے غسل دو اور آخری دفعہ کافور بھی اس میں ڈال دو۔(۲)

حدیث اور فقہ کی روشنی میں غسل میت کا مکمل طریقہ یہاں پیش کیا گیا ہے، اس کے مطابق میت کو غسل دینا چاہیے؛ تا کہ یہ فرض صحیح وشرعی طریقہ کے مطابق ادا ہو، اور خصوصاً مؤذن لوگوں کو، جو غسل دینے کا کام کرتے ہیں، ان کو چاہئے کہ اس طریقہ پر غسل دینے کی مشق کریں۔

غسل میت کے چند اہم مسائل

نہلانے والا وہ ہو جس کے لیے میت کا دیکھنا جائز ہے، لہٰذا اجنبی عورت کو اجنبی مرد اور اجنبی مرد کو اجنبی عورت غسل نہیں دے سکتے، ہاں مرد کو اس کی بیوی غسل دے سکتی ہے؛ لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک میں مرد اپنی بیوی کو بھی غسل نہیں دے سکتا۔(۳)

متعدد طرق سے یہ حدیث آئی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) کتاب الآثار للامام ابی یوسف:۷۶تا۷۷،در مختار:۲/۱۹۶،البحر الرائق:۲/۱۷۳

(۲) بخاری:۱۱۷۷،مسلم:۱۵۵۷،نسائی:۱۸۶۱،ترمذی:۹۱۱،ابن ماجہ:۱۴۴۸،احمد: ۲۶۰۳۴

(۳) در مختار:۲/۱۹۸، البحر الرائق:۲/۱۷۴

فرمایا کہ اگر عورت مردوں کے درمیان مرجائے اور وہاں کوئی عورت نہ ہو، اسی طرح اگر کوئی مرد عورتوں کے مابین مرجائے اور وہاں کوئی مرد نہ ہو تو ان کو تیمّم کرادیا جائے۔(۱)

اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفصیل نہیں بیان کی کہ عورت کا شوہر اس جگہ موجود ہے یا نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا شوہر وہاں ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں ایک ہی حکم ہے۔

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم اس (بیوی) کے زیادہ حق دار تھے، جب تک کہ وہ زندہ تھی اور جب مرگئی تو تم اس کے زیادہ حق دار ہو۔(۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد بیوی کو غسل دینے کا حق مرد کو نہیں ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول معلق ہے اور معلق حدیث، مرسل کے حکم میں ہوتی ہے اور حدیث مرسل بہت سے محدثین اور فقہا کے نزدیک حجت ہے۔(۳)

بہتر ہے کہ غسل دینے والا میت کا کوئی رشتہ دار ہو اور اگر رشتہ دار غسل دینا نہ جانتا ہو، تو پھر کوئی دوسرا آدمی جو متقی ہو، غسل دے۔(۴)

جو بچہ پیدا ہو کر مرجائے اس کو بھی غسل دینا چاہئے اور جو مر کر پیدا ہو، اس کو بھی بہتر ہے کہ غسل دیا جائے اور اگر بچہ ناقص پیدا ہو، تو اس کو غسل دینے میں اختلاف ہے، بہتر ہے کہ دے دیا جائے۔(۵)

---

(۱) بیہقی:۵/۲۵۹، مراسیل ابو داؤد:۴۱۴

(۲) کتاب الآثار للامام محمد رحمۃ اللہ:۴۷

(۳) قاله فی اعلاء السنن:۸/۱۸۶

(۴) البحر الرائق:۲/۱۷۳

(۵) ھدایہ:۱/۱۶۱، مراقی الفلاح:۱۴۶، در مختار مع شامی:۱/۲۲۸

چھوٹے بچہ یا بچی کو مرد یا عورت جو چاہے، غسل دے سکتے ہیں۔(۱)

مرد کا انتقال ایسی جگہ ہو جائے جہاں اس کو غسل دینے والا کوئی مرد نہ ہو، یا عورت کا انتقال ایسی جگہ ہو جائے جہاں اس کو غسل دینے والی کوئی عورت نہ ہو، تو اس مرد و عورت کو تیمّم کرا دیا جائے اور تیمّم کے لیے ہاتھوں پر کوئی کپڑا لپیٹ لیا جائے، ہاں اگر کوئی محرم ہو تو بغیر کپڑے کے تیمّم کرادے۔(۲)

میت کو غسل دینے کے بعد غسل دینے والے کو غسل کر لینا مستحب ہے۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو میت کو غسل دے، وہ غسل کر لے۔(۳)

غسل میت کی اغلاط

غسل میت کے متعلق بھی عوام میں بعض اغلاط و منکرات رائج ہیں، جن سے بچنا چاہیے مثلاً:

بہت سے لوگ میت کو غسل دینے سے ڈرتے یا نفرت کرتے ہیں، اگرچہ میت رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، یہ بڑی غلط بات ہے۔سوچنا چاہئے کہ آخر ہم بھی ایک دن مریں گے، اس وقت ہمارے رشتہ دار ہم سے خوف کھائیں اور نفرت کریں تو کیا ہوگا؟ ایک تابعی بزرگ عمرو بن دینار رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جو بھی مرتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے گھر والے کیا کر رہے ہیں اور یہ کہ اس کو غسل و کفن دے رہے ہیں اور وہ ان کو دیکھتا ہے۔(۴)

---

(۱) مراقی الفلاح:۱۴۶
(۲) اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو مسئلہ نمبر (۱) کے تحت گذر چکی ہے۔
(۳) ابو داؤد:۲۷۳۹،ابن ماجہ:۱۴۵۲،ترمذی:۹۱۴، احمد:۷۳۶۴
(۴) کتاب الروح لابن القیم ص:۱۲

غرض یہ کہ جب میت کو اہل خانہ کے حالات ومعاملات کا علم ہوتا ہے تو اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کون اس سے نفرت کر رہا ہے۔لہٰذا ایسا نہ کرنا چاہئے۔

بعض لوگ مر کر پیدا ہونے والے اور پیدا ہو کر مرنے والے بچوں کو غسل دیئے بغیر دفنا دیتے ہیں، اوپر یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے کہ پیدا ہو کر مرنے والے بچے کو غسل دینا ضروری ہے اور مر کر پیدا ہونے والے بچے کو غسل دینا مستحب ہے، اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔بعض جگہ ہسپتالوں میں جو لوگ دور دور سے آتے ہیں اور وہاں ولادت ہوتی ہے اور کبھی بچہ مر کر پیدا ہوتا ہے، تو لوگ ہسپتال کی ماماؤں کو دفن کرنے کا معاملہ سپرد کر دیتے ہیں، یہ بڑی بے مروتی ہے۔

اکثر لوگوں میں رسم ہے کہ غسل میت کے لیے پانی گرم کرنے اور نہلانے کے لیے نئے برتن خریدتے ہیں، جب کہ گھر میں برتن موجود ہوتے ہیں، پھر غسل کے بعد ان برتنوں کو اور غسل کے کپڑوں کو خیرات کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ محض من گھڑت رسم ہے اور اس میں لوگوں کے عجیب عقائد ہیں مثلاً :بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مُردوں کی یہ چیزیں استعمال کرنے سے استعمال کرنے والا جلدی مر جاتا ہے۔ اور بعضوں کا خیال ہے کہ یہ استعمال شدہ چیزیں منحوس ہو جاتی ہیں۔یہ سب بے اصل باتیں اور نظریات ہیں۔اولاً: نئے برتن لینا ہی کیا ضروری ہے؟ پھر ان غلط عقائد سے خیرات کرنا کون سا بھلا کام ہے؟ ہاں اگر محض ثواب کی نیت سے خیرات کریں اور کوئی غلط عقیدہ شامل نہ ہو، تو یہ کارِ ثواب ہے؛ مگر اس میں بھی یہ مسئلہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر یہ برتن اور کپڑے میت کے مال سے ہیں، تو ان کا وارثوں کی اجازت کے بغیر خیرات کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ میت کا ترکہ اور میراث ہے جس کے حق دار اس کے وارث ہونگے۔ پھر ان وارثین کی اجازت بھی اس وقت معتبر ہے جب کہ تمام

وارثین بالغ ہوں ۔ اگر کوئی وارث نابالغ ہے، تو اس کی اجازت بھی معتبر نہیں ۔ یہ مسئلہ کسی مستند عالم سے پوچھ کر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

بعض لوگ غسل کے پانی پر کچھ آیات ، درود شریف یا کچھ دعائیں پڑھ کر دم کر کے اس سے میت کو غسل دیتے ہیں، اس کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں ۔

تکفین کے احکام

غسل سے فراغت کے بعد، کپڑے سے میت کا جسم صاف کرلیا جائے اور فوراً کفن پہنانے کا انتظام کیا جائے۔

کفن کے چند مسائل

کفن سفید ہو تو زیادہ بہتر ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے کپڑوں میں سے سفید پہنا کرو، کیوں کہ وہ سب سے بہتر ہیں اور اسی میں سے اپنے مردوں کو کفن دو۔ (۱)

کفن بہت قیمتی نہ ہونا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کفن بہت قیمتی نہ دو کیوں کہ وہ بہت جلد اُچک لیا جاتا ہے۔ (۲)

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ گھٹیا کفن دیا جائے؛ بل کہ نہ گھٹیا ہو نہ بہت قیمتی ہو۔ چناں چہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ کفن اچھا دو۔ (۳)

علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"علما نے فرمایا ہے کہ اچھا کفن دینے سے اسراف کرنا اور بہت قیمتی کفن دینا، یا نفیس کفن دینا مراد نہیں؛ بل کہ مراد یہ ہے کہ کفن صاف

---

(۱) ترمذی:۹۱۵،ابو داؤد:۳۵۳۹، ابن ماجہ:۱۴۶۱،احمد :۲۱۰۹

(۲) ابو داؤد:۲۷۴۲

(۳) مسلم:۱۵۶۷،ابو داؤد:۲۷۳۷،نسائی:۱۸۶۹،احمد :۱۳۲۳۱،ترمذی:۹۱۶، ابن ماجہ:۱۴۶۲

ستھرا اور موٹا ہو، جو بدن کو ڈھانک سکے اور درمیانی قسم کا ہو اور ایسا جو وہ اپنی زندگی میں پہنتا تھا، نہ بہت عمدہ اور نہ بہت حقیر۔(۱)

کفن صرف ان کپڑوں میں جائز ہے جن کا پہننا زندگی میں جائز تھا، مرد کے لیے خالص ریشمی کفن یا زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے کا کفن جائز نہیں، البتہ عورتوں کے لیے اس کی اجازت ہے۔(۲)

کفن کا خرچہ خود میت کے مال سے لیا جائے گا، اگر میت کا مال نہ ہو تو کفن کی ذمے داری اس پر ہے جو اس میت کی زندگی میں اس کا خرچہ چلاتا تھا، مثلاً بچہ کے کفن کی ذمے داری باپ پر ہے۔ البتہ بیوی کا کفن ہر صورت میں مرد کے ذمہ ہے؛ خواہ عورت کا مال ہو یا نہ ہو، اور جس آدمی کا نہ مال ہو اور نہ کوئی ذمے دار، اس کا کفن تمام مسلمانوں کے ذمہ ہے۔(۳)

مرد کو کفنانے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت آقائے نام دار، مدینہ کے تاج دار، خاتم المرسلین، محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دینِ اسلام بھیج کر انسانیت پر اپنا فضلِ عظیم وعمیم فرمایا جس میں اس نے انسان کے مرنے پر اس کی تعظیم بھی سکھائی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں کفن کے احکام بھی ہیں، مرد کے کفن میں تین کپڑے دینا سنت ہے، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔(۴)

---

(۱) شرح مسلم للنووی:۱/۳۰۶

(۲) درمختار مع شامی:۲/۲۰۵، العرف الشذی مع ترمذی:۱/۹۴، البحر الرائق:۲/۱۷۶

(۳) شرح مسلم للنووی:۱/۳۰۶، در مختار مع شامی:۲/۲۰۵

(۴) بخاری:۱۱۹۲، مسلم:۱۵۶۳، ترمذی:۹۱۷، نسائی:۱۸۷۱، ابو داؤد:۲۷۴۰، ابن ماجہ:۱۴۵۸، احمد:۲۲۹۹۲، مالک:۴۶۷

ان تین کپڑوں میں سے ایک ازار ہو جو اتنی لمبی ہو کہ سر تا پا ڈھک جائے اور ڈیڑھ گز چوڑی ہو، دوسرے کفنی جس کی مقدار گلے سے پیر تک ہو، تیسرے چادر جس کی مقدار ازار سے کچھ زیادہ ہو۔(۱)

کفنانے سے پہلے کفن کو عود یا کسی خوشبودار چیز کی دھونی دی جائے، پھر کفن کو اس ترتیب سے بچھا دیا جائے کہ پہلے چادر ہو پھر اس کے اوپر ازار، اس کے اوپر کفنی (قمیص جو بلا آستین ہو) کا نیچے کا حصہ بچھا دیا جائے، اوپر کا حصہ سر کے پاس لپیٹ کر رکھ دیں۔ اب میت کی ڈاڑھی اور سر میں خوشبو لگائیں۔(۲)

اور پیشانی، ناک اور دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک اور گھٹنوں اور قدموں پر کافور مل دیا جائے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میت کے سجدے کی جگہوں پر کافور ڈال دیا جائے۔(۳)

نیز حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ان کی بیوی کو مشک دیا اور فرمایا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے عطر لگا دینا کیوں کہ اللہ کی ایک مخلوق اس وقت حاضر ہوتی ہے، اور اس وقت لوگ کھانا اور پانی تناول نہیں کرتے؛ بل کہ خوشبو حاصل کرتے ہیں۔(۴)

اس کے بعد میت کو کفنی پر لٹا کر پہلے کفنی کا جو حصہ سر کے پاس لپیٹ کر رکھا تھا، وہ پہنا دیں پھر ازار کو اس طرح اوپر لپیٹیں کہ بائیں جانب کا حصہ نیچے رہے اور

---

(۱) در مختار مع شامی:۲/۲۰۲،مراقی الفلاح :۱۴۳

(۲) ھدایہ:۱/۱۵۹

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ:۳/۱۳۱، سنن الکبری للبیھقی:۵/۲۷۵

(۴) نصب الرایۃ:۲/۲۶۷

دائیں جانب کا حصہ اوپر رہے، پھر اسی طرح اوپر والی چادر لپیٹیں اور سر کی طرف اور پیروں کی طرف سے کفن کو باندھیں۔ (۱)

اور یاد رہے کہ میت کو کفن میں رکھتے وقت میت کے ہاتھ بازوؤں میں رکھیں، سینہ پر نہ رکھیں کیوں کہ یہ کفار کا طریقہ ہے۔ (۲)

عورت کو کفنانے کا طریقہ

عورت کے لیے پانچ کپڑے کفن میں دینا مسنون ہے، حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا اپنی بیٹی کے کفن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ ہم نے اس کو پانچ کپڑوں میں کفنایا اور جس طرح زندہ سر ڈھانکتا ہے اسی طرح ہم نے اس کا سر ڈھانک دیا۔ (۳)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت لیلیٰ بنت قائف رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب غسل دیا گیا تو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازار دی پھر قمیص، پھر اوڑھنی، پھر سینہ بند، پھر ایک کپڑا جس میں ان کو رکھا گیا۔ (۴)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے کفن میں پانچ کپڑے مسنون ہیں (۱) ازار (۲) قمیص یعنی کفنی جو آستین کے بغیر ہوگی (۳) اوڑھنی (۴) سینہ بند (۵) چادر۔ ان میں سے ازار، کفنی اور چادر تو ویسے ہی ہونگے جیسے مرد کے لیے ہوتے ہیں اور سینہ بند دو گز لمبا اور سوا گز چوڑا ہوتا کہ بغل کے نیچے سے پنڈلی تک آسکے اور سر بند یعنی اوڑھنی ڈیڑھ گز لمبی اور بارہ گز چوڑی ہو۔

---

(۱) در مختار مع شامی:۲/۲۰۴

(۲) در مختار مع شامی:۲/۱۹۸

(۳) الجوزی، قال ابن حجر :هذه الزيادة صحيحة الاسناد،فتح الباری:۳/۱۳۳

(۴) ابو داؤد:۲/۴۵۰، سنن بیهقی :۶۸۷۲،نصب الرایه:۲/۲۷۲

کفن کو خوشبو سے دھونی دینے کے بعد پہلے چادر بچھائی جائے اس کے بعد ازار اس کے اوپر کفنی، پھر میت کو رکھ کر کفنی پہنادی جائے اور اس کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ داہنی طرف، ایک حصہ بائیں طرف کر کے سینہ پر رکھ دیے جائیں، پھر سر بند کو سر اور بالوں پر ڈال دیا جائے، اس کے بعد ازار لپیٹی جائے پھر چادر، جیسا کہ مرد کے کفن میں مذکور ہوا، پھر سب سے اوپر سینہ بند باندھ دیا جائے۔(۱)

فائدہ : چھوٹے بچہ یا بچی کو بہتر ہے کہ مذکورہ طریقہ پر ہی کفن دیا جائے اور اگر چھوٹے لڑکے کو ایک کپڑے میں اور چھوٹی بچی کو دو کپڑوں میں کفن دیا جائے تو بھی جائز ہے اور مر کر پیدا ہونے والے بچے یا ناقص بچے کو بھی مکمل کفن دینا ضروری نہیں، صرف ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے تو درست ہے۔(۲)

کفن کے بارے میں بے اعتدالیاں

کفن کے بارے میں عوام میں جو بے اعتدالیاں اور غلط رسومات ہوتی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے، لوگوں کو چاہئے کہ ان کی اصلاح کریں۔

کفن میں عمامہ

کفن میں صرف وہ کپڑے مسنون ہیں جن کا اوپر ذکر آیا، ان کے علاوہ عمامہ باندھنا خلافِ سنت اور مکروہ ہے۔ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا جس میں نہ قمیص تھی اور نہ

---

(۱) در مختار مع شامی: ۲/۲۰۴

(۲) در مختار مع شامی: ۲/۲۰۴

عمامہ تھا۔(۱)

فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ میت کے لیے عمامہ مکروہ ہے۔علامہ شامی نے نقل کیا ہے کہ عمامہ میت کے لیے ہر حال میں مکروہ ہے۔ البتہ بعض فقہا نے علما کے لیے اس کی اجازت دی ہے۔(۲)

غرض یہ کہ سنت تو یہی ہے کہ کفن میں عمامہ نہ ہو، لہٰذا سنت کی اتباع کرنا چاہیے، اسی میں خیر ہے۔

کفن پر عطر

اکثر عوام میں رواج ہے کہ کفن کے اندر و باہر عطر کا چھڑکاؤ کر دیتے ہیں، حالاں کہ خوشبو، میت کے صرف ان اعضاء پر لگانے کا حکم ہے جن پر سجدہ کیا جاتا ہے یا سر اور ڈاڑھی میں لگانے کا ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ اوپر گذرا، یا کفن کو دھونی دینے کا ذکر آیا، چناں چہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ میت کو تین دفعہ دھونی دو۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ میت کے کفن کو تین مرتبہ دھونی دو۔(۳)

مگر کفن پر عطر ملنا ثابت نہیں ہے؛ بل کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میرے کپڑوں

---

(۱) بخاری:۱۱۹۲،مسلم:۱۵۶۳،ترمذی:۹۱۷،نسائی:۱۸۷۲،ابو داؤد:۲۷۴۰،ابن ماجہ:۱۴۵۸،احمد:۲۳۷۲۴،مالک:۴۶۷

(۲) در مختار مع شامی:۲/۲۰۲،البحر الرائق:۲/۱۷۵

(۳) رواہ البیھقی فی السنن الکبریٰ: ۵/۲۷۴، واحمدبن حنبل فی المسند: ۱۴۰۱۳، والحاکم فی المستدرک، قال النووی: اسنادہ صحیح.(شرح المھذب ۵/۱۵۵)

(کفن) کودھونی دینا پھر مجھے خوشبو لگانا؛ لیکن میرے کفن پر خوشبو نہ چھڑ کنا۔(۱)

غرض یہ کہ یہ طریقہ جو عوام میں رائج ہے کہ کفن میں عطر لگاتے ہیں، یہ سنت نہیں ہے، لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

کفن میں بڑائی کا مظاہرہ

بعض جگہ کفن پہناتے وقت بھی لوگوں کو اپنی بڑائی کا احساس باقی رہتا ہے، اس لیے بہت قیمتی کفن پہناتے ہیں اور اپنی شان کا مظاہرہ کرتے ہیں، اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمتی کفن دینے سے منع کیا ہے اور پھر ہم نے وہیں اس حدیث کا ذکر کر کے جس میں عمدہ کفن دینے کا ذکر آیا ہے، دونوں حدیثوں میں تطبیق کی صورت بھی ذکر کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ بہت قیمتی لباس جس پر فخر کیا جائے، یہ جائز نہیں۔ ہاں بہت خستہ اور معمولی کفن بھی نہ دیا جائے؛ بل کہ درمیانی قسم کا ہونا چاہیے۔

کفن میں ٹوپی، لنگی وغیرہ

بعض جگہ کفن میں ٹوپی اور پائجامہ دینے کا رواج ہے جو سراسر خلافِ سنت و مکروہ ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"پائجامہ اور ٹوپی کفن مسنون سے علاحدہ دیا جاتا ہے تو یہ بالکل فضول اور ناجائز ہے، ٹوپی اور پائجامہ کفن میں داخل نہیں ہے اور نہ ثابت ہے۔(۲)

---

(۱) مؤطا امام مالک: ۴۷۴، بیہقی: ۶۷۰۵ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ کا اختلاف ہے، وہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ (شرح مھذب: ۵/۱۵۷)

(۲) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۵/۲۷۱

اسی طرح کفن میں لنگی دینا بھی جائز نہیں اور بدعت ہے، جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے تصریح فرمائی ہے۔(۱)

میت کے لیے سرمہ اور کنگھی

بعض لوگ میت کو سرمہ لگاتے اور کنگھی کرتے ہیں، یہ بھی صحیح نہیں ہے، حضراتِ فقہا نے تصریح کی ہے کہ میت کے لیے زیب وزینت کی چیزیں جائز نہیں۔(۲)

اور ظاہر ہے کہ سرمہ بھی زینت کی چیز ہے؛ اس لیے میت کو سرمہ لگانا بھی جائز نہیں۔(۳)

اسی طرح میت کو کنگھی کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ کسی میت کو لوگ کنگھی کررہے ہیں تو فرمایا: ”علام تنصون میتکم“۔(۴)

مطلب یہ ہے کہ میت کے لیے کنگھی کی کوئی ضرورت نہیں۔ معلوم ہوا کہ میت کو کنگھی کرنا درست نہیں اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے جیسا کہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ الحنبلی نے ”المغنی“ میں لکھا ہے۔(۵)

اور جو بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی لڑکی کے بالوں کو کنگھی

---

(۱) اصلاح انقلاب امت:۱/۲۴۲

(۲) الشامی:۲/ ۱۹۸

(۳) امداد الفتاوی:۱/۷۱۲

(۴) کتاب الآثار للامام محمد:۴۶،وکتاب الآثار للامام ابو یوسف:۷۸، قلتُ: ورواہ عبد الرزاق وابو عبید القاسم وابراھیم الحربی، کما قال الزیلعی فی نصب الرایۃ:۲/ ۲۶۸

(۵) المغني :۲/ ۲۹۹

کر کے تین مینڈھیاں بنائی گئیں، تو اس سے مراد کنگھی کرنا نہیں ہے؛ بل کہ ہاتھ سے بالوں کو درست کر کے ان کو تین حصوں میں کرنا مراد ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ میت کے لیے سرمہ، کنگھی وغیرہ زیب وزینت کی چیزیں ممنوع ہیں۔ ہاں اگر کنگھی کرنا کسی ضرورت کی بنا پر ہو تو اس کی بعض علما نے اجازت دی ہے۔ (۲)

میت کے بال و ناخن تراشنا

میت کے بال کاٹنا یا ناخن تراشنا جائز نہیں، امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میت کے ناخن نہ تراشے جائیں اور نہ اس کے بال کاٹے جائیں۔ (۳)

ہدایہ میں ہے کہ میت کے نہ ناخن کاٹے جائیں اور نہ بال کاٹے جائیں، کیوں کہ یہ چیزیں زینت کے لیے ہیں اور میت ان سے مستغنی ہے۔ (۴)

اسی طرح دیگر علمانے بھی تصریح کی ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ سے امام بیہقی رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: ہمارے اصحاب میں سے بعض نے کہا کہ مرنے کے بعد نہ میت کے سر کے بال مونڈے جائیں اور نہ اس کے ناخن تراشے جائیں، اور بعض اس میں کوئی مضائقہ وحرج نہیں سمجھتے۔ (۵)

مگر بعض لوگ میت کی ڈاڑھی تک کٹاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان باتوں

---

(۱) امام احمد رحمۃ اللہ نے اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ (المغنی: ۲/۲۹۹)

(۲) اعلاء السنن: ۸/۱۸۲

(۳) کتاب الآثار: ص: ۴۶

(۴) الهداية: ۱/۱۵۹

(۵) سنن بيهقي: ۵/۲۴۷

سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد شیونگ کرنا بھی جائز نہیں۔

کفن میں ابیر

بعض جگہ رواج ہے کہ کفن دیتے وقت میت کی پشت وسینہ پر ابیر (جو بہ قولِ بعض صندل کا سفوف ہے) ڈال دیتے ہیں، سنت سے اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، جو ثابت تھا وہ اوپر درج کر دیا گیا۔ لہذا اس سے بھی پرہیز کرنا چاہئے۔

کفن میں کلمہ وعہد نامہ

بعض جاہل لوگوں میں رواج ہے کہ کفن پر کلمہ لکھتے ہیں اور بعض لوگ کفن میں عہد نامہ رکھ دیتے ہیں، یہ ناجائز ہے؛ کیوں کہ یہ مقدس چیزیں میت کے گلنے، سڑنے پر نجاست سے ملوث ہو جائیں گی، جو ان چیزوں کے احترام کے خلاف ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ نے فتح القدیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

> ''قرآن کی آیات اور اللہ کے ناموں کا درھم ومحراب ودیوار اور فرش پر لکھنا مکروہ ہے اور یہ صرف اس وجہ سے مکروہ ہے کہ ان کے روندے جانے کا خوف ہے جس سے ان کے احترام میں فرق آئے گا اور توہین ہوگی، لہذا کفن میں ان کا لکھنا بدرجہ اولی مکروہ ہوگا۔ (۱)

البتہ صرف انگلی سے لکھا جائے تو اس کی اجازت ہے۔ (۲)

مگر اس کو سنت ومستحب یا ضروری نہ سمجھنا چاہئے، کہ غیر ضروری کو ضروری سمجھنا بدعت ہے۔

---

(۱) الشامی: ۲/ ۲۴۶، ۲۴۷
(۲) الشامی: ۲/ ۲۴۷

کفن میں پِیروں کا شجرہ

بعض عوام میں پیروں کی اندھی عقیدت کے نتیجہ میں عجیب وغریب خرافات رائج ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پیرومرشد کا شجرہ کفن میں رکھ دیتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس شجرہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ میت کی مغفرت فرمادیتے ہیں اور بلا حساب و کتاب جنت میں داخل کر دیتے ہیں؛ مگر یہ عقیدہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے،اللہ کے نزدیک معیارِ نجات ایمان وعمل صالح ہے،حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب آیت ﴿و انذر عشیرتک الاقربین﴾ نازل ہوئی،تو کھڑے ہوئے اور نام بہ نام قریش، بنوعبد المطلب، بنوعبد مناف، اور اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ، اپنی پھوپی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پکارا اور فرمایا:

''میں تم کو اللہ کے پاس کچھ کام نہیں آسکتا،تم خود اپنے آپ کو دوزخ سے نکالو اور بچاؤ،اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے خاص طور پر فرمایا کہ تو مجھ سے چاہے تو مال طلب کر لینا؛مگر میں تجھ کو اللہ کے پاس کام نہ آسکوں گا''۔(۱)

جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لختِ جگر اور اپنی پھوپی سے یہ فرمارہے ہیں،تو کسی اور کے شجرہ سے کیا کام بن سکتا ہے؟اس پر غور کرنا چاہئے اور اس طرح کی خرافات سے بچنا چاہئے۔

---

(۱) بخاري:۲۵۴۸، مسلم:۳۰۵، نسائي:۳۵۸۶، دارمي:۲۶۱۶، ترمذي:۲۲۳۲، احمد:۸۸۱۲

نمازِ جنازہ کے احکام

جب تکفین سے فراغت ہو جائے، تو میت کو کسی چارپائی (پلنگ) یا جنازہ پر رکھ کر جلد سے جلد نمازِ جنازہ پڑھنے کی فکر کریں۔

نمازِ جنازہ کا طریقہ

نمازِ جنازہ کا طریقہ یہ ہے کہ جنازہ کو سامنے رکھ کر امام اس کے سینہ کے برابر کھڑا ہو اور باقی لوگ امام کے پیچھے صفیں بنا کر کھڑے ہوں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور وسط (درمیان) میں کھڑے ہوئے۔(۱)

اور بہتر ہے کہ امام کے پیچھے کم از کم تین صفیں بنائی جائیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) بخاری: ۱۳۴۶، مسلم: ۱۶۰۲، ترمذی: ۹۵۶، نسائی: ۳۹۰، ابو داؤد: ۲۷۸۰، ابن ماجہ: ۱۴۸۲، احمد: ۱۹۳۰۲، طحاوی: ۱/ ۲۳۷

معلوم ہونا چاہئے کہ امام جنازہ کے پاس کہاں کھڑا ہو؟ اس سلسلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اور علمائے حنفیہ کے بھی اس میں دو قول ہیں (۱) ایک یہ کہ سینہ کے پاس کھڑا ہو۔ (۲) اور دوسرا یہ کہ میت اگر مرد ہے تو سر کے پاس اور عورت ہے تو سرین کے پاس کھڑا ہو۔ (ابو داؤد: ۲۷۷۹، ترمذی: ۹۵۵، ابن ماجہ: ۱۴۷۳، احمد: ۱۱۷۳۵) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہی عمل بتایا گیا ہے، ہمارے علمانے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق سینہ کے پاس کھڑے ہونے کو ترجیح دی ہے۔ (دیکھو اعلاء السنن: ۸/ ۲۲۷)

« ماصلّٰى ثلاثة صفوف من المسلمين على رجل مسلم يستغفرون له الا اوجب. » (۱)

(یعنی کسی بھی مسلمان پر تین صفیں مسلمانوں کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھتیں؛ مگر اللہ اس کے لیے (جنت) واجب کر دیتا ہے۔)

صفوں کو درست کرنے کے بعد امام چار تکبیر کہے اور اس کے بعد مقتدی بھی چار تکبیریں کہیں؛ مگر صرف پہلی تکبیر پر کانوں تک ہاتھ اٹھائیں، جیسا کہ عام نمازوں میں کانوں تک اٹھاتے ہیں اور بعد کی تین تکبیروں میں ہاتھ نہ اٹھائیں۔ (۲) پہلی تکبیر پر ہاتھ اٹھا کر باندھ لیں، جیسے عام نمازوں میں باندھتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) سنن بیهقی: ۷۰۰۵، ترمذی: ۹۴۹، ابو داؤد: ۲۷۵۳، ابن ماجه: ۱۴۷۹

(۲) جنازہ کی نماز میں کتنی تکبیریں ہیں اس میں بھی علما کا اختلاف ہے، اکثر احادیث میں چار کا ذکر ہے، جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی نمازِ جنازہ پڑھی تو آپ نے چار تکبیریں کہیں، (بخاری: ۱۲۳۴، مسلم: ۱۵۸۰، ترمذي: ۹۴۳، نسائي: ۱۹۴۶، ابو داؤد: ۲۷۸۹، ابن ماجه: ۱۵۲۳، احمد: ۶۸۵۰، مالک: ۴۷۹، طحاوی: ۱/ ۲۳۸) نیز حضرت آدم علیہ السلام کی نماز جنازہ پر فرشتوں کا چار تکبیر کہنا بھی احادیث میں آیا ہے اور خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی چار ہی تکبیرات حضراتِ صحابہ نے کہی تھیں۔

(دار قطني: ۲/ ۷۱، سنن بیهقي: ۵/ ۳۶۲)

(۳) جنازہ میں ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھائیں یا صرف پہلی تکبیر پر؟ اس بارے میں بھی اختلاف ہوا ہے، "ترمذی" ۹۹۸، میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ میں صرف پہلی تکبیر پر ہاتھ اٹھائے، اسی طرح "دار قطنی" / ۷۵ میں ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صرف اول تکبیر پر ہاتھ اٹھاتے پھر نہ اٹھاتے، اور بعض احادیث سے ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ملتا ہے، مگر اس بارے میں مرفوع حدیث جس کو "دار قطني" نے علل میں روایت کیا ہے، وہ ضعیف ہے اور اس کا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونا ہی صحیح ہے، ....

پھر اللہ کی حمد وثنا کریں اور یہ حمد وثنا خواہ سورۂ فاتحہ سے ہو یا اور کسی دعا سے ہو، جیسے عام نمازوں میں ثنا پڑھی جاتی ہے۔(۱)

پھر دوسری تکبیر کہہ کر درود شریف پڑھا جائے جیسے کہ نماز میں پڑھا جاتا ہے۔(۲)

.............جیسا کہ ''دار قطنی'' نے خود فرمایا ہے۔(نصب الراية :۲/۲۹۲)

ہاں! بعض صحابہ سے مروی ہے کہ وہ ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھاتے تھے۔ (دیکھو التلخیص الحبير،والدراية في تخريج الهداية،والسنن للبيهقي: ۳۷۹/۵) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے، البتہ علمائے حنفیہ نے اوپر کی احادیث کی بنا پر صرف ایک دفعہ ہاتھ اٹھانے کو ترجیح دی ہے۔و اللہ عزوجل اعلم و علمه اتم۔

(۱) پہلی تکبیر کے بعد کیا پڑھا جائے؟ اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ کوئی بھی حمد وثنا پر مشتمل دعا پڑھی جا سکتی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جنازہ میں اپنا یہی معمول بیان کیا ہے، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں تکبیر کہتا ہوں اور اللہ کی حمد کرتا ہوں۔(مؤطا امام مالک:ص:۷۹)

اور ظاہر یہی ہے کہ ان کا یہ عمل اتباعِ رسول ہی کی وجہ سے ہوگا، اور جو دیگر احادیث میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد بہ طورِ دعا سورۂ فاتحہ پڑھنا ہے اور احناف اس کے قائل ہیں، چناں چہ علمائے حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ اگر بہ نیتِ دعا سورۂ فاتحہ پڑھ لی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں (البحر الرائق:۲/۱۹۷)

اور بہت سے صحابہ وتابعین کا بھی یہی معمول تھا کہ وہ نماز جنازہ میں قرأت نہیں کرتے تھے، ابن وھب رحمۃ اللہ بہت سے حضرات اہلِ علم سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر، فضالہ بن عبید، ابو ہریرہ، جابر بن عبداللہ، واصلۃ بن الاسقع، قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، ابن المسیب، ربیعہ، عطاء بن ابی رباح، یحیی بن سعید، نماز جنازہ میں قرأت نہیں کرتے تھے اور امام مالک رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ہمارے شہر (مدینہ) میں بھی اس کا رواج نہیں ہے۔(المدونة الكبرى:۱/ ۱۵۸و۱۵۹)

(۲) حضرت ابو اُمامہ بن سھل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نماز جنازہ میں ....

پھر تیسری تکبیر کہہ کر میت کے لیے دعا کریں، اگر میت بالغ مرد یا عورت ہے تو یہ دعا پڑھیں:

« اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَ ارْحَمْهُ وَ عَافِهٖ وَ اعْفُ عَنْهُ وَ اَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَ الْبَرْدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَ اَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهٖ وَ اَهْلاً خَيْراً مِنْ اَهْلِهٖ وَ زَوْجاً خَيْراً مِنْ زَوْجِهٖ وَ اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَ اَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ . »(۱)

یا یہ دعا پڑھی جائے:

« اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا وَ شَاهِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِيْرِنَا وَ كَبِيْرِنَا وَ ذَكَرِنَا وَ اُنْثَانَا ، اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ. » (۲)

اور میت اگر نابالغ ہو تو لڑکے کے لیے یہ دعا پڑھیں:

« اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطاً وَّ اجْعَلْهُ لَنَا اَجْراً وَّ ذُخْراً وَّ اجْعَلْهُ لَنَاشَافِعًا وَّ مُشَفَّعًا »

.............سنت یہ ہے کہ تو تکبیر کہے پھر سورۂ فاتحہ پڑھے پھر (تکبیر کہہ کر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے پھر (تکبیر کہہ کر) میت کے لیے خالص دعا کرے الخ۔ (اخرجه ابن الجارود في المنتقىٰ : ۵۴۰، وعبد الرزاق : ۶۴۲۸، والبیهقي في السنن : ۷۰۶۱، والحاكم في المستدرك : ۱/۳۶۰) اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی ایسا ہی آیا ہے۔ (دیکھو البیهقي: ۷۰۶۲) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا عمل اس سے اوپر والے حاشیہ میں گذر چکا ہے۔

(۱) مسلم : ۱۶۰۰، نسائی : ۱۹۰۷، ابن ماجه : ۱۴۸۹، احمد : ۲۲۸۵، ترمذی مختصراً: ۹۴۶، ابن ابی شیبه : ۳/۱۷۶

(۲) ترمذی: ۹۴۵، ابن ابی شیبه: ۳/۱۷۷، نیز اس کو احمد: ۱۶۸۸۵، نسائی: ۱۹۶، ابن الجارود: ۵۴۱ نے پہلے جملہ تک روایت کیا ہے۔

اور نابالغ لڑکی ہو تو اسی دعا کو اس طرح پڑھیں:

« اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا لَنَا فَرَطاً وَّ اجْعَلْھَا لَنَا اَجْراً وَّ ذُخْراً وَّ اجْعَلْھَالَنَا شَافِعَۃً وَّ مُشَفَّعَۃً » (۱)

پھر چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں طرف سلام پھیر دیں۔(۲)

یہ ہے نمازِ جنازہ کا مکمل طریقہ۔

---

(۱) امام بخاری رحمۃ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ سے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ وہ بچہ پر یہ دعا پڑھتے تھے: « اللّٰھم اجعلہ لنا سلفا و فرطا و اجرا » حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں لکھا کہ اس اثر کو عبد الوھاب بن عطاء نے اپنی کتاب الجنائز میں موصولاً روایت کیا ہے (فتح الباری: ۲۰۳/۳) اور حافظ ہی نے "التلخیص الحبیر" میں جامع سفیانؒ کے حوالہ سے بھی اس کو نقل کیا ہے، نیز "بیہقی" کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہ کا عمل نقل کیا ہے کہ وہ بچہ پر یہ دعا پڑھتے تھے: « اللّٰھم اجعلہ لنا فرطا و سلفا و اجرا »(التلخیص الحبیر : ۱۲۳/۲) اس دعا کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے ایک دوسری دعا بھی بچہ کے لیے منقول ہے اور وہ یہ ہے: « اللّٰھم اَعِذْہُ من عذاب القبر » (مؤطا امام مالک : ۴۸۰)

غرض یہ کہ اس سلسلہ میں گنجائش ہے کہ جو دعا چاہے پڑھے۔

(۲) حضرت ابراھیم الھجری کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی ﷺ نے ان کی لڑکی کی نماز جنازہ پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں پھر چوتھی تکبیر کے بعد کچھ دیر ٹہر گئے حتی کہ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ پانچویں تکبیر کہیں گے، پھر انہوں نے اپنی داہنی اور بائیں طرف سلام پھیر دیا، جب وہ مڑے تو ہم نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کرتے دیکھا ہے اس سے کچھ زیادہ نہیں کیا ہے۔(سنن البیھقی : ۷۰۸۷) امام نووی رحمۃ اللہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے (الاذکار :۱۷۱) اور حضرت ابو امامہ ﷺ سے مروی ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھے پھر تین تکبیریں کہے اور چوتھی تکبیر پر سلام پھیر دے۔(نسائی: ۱۹۶۳) یاد رہے کہ روایات میں اس سلسلہ میں اختلاف ملتا ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد کچھ پڑھنا ہے یا نہیں اور سلام ایک طرف پھیرنا ہے یا دونوں طرف؟ اوپر جو مذکور ہوا وہ احناف کا مسلک ہے۔

نمازِ جنازہ کے چند اہم مسائل

نمازِ جنازہ کے چند اہم مسائل یہاں لکھے جاتے ہیں:

☆ مستحب ہے کہ کم از کم تین صفیں بنائی جائیں، اگر لوگ زیادہ ہوں تو پانچ یا سات یا اس سے زیادہ بھی بنائی جاسکتی ہیں، البتہ طاق عدد ہونا مستحب ہے۔ اس بارے میں حدیث اوپر گزر چکی ہے۔

☆ نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے اور اس پر علما کا اجماع ہے۔(۱)

فرض کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر بعض لوگ اس کو ادا کردیں گے تو دوسروں سے ساقط ہوجاتا ہے۔

☆ عام نمازوں میں جو شرائط ہیں وہ اس نماز کے لیے بھی ضروری ہیں جیسے نیت کرنا، قبلہ رخ ہونا، ستر کا چھپانا، جگہ کا پاک ہونا، کپڑوں کا پاک ہونا، بدن کا پاک ہونا؛ مگر اس میں وقت کی شرط نہیں ہے۔(۲)

☆ نمازِ جنازہ کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ میت مسلمان ہو، کافر کی نمازِ جنازہ صحیح نہیں۔

☆ میت کو غسل دے کر پاک کردیا گیا ہو، کفن پاک ہو، بدن پاک ہو، نماز کے لیے جس جگہ میت رکھی گئی ہو، وہ جگہ پاک ہو، میت کا ستر چھپا ہوا ہو۔(۳)

☆ جن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے ان سے نمازِ جنازہ بھی ٹوٹ جاتی ہے۔(۴)

---

(۱) الفقه على المذاهب الاربعة:۱/۵۱۶، شرح المهذب:۵/۱۶۹،فتح القدير:۲/۱۲۰

(۲) در مختار مع شامی :۲/۲۰۷

(۳) در مختار مع شامی :۲/۲۰۷

(۴) البحر الرائق :۲/۱۸۰

☆ سورج کے طلوع ہونے، غروب ہونے، اور زوال کے وقت نمازِ جنازہ مکروہ ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین اوقات میں نماز پڑھنے سے اور مردوں کو دفن کرنے سے منع کیا ہے۔(۱)

☆ جو بچہ مر کر پیدا ہو، اس پر نمازِ جنازہ نہیں ہے اور جو پیدا ہو کر مر جائے اس پر نماز پڑھی جائے گی۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ پر نماز نہیں پڑھی جائے گی اور نہ وہ کسی کا وارث ہوگا اور نہ کوئی دوسرا اس کا وارث ہوگا، جب تک کہ وہ آواز نہ کرے۔(۲)

☆ اگر ایک ہی وقت میں کئی جنازے آجائیں، تو بہتر یہ ہے کہ سب پر الگ الگ نماز پڑھی جائے اور اگر ایک ہی نماز سب کے لیے پڑھنا چاہیں تو بھی جائز ہے، اور اس صورت میں دو طرح جنازوں کی ترتیب ہوسکتی ہے:

ایک یہ کہ ایک جنازے کے آگے دوسرا رکھا جائے اس طرح کہ ایک کے سر کے پاس دوسرے کا پیر ہو۔

اور اس صورت میں ان میں سے جو سب سے افضل آدمی ہو اس کے پاس کھڑے ہو کر امام نماز پڑھائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک جنازے کے سامنے دوسرا رکھا جائے، جیسے اس شکل میں ہے۔ یہ صورت پہلی صورت سے بہتر ہے۔ اس صورت میں جنازوں کی ترتیب اس طرح ہونی چاہئے، کہ امام سے قریب مرد کا جنازہ پھر بچے کا پھر عورت کا

---

(۱) مسلم:۱۳۷۳،ابو داؤد:۲۷۷۷، نسائی:۵۵۷،ترمذی:۹۵۱،ابن ماجہ:۱۵۰۸ احمد:۱۶۷۳۸، دارمی:۱۳۹۶

(۲) ترمذی:۹۵۳،ابن ماجہ:۱۴۹۷، دارمی:۲۹۹۷،طحاوی:۱/۲۴۵،حاکم:۱/۳۶۳، موارد الظمآن:۱۲۲۳

ہو۔(۱)

حضرت ابن عمر ﷺ نے ایک دفعہ نو جنازوں کو اس ترتیب سے رکھا کہ امام سے قریب مردوں کے جنازے اور قبلہ سے قریب عورتوں کے جنازے تھے، سب کو ایک صف بنادیا۔(۲)

نیز حضرت ابو ہریرہ، حضرت علی، حضرت واثلہ بن الاسقع ﷺ سے بھی یہی طریقہ مروی ہے۔(۳)

اور حضرت ابن عمر ﷺ ہی نے حضرت ام کلثوم بنت علیؓ اور ان کے لڑکے کے جنازے کو بھی ایک صف میں رکھا اور لڑکے کو امام سے قریب رکھا اور نماز پڑھائی، اس پر حضرت عمار مولی حارث بن نوفل ﷺ نے انکار کیا اور اس وقت حضرت ابن عباس حضرت ابو سعید، حضرت ابو قتادہ اور حضرت ابو ہریرہ ﷺ بھی وہاں موجود تھے ان سب حضرات نے فرمایا کہ یہی سنت ہے۔(۴)

☆ ولی کی اجازت کے بغیر کسی ایسے آدمی نے نماز پڑھادی جس کو حق نہیں، تو ولی دوبارہ نماز پڑھ سکتا ہے؛ جب کہ اس نے نماز نہ پڑھی ہو اور اگر نماز پڑھ لیا ہو یا کسی کو خود اجازت دیا ہو یا ایسے آدمی نے نماز پڑھائی ہو جس کو اس کی اجازت کے بغیر پڑھانے کا حق ہے جیسے محلّہ کا امام یا شہر کا قاضی تو پھر دوبارہ پڑھنے کا حق نہ ہوگا۔(۵)

---

(۱) در مختار مع شامی :۲/۲۱۹، المبسوط للسرخسی:۲/۶۵
(۲) بیہقی :۷۰۱۹
(۳) دیکھو:ابن ابی شیبہ :۳/۱۹۶تا۱۹۸،و بیہقی :۵/۳۵۴تا۳۵۵
(۴) ابو داؤد:۲۷۷۸، نسائی :۱۹۵۱،بیہقی:۷۰۲۰
(۵) البحر الرائق:۲/۱۸۱،درمختار مع شامی :۲/۲۲۲

☆ اگر نماز پڑھے بغیر کسی کو دفن کر دیا گیا تو جب تک کہ یہ یقین ہو کہ میت پھٹی نہیں ہے، تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گزرے، جو تازہ تھی اور پوچھا کہ یہ کس کی قبر ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ فلاں کی ہے تو آپ نے قبر پر نماز پڑھی اور صحابہ نے آپ کے پیچھے اقتداء کی۔(۱)

☆ اگر نمازِ جنازہ شروع ہونے کے بعد کوئی آئے تو، انتظار کرے کہ امام تکبیر کہے، جب وہ تکبیر کہے تو اس کے ساتھ تکبیر کہہ کر شامل ہو جائے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد چھوٹی ہوئی تکبیروں کو قضا کر لے اور اگر میت کو اٹھا لیا جائے تو ان تکبیروں میں دعا نہ پڑھے۔(۲)

---

(۱) بخاری: ۱۱۷۰، مسلم: ۱۵۸۶، نسائی: ۱۹۹۷، ابوداؤد: ۲۷۸۱، ابن ماجہ: ۱۵۱۹، احمد: ۲۹٦۸

(۲) المبسوط للسرخسی: ۲/٦٦، البحر الرائق: ۲/۱۸۵، شامی: ۲/۲۱۷

نمازِ جنازہ میں شریعت کی خلاف ورزیاں

نمازِ جنازہ میں جو امور محض رسم و رواج یا جہالت کی بنا پر کئے جاتے ہیں، وہ بہت سی ہیں مثلاً:

تکبیرات پر گردن اٹھانا

تکبیر کہتے وقت بعض لوگ آسمان کی طرف گردن اٹھاتے ہیں، یہ محض بے اصل بات ہے؛ بل کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھانا ممنوع ہے، چناں چہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یا تو یہ لوگ جو نماز میں دعا کے وقت اپنی آنکھوں کو آسمان کی جانب اٹھاتے ہیں، باز آجائیں یا ان کی آنکھیں اُچک لی جائیں گی۔(۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف نہ اٹھاؤ کہ کہیں آنکھیں اُچک نہ لی جائیں۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اوپر کی طرف نظر اٹھانا ناجائز ہے اور اس پر وعید ہے اور نمازِ جنازہ بھی ایک طور پر نماز ہے، لہٰذا اس میں بھی اس کی اجازت نہ ہوگی، اور گردن اٹھانا تقریباً نظر اٹھانے کے برابر ہے؛ مگر بعض لوگ ہر تکبیر پر یہ حرکت

---

(۱) بخاری:۷۰۸، مسلم:۶۵۰، نسائی:۱۱۸۰،ابو داؤد:۷۷۹ ، ابن ماجہ:۱۰۳۴، احمد:۱۱۶۲۲، دارمی:۱۲۲۹

(۲) نسائی:۱۱۸۱، احمد:۱۵۰۹۸

کرتے ہیں جو بے اصل اور ممنوع ہے۔

صفوں میں سجدے کے لیے جگہ چھوڑنا

نمازِ جنازہ میں نہ رکوع ہوتا ہے نہ سجدہ، یہ سب کو معلوم ہے؛ مگر بعض جگہ نمازِ جنازہ کے وقت صفوں کے درمیان سجدہ کرنے کے برابر جگہ چھوڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ایک بے اصل اور فضول کام ہے۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ نے فتاویٰ دار العلوم میں اس کو بے اصل و بے ضرورت قرار دیا ہے۔(۱)

نمازِ جنازہ کے بعد دعاء و فاتحہ

نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ کو تدفین کے لیے لے کر چلنا چاہیے، اس لیے نماز کے بعد جو بعض جگہ لوگ لمبی لمبی دعائیں اور اس میں فاتحہ مروجہ پڑھتے ہیں، یہ صحیح نہیں؛ بل کہ حضراتِ فقہا کرام نے بہ صراحت نمازِ جنازہ کے بعد دعا کو مکروہ قرار دیا ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ نے بہ حوالہ ''خلاصہ'' فرمایا ہے کہ:

'' **لایدعو بعد التسلیم** '' کہ (نمازِ جنازہ میں) سلام پھیرنے کے بعد دعا نہ کرے۔(۲)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

'' **ولا یدعو للمیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ یشبہ الزیادۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ** '' (۳)

(یعنی نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا نہ کی جائے؛ کیوں کہ

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم: ۲۸۹/۵

(۲) البحر الرائق: ۱۸۳/۱

(۳) مرقاۃ شرح المشکوٰۃ: ۶۴/۴

یہ نمازِ جنازہ میں اضافہ کے مشابہ ہے)

اور فقہ حنفی کی مستند کتاب ''محیط'' میں دعا بعد الجنازہ کو مکروہ لکھا ہے۔(۱)

اسی طرح دوسری کتبِ فقہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کا رواج ایک بدعت اور دین میں اضافہ کی طرح ہے۔اور اس میں فاتحہ مروجہ کا اضافہ ''کریلا اور نیم چڑھا'' کا مصداق ہے، کیوں کہ فاتحہ مروجہ کا بھی کوئی شرعی ثبوت نہیں ہے اور یہ بھی ''ایجادِ یاران'' کی قبیل سے ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔(۲)

یہ کہنا کہ ہم اللہ کا کلام ہی تو پڑھ رہے ہیں یا یہ کہ اللہ سے دعا ہی تو کر رہے ہیں، اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ کوئی شرعی اندازِ فکر نہیں ہے۔دیکھئے عبادات کے سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی بات تجویز کرنا اسلام میں جائز نہیں،ایسی باتوں کو بدعت اور دین میں اضافہ کہتے ہیں۔پھر غور کیجئے کہ اگر نمازِ جنازہ کے بعد دعا اور فاتحہ کوئی ثواب کی بات ہوتی تو بڑے بڑے فقہا اس سے کیوں منع کرتے؟ کیا ان حضرات کو ثواب کی حرص نہ تھی؟ کیا وہ حضرات اچھی اور ثواب کی باتوں سے منع کر دیتے؟ معلوم ہوا کہ ان باتوں کا شریعت میں کوئی جواز نہ تھا اسی لیے ان حضرات نے ان سے منع کیا ہے اور وہ حضرات دین کو ہم سے زیادہ سمجھتے تھے اور دین پر چلنے کا ہم سے زیادہ اہتمام کرتے تھے اور سارا دین اور اس کی ساری جزئیات ان کی نگاہ میں تھیں، اگر انہوں نے اس سے منع کیا ہے تو ہم کو اس سے احتراز و اجتناب ضروری ہے۔

---

(۱) بہ حوالہ راہِ سنت،ص:۲۰۶،از مولانا سرفراز احمد خان صاحب زید مجدہم

(۲) اس سلسلہ میں اکابر علما کے فتاویٰ ایک مختصر رسالہ میں ''جمعیتِ بیدا اہل سنت والجماعت'' محلّہ بیدواڑی بنگلور کی طرف سے شائع کئے گئے تھے،اس میں اس مسئلہ کی تحقیق دیکھی جاسکتی ہے۔

نمازِ جنازہ میں لوگوں کا انتظار

عام طور پر لوگ جماعت کی کثرت کے خیال سے نمازِ جنازہ میں تاخیر کرتے ہیں اور لوگوں کا انتظار کرتے ہیں، اسی طرح جمعہ کی رات میں؛ بل کہ جمعرات کے دن مرنے والے کی نمازِ جنازہ جمعہ میں پڑھتے ہیں، تاکہ زیادہ لوگ شرکت کریں؛ مگر یہ رسم غلط اور احکامِ شرعیہ کے خلاف ہے؛ کیوں کہ حکم یہ ہے کہ جلدی سے جلدی میت کو اس کی منزل تک پہنچا دیا جائے، جیسا کہ اوپر حدیث نقل کر چکا ہوں۔ درمختار میں ہے کہ نمازِ جنازہ اور تدفین میں اس لیے تاخیر کرنا کہ جمعہ کے بعد ایک عظیم مجمع نمازِ جنازہ پڑھے، مکروہ ہے۔(۱)

حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اس مسئلہ کی فقہا نے تصریح فرمادی ہے کہ اگر جمعہ سے قبل تدفین ممکن ہے، تو جمعہ کا انتظار جائز نہیں۔ تھوڑے آدمی سنت اور رضائے حق کے مطابق نجات و مغفرت کے لیے کافی ہیں، برعکس کثیر تعداد کے جو خلافِ سنت اور خلافِ رضائے حق ہو، یہ کچھ مفید نہیں۔ (۲)

مسجد میں نمازِ جنازہ

مسجد کے اندر جنازہ لے جانا اور نمازِ جنازہ پڑھنا، علمائے حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک ناجائز اور مکروہ ہے، اگر چہ امام شافعی و امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے مسلک میں یہ جائز ہے؛ مگر ہمارے ان علاقوں میں احناف کی مساجد میں بھی یہی رواج پڑا ہوا ہے کہ جنازہ مساجد میں لاکر نماز پڑھتے ہیں۔ حالاں کہ علمائے احناف

---

(۱) درمختار مع شامی: ۲/۲۳۲

(۲) مجالس ابرار: ۱/۸۸

کا مسلک احادیث کی روشنی میں صحیح ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے جنازہ کو مسجد میں لے جانے کو کہا، اس پر لوگوں نے اعتراض کیا اور کہا:

« ما كانت الجنائز يدخل بها المسجد . » (۱)

(یعنی جنازے مسجد میں داخل نہیں کیے جاتے تھے)

اور بیہقی کی ایک روایت میں یہ اعتراض ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

« هٰذه بدعة ، ماكانت الجنازة تدخل المسجد » (۲)

نیز احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی مسجد سے قریب مگر مسجد سے الگ جنازوں کے لیے ایک جگہ بنی ہوئی تھی، چناں چہ حدیث میں ہے کہ ایک یہودی مرد و عورت کو زنا کی سزا میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگ سار کرنے کا حکم دیا اور وہ دونوں رجم کیے گئے، مسجد کے پاس جنازوں کی جگہ کے قریب۔ (۳)

اور یہی واقعہ دارمی میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے:

« فَرُجِمَا قريبا من حيث توضع الجنائز عند المسجد » (۴)

اور اس کا حاصل بھی وہی ہے، غرض یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جنازوں کے لیے الگ ایک جگہ ہوتی تھی۔

---

(۱) مسلم: ۱۶۱۶، یہ اعتراض والی بات امام احمد نے اپنی مسند: ۲۳۳۵۸، اور امام مالک نے موطا: ۴۸۴، اور بیہقی نے سنن الکبری: ۵/۳۹۴، میں بھی روایت کی ہے۔

(۲) بیہقی: ۱۳۴/۷

(۳) بخاری: ۱۲۴۳

(۴) دارمی: ۲۲۸۱

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

« من صلى على جنازة في المسجد فلا شيء له » (۱)

(یعنی جو شخص مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھے اس کے لیے کچھ اجر نہیں)

معلوم ہوا کہ مسجد میں نماز جنازہ مکروہ و نا جائز ہے۔ رہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عمل، پھر صحابہ و تابعین کے اعتراض پر ان کا یہ جواب دینا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سہیل بن بیضاء کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا، تو یہ حجت نہیں، کیوں کہ کسی ضرورت کی بنا پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہوگا۔ اور ضرورت پر احناف کی یہاں بھی مسجد میں جنازہ لے جانے کی اجازت ہے، مثلاً بارش ہو جس سے باہر نماز نہ پڑھ سکتے ہوں۔ (۲)

اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے کہ آپ اس وقت اعتکاف میں تھے اس لیے مسجد میں جنازہ لایا گیا۔ (۳)

---

(۱) طحاوی: ۱/ ۲۳۷، ابو داؤد: ۲۷۷۹، ابن ماجه: ۱۵۰۶، احمد: ۹۳۵۳۰، قال الراقم و هذ الحديث مداره على ابن ابى ذئب مولى التوأمة عن ابى هريرة وقد ضعف بعض المحدثين هذا الحديث، لانه تفرد به صالح و هو ضعيف، قال الراقم: ان صالحاً مختلف فيه وقد وثقه العجلي و ابن معين في رواية، وقال احمد : صالح الحديث، لا اعلم به بأساً. (كما في التهذيب: ۴/ ۴۰۶) و العلة فيه الاختلاط. ورواية القدماء عنه مقبولة وهذا الحديث روى عنه ابن ابى ذئب وهو من اصحابه القدماء كما في التهذيب ايضا، فالحديث محتج به و مقبول وقد حسنه العلامة ابن القيم رحمه الله في "زاد المعاد" ۱/ ۳۹۸، فثبت ان دليل الحنفية ثابتٌ و قويٌ. (و الله اعلم)

(۲) شامی: ۲/ ۲۲۶

(۳) حاشیہ مشکوٰۃ: ص: ۱۴۵

غرض یہ کہ بلا عذر مسجد میں نمازِ جنازہ مکروہ ہے؛ مگر افسوس کہ آج اکثر احناف کی مساجد میں اس مکروہ کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ کے پاس جائز ہے اس لیے ہم اس کو لیتے ہیں؛ مگر یہ بات کس قدر غلط ہے کہ بلا دلیل و وجہ اپنے امام کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک کو لیا جائے؟ پھر کیا ان لوگوں نے دلیل جان کر اور امام شافعی رحمۃ اللہ کی دلیل کو مضبوط پا کر اپنے امام کا مسلک ترک کیا ہے؟

جنازہ اُٹھانے کے احکام

جنازہ میں شرکت کا ثواب

جنازہ میں شرکت کرنا موجبِ ثواب ہے، حدیث میں ہے کہ جو جنازہ کے ساتھ اس کے گھر سے نکلے، پھر اس پر نماز پڑھے، پھر اس کے ساتھ جائے، حتیٰ کہ تدفین ہو جائے تو اس کو دو قیراط ثواب ملے گا، اور ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوگا۔ اور جو نماز پڑھ کر واپس ہو جائے تو اس کو ایک اُحد پہاڑ کے برابر ثواب ملے گا۔(۱)

اس لیے کوشش کرنا چاہئے کہ جنازہ میں شرکت کی جائے۔

جنازہ اُٹھانے کا طریقہ

حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ سے مروی ہے کہ جو جنازہ کے پیچھے چلے اس کو چاہئے کہ وہ اس کے تمام جانبوں کو اُٹھائے، کیوں کہ یہ سنت ہے، پھر اگر چاہے تو مزید اُٹھائے، اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔(۲)

اور حضرت ابن عمر ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے جنازے کے چاروں جانبوں کو (یکے بعد دیگرے) اُٹھایا۔(۳)

نیز حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے جنازہ کے چاروں پایوں کو اُٹھایا

---

(۱) بخاری:۴۵،مسلم:۱۵۷۴،و بلفظ آخر ترمذی :۹۲۱،نسائی:۴۹۴۶، ابو داؤد: ۲۷۵۵،ابن ماجہ:۱۵۲۸،احمد:۹۵۲۴۰

(۲) ابن ماجہ:۴۶۷

(۳) رواہ عبد الرزاق:۶۵۲۰، و ابن ابی شیبہ:۳/۱۶۸

اس نے اپنی ذمہ داری پوری کردی۔(۱)

ان روایات کی بنا پر ہمارے علمانے فرمایا کہ جنازہ کو چار آدمی چاروں طرف سے اُٹھائیں، اور اس کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ پہلے جنازہ کے سامنے کا پایہ اپنے داہنے کندھے پر رکھ کر کم ازکم دس قدم چلے، پھر جنازہ کے پیچھے کا پایہ اپنے کندھے پر رکھ کر (کم ازکم) دس قدم چلے، پھر جنازہ کا سامنے کا پایہ اپنے بائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلے، پھر اس کے پیچھے کا پایہ اپنے بائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلے۔(۲)

یہ طریقہ بڑے جنازہ کے لیے ہے، اور اگر جنازہ بچہ کا ہو، جس کو ہاتھوں میں اُٹھایا جاسکتا ہو تو اس کو ایک آدمی اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھالے، پھر دوسرا، اسے اسی طرح لے لے، اور اسی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ بدلتے ہوئے اس کو لے جائیں۔(۳)

چند مسائل

(۱) جنازہ لے کر چلنے میں درمیانی چال اختیار کریں، کہ نہ بہت آہستہ چلیں اور نہ بہت تیز جس سے میت کو جھٹکے لگیں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا کہ جنازہ میں جلدی کرو، کیوں کہ اگر وہ نیک ہے تو وہ خیر ہے جس کی طرف تم اس کو لے جاؤ گے اور اگر برا ہے تو وہ شر ہے جس کو تم اپنے کندھوں سے اُتاروگے۔(۴)

---

(۱) رواہ عبد الرزاق:۶۵۱۸

(۲) در مختار مع شامی:۲/۲۳۱، بدائع الصنائع:۱/۳۰۹، تحفۃ الفقہاء :۱/۲۴۴، مراقی الفلاح :۱۴۷

(۳) البحر الرائق :۲/۱۹۱،در مختار مع شامی:۲/۲۳۱،بدائع الصنائع:۱/۳۰۹،وغیرہ

(۴) اس حدیث کی تخریج وحوالہ ص:۳۲۴ پر مفصلاً گزرا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنازہ لے کر چلنے میں جلدی کرنا چاہئے؛ مگر بہت جلدی و تیزی نہیں، کیوں کہ ایک اور حدیث میں ہے کہ بعض لوگ بہت تیزی سے ایک جنازہ لے کر جا رہے تھے جس کی وجہ سے میت کو بہت حرکت ہو رہی تھی، آپ علیہ السلام نے دیکھا تو فرمایا کہ جنازوں میں تم پر درمیانی چال لازم ہے۔(۱)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ جنازہ کو لے کر کس طرح چلا جائے؟ آپ نے فرمایا:

"دون الخبب" (یعنی دوڑنے سے کم ہو)۔(۲)

(۲) جنازہ کے ساتھ عورت کا جانا منع ہے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم کو یعنی عورتوں کو جنازوں کے ساتھ جانے سے منع کیا جاتا تھا۔(۳)

(۳) جنازہ کو کندھے پر سامان کی طرح لاد کر نہ لے جانا چاہئے؛ بل کہ اکرام و اعزاز کے ساتھ ہاتھوں سے پکڑ کر کندھے پر رکھنا چاہئے۔(۴)

جنازہ کے ساتھ منکرات

جنازہ کے ساتھ بھی بعض غیر شرعی رواجات و رسومات کو عوام میں چلن حاصل ہو گیا ہے، جن کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔

عورت کے جنازہ پر سرخ چادر

جنازے پر کوئی چادر پردے کے لیے ڈال دینا اچھا ہے، اور اس میں کسی خاص

---

(۱) احمد:۱۸۸۶۴، ابن ماجہ:۱۴۶۸

(۲) ترمذی:۹۳۲،ابو داؤد:۲۷۶۹،احمد:۳۵۴۷

(۳) بخاری:۳۰۲،مسلم:۱۵۵۵،ابو داؤد:۳۷۵۴، ابن ماجہ:۱۵۶۶،احمد:۲۶۰۴

(۴) البحر الرائق:۲/۱۹۱،در مختار مع شامی:۲/۲۳۱

قسم یا رنگ کی کوئی تخصیص نہیں ہے؛ مگر عام طور پر ایک رواج چل گیا ہے کہ عورت اور خاص طور پر نئی نویلی دلہن کے مر جانے پر اس کے جنازے پر سرخ چادر ڈالتے ہیں، یہ شرعاً بے اصل اور غلط رواج ہے۔

چناں چہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

بعض جگہ یہ غلط رواج ہے کہ نوجوان لڑکی یا نئی دلہن مر جاتی ہے تو اس کے جنازے پر سرخ چادر یا زری گوٹہ کا ڈوپٹہ ڈالتے ہیں، یہ ناجائز ہے۔(۱)

جنازے پر پھولوں کی چادر

جنازے پر پھولوں کی چادر ڈالنے کا بھی عام رواج ہے اور اس کو بعض لوگ میت کا حق یا اس کے ساتھ ہم دردی خیال کرتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ پھول چوں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اس لیے ان کو میت پر ڈالنے سے ذکر کی برکت سے عذاب میں تخفیف اور ثواب میں اضافہ ہوتا ہے؛ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ صحابہ، تابعین، وتبعِ تابعین، اولیاء اللہ وائمہ ٔ اسلاف نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیا وہاں پھول نہ تھے؟ یا ان کی چادر نہ بن سکتی تھی؟ یا وہ میت کی ہمدردی وغم خواری کے جذباتِ نیک سے خالی تھے؟ یا یہ کہ ان حضرات کو پھولوں کا ذکر کرنا معلوم نہ تھا؟ آخر کیا بات تھی کہ انہوں نے نہ یہ بات سوچی اور نہ ایسا کام کیا؟

ظاہر ہے کہ اگر یہ کام ثواب کا ہوتا یا اس میں کوئی بھی فائدہ ہوتا، تو یہ حضرات ضرور اس کو کرتے اور ان کا عمل نقل ہو کر ہم تک پہنچتا؛ لیکن جب ان حضرات نے نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کام ثواب کا نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے، اس

---

(۱) اغلاط العوام: بہ ترتیب مولانا مہربان علی صاحب رحمۃ اللہ: ۲۰۸

لیے یہ ایک بدعت ہے۔ بعض لوگ اس بدعی کام کے لیے ایک حدیث سے دلیل پکڑتے ہیں، وہ یہ کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوقبروں پر درخت کی ایک شاخ کو دو حصوں میں کر کے لگایا اور فرمایا کہ یہ شاخ جب تک تازہ رہے گی ان دوقبر والوں پر عذاب میں کمی ہوگی۔ اس حدیث پر کلام اور اس کی تشریح آگے چل کر عنوان ''قبروں پر پھولوں کی چادر'' کے تحت آئے گی، ان شاء اللہ تعالی۔ اور وہیں یہ معلوم ہوگا کہ اس حدیث سے ان لوگوں کا یہ استدلال کس قدر کمزور اور لایعنی ہے۔ غرض یہ کہ یہ سب فضول کام ہیں ان سے بچنا چاہئے اور اصل چیز جو میت کے لیے مفید ہے یعنی ایصالِ ثواب کی نیت سے خیرات وصدقات اور ذکر وتلاوت وغیرہ ان میں مشغول ہونا چاہئے۔

جنازے کے ساتھ ذکرِ جہری

جنازے کے ساتھ اللہ کا ذکر آہستہ آہستہ کرتے ہوئے یا موت کے احوال پر غور کرتے ہوئے چلنا چاہئے؛ مگر زور سے ذکر، دعا، تلاوت مکروہ ہے۔ (۱)

کیوں کہ اس موقعہ پر زور سے ذکر وتلاوت کو صحابہ واسلاف نے؛ بل کہ خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند کیا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی تین موقعوں پر خاموش رہنے کو پسند کرتا ہے، تلاوتِ قرآن، جنگ اور جنازہ کے وقت۔ (۲)

حضرت قیس بن عباد رحمۃ اللہ جو اکابر تابعین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ حضراتِ صحابہ تین جگہ آواز بلند کرنے کو مکروہ خیال کرتے تھے، ایک جنازہ کے ساتھ،

---

(۱) الاذکار للنووی:۱۷۱، بدائع الصنائع:۱/۳۱۰

(۲) تفسیر ابن کثیر :۲/۲۱۹

دوسرے جنگ میں، تیسرے ذکر یعنی وعظ کے وقت۔(۱)

حضرت قیس رحمۃ اللہ ہی سے منقول ہے کہ حضراتِ صحابہ جنازے، ذکر اور جنگ کے وقت آواز پست رکھنے کو پسند کرتے تھے۔(۲)

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''جنازے کے ساتھ آواز بلند کرنا پسندیدہ نہیں، نہ ذکر سے نہ تلاوت سے اور نہ کسی اور چیز سے، یہی ائمہ اربعہ کا مذہب ہے اور یہی حضراتِ سلف، صحابہ وتابعین سے مروی ومنقول ہے، میں اس میں کسی کا اختلاف نہیں پاتا۔(۳)

جنازے کے ساتھ زور سے ذکر وتلاوت کو فقہا نے مکروہ قرار دیا ہے۔(۴)

بل کہ حضرت ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ سے مروی ہے کہ وہ اس بات کو بھی مکروہ قرار دیتے ہیں کہ کوئی شخص جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے کسی سے یوں کہے کہ میت کے لیے استغفار کرو، کہ اللہ تمہاری مغفرت کرے گا، وہ فرماتے ہیں کہ یہ بدعت ہے، اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ اور حضرت عطا وغیرہ سے بھی آیا ہے۔(۵)

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ بعض بعض جگہ خصوصاً دیہاتوں میں جو جنازے کے ساتھ زور سے ذکر وتلاوت کرتے ہیں، یہ مکروہ ہے۔ جب یہی مکروہ ہے تو اشعار وقصائد ومرثیہ نامہ پڑھنے کی کیسے اجازت ہوسکتی ہے؟

---

(۱) البحر الرائق:۵/۷٦

(۲) ابن ابی شیبہ:۳/۱٦۰

(۳) فتاوٰی ابن تیمیہ :۲۴/۲۹۴

(۴) درمختار مع شامی:۲/۲۳۳،عالمگیری:۱/۱۷۲، المبسوط للسرخسی :۲/

(۵) کتاب الآثار لابی یوسف رحمۃ اللہ :۷٦، ابن ابی شیبہ:۳/۱۵۹

سواری پر جنازہ

بہت سے لوگ غیر قوموں کی تقلید میں جنازے کو سواری پر لے جاتے ہیں، اور اس کو فخر محسوس کرتے ہیں اور اس کے لیے مستقل آمبولینس بھی ملتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہئے کہ بلاضرورت جنازے کو سواری پر لے جانا مکروہ ہے۔ چناں چہ فقہا نے اس کی تصریح کی ہے۔(۱)

لہٰذا اس سے پرہیز کرنا چاہئے، پھر اس میں غیر قوموں سے مشابہت بھی پائی جاتی ہے، چناں چہ عیسائی اور ہندو قوموں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے مُردوں کو سواری پر لے جاتے ہیں اور غیر قوموں سے مشابہت بھی اسلام میں ناجائز ہے۔ البتہ کوئی عذر ہو تو سواری پر لے جانے کی اجازت ہے، مثلاً اُٹھانے والے ایک دو ہی آدمی ہوں یا قبرستان اتنی دور ہو کہ اُٹھا کر لے جانا مشکل ہو تو سواری پر لے جانا مکروہ نہیں ہے۔(۲)

جنازے کے ساتھ سواری پر جانا

بعض لوگ جنازے کے ساتھ بھی اپنی سواریوں پر جاتے ہیں، یہ بھی مکروہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے کے ساتھ جارہے تھے، آپ کے خادموں میں سے کسی نے سواری پیش کی، تو آپ نے اس پر سوار ہونے سے انکار کردیا، پھر جب (تدفین کے بعد) واپس لوٹے تو پھر سواری پیش کی گئی اور اس پر سوار ہوگئے، لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ فرشتے چل رہے تھے لہٰذا

---

(۱) تحفة الفقهاء:۱/۲۴۴، البحر الرائق :۲/۱۹۱، در مختار مع شامی:۲/۲۳۱

(۲) الطحطاوی علی المراقی :۳۵۲، الفقه علی المذاهب الاربعة :۱/۵۳۱

میں سوار نہ ہوا، اور جب وہ چلے گئے تو میں سوار ہو گیا۔(۱)

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ جنازے کے ساتھ سواری پر جارہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ فرشتے چل کر جارہے ہیں، اور تم جانوروں کی پشت پر سوار ہو۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ بلا ضرورت جنازے کے ساتھ سواری پر جانا پسندیدہ نہیں، ہاں کوئی ضرورت ہو مثلاً کوئی بیمار یا بوڑھا ہے یا قبرستان بہت دور ہے، تو اس کی اجازت ہے، چناں چہ حدیث میں جو آیا ہے:

« الراكب خلف الجنازة » یعنی سوار جنازے کے پیچھے آئے۔(۳)

اس کو ہمارے علما نے عذر پر محمول کیا ہے، ہاں واپسی کے وقت سواری پر آنا بلا کراہت جائز ہے جیسا کہ اوپر حدیث سے معلوم ہوا۔ نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن الدحداح رضی اللہ عنہ کے جنازے سے واپسی پر سواری اختیار فرمائی تھی۔(۴)

---

(۱) ابو داؤد:۳۱۷۳

(۲) ترمذی:۱۰۱۲، ابن ماجہ:۱۴۸۰

(۳) ابو داؤد:۳۱۸۰، ترمذی:۱۰۳۱، نسائی:۱۹۴۲، ابن ماجہ:۱۵۰۷، احمد:۱۸۱۷۴

(۴) مسلم:۹۶۵، ابو داؤد:۳۱۷۸، ترمذی:۱۰۱۴، نسائی:۲۰۱۹، احمد:۲۰۸۲۸

تدفین کے احکام

اس کے بعد اب مرحلہ ہے میت کی تدفین کا، جس کے شرعی احکامات یہاں پر درج کیے جاتے ہیں:

قبر کیسی ہو؟

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ قبر پر قبر کھودنے والے کو حکم فرما رہے تھے کہ پیروں کے پاس وسیع وکشادہ کرو، سر کی جانب وسیع وکشادہ کرو۔(۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ ہشام بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم کو زخم پہنچا ہے، ہر انسان کے لیے قبر کھودنا مشکل ہے کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ قبر کھودو اور اس کو کشادہ بناؤ۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کو گہری اور عمدہ بناؤ الخ۔(۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قبر کشادہ اور گہری ہونا چاہئے۔علما نے لکھا ہے کہ قبر آدھے قد کے برابر گہری ہونا چاہئے اور اس سے زیادہ بھی ہو تو مضائقہ نہیں؛ مگر بہت گہری بنانا اچھا نہیں، اور قبر کی لمبائی میت کے قد کے برابر ہو اور عرض (چوڑائی) میت کے قد سے آدھا ہو۔(۳)

---

(۱) رواه ابوداؤد في البيوع:۲۸۹۴،واحمد:۲۸۹۴،وقال ابن حجر:اسناده صحيح۔ (التلخيص الحبير :۲/ ۱۲۷)

(۲) ابوداؤد:۲۸۰۰،ترمذی :۱۶۳۵،نسائی:۱۹۸۴

(۳) در مختار مع شامی:۲/۲۳۴، البحر الرائق :۲/۱۹۳

اور قبر میں سنت یہ ہے کہ بغلی بنائی جائے، حدیث میں ہے کہ آں حضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ:

« اَللَّحْدُ لَنَا وَ الشَّقُّ لِغَیْرِنَا »

(یعنی بغلی قبر ہمارا طریقہ ہے اور صندوقی غیروں کا طریقہ ہے)۔(۱)

اور خود اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لیے بھی لحد یعنی بغلی قبر بنائی گئی تھی، جیسا کی حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے لیے لحد بناؤ اور اینٹ رکھو جس طرح کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ کیا گیا۔(۲)

نیز ایک اور حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا وصال ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس بارے میں اختلاف ہوا کہ آپ کے لیے لحد بنائی جائے یا شق بنائی جائے؟ پھر صحابہ نے یہ تجویز کیا کہ لحد بنانے والے اور شق بنانے والے دونوں کو بلایا جائے اور جو اُن میں سے پہلے آئے اس کو اس کا کام دیا جائے، چناں چہ پہلے وہ صحابی آئے جو لحد بناتے تھے، لہٰذا آپ کے لیے لحد بنائی گئی۔(۳)

بغلی قبر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ قبر کھود کر قبلہ کی طرف ایک گڑھا کھودا جائے جس میں میت کو رکھا جا سکے، اور اگر زمین بہت نرم ہو کہ بغلی قبر کے بیٹھ جانے کا اندیشہ ہو، تو پھر صندوقی بھی بنا سکتے ہیں، جس کا طریقہ یہ کہ قبر کے اندر زمین کے بیچ میں گڑھا کھودا جائے۔

---

(۱) ابوداؤد: ۳۲۰۸، ترمذی: ۱۰۴۵، نسائی: ۲۰۰۹، ابن ماجہ: ۱۵۵۴، احمد: ۱۸۳۶۸، ابن ابی شیبہ: ۳/۱۲، عبد الرزاق: ۶۳۸۵

(۲) ابن ماجہ: ۱۵۵۶، مسلم: ۹۶۶، نسائی: ۲۰۰۸، احمد: ۱۴۵۰

(۳) ابن ماجہ: ۱۵۵۷

دفنانے کا طریقہ

جب قبر تیار ہوجائے تو اس میں میت کو اُتارا جائے، اس کا طریقہ یہ کہ جنازہ قبر سے قبلہ کی طرف رکھا جائے، اور اُتارنے والے قبلہ رو کھڑے ہوکر میت کو اُٹھائیں اور قبر میں اُتاریں، کیوں کہ میت کو قبلہ کی طرف سے اُتارنا سنت ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم (ایک دفعہ) قبر میں اُترے اور میت کو قبلہ کی طرف سے پکڑا۔ (۱)

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے یزید بن المکفف کو قبلہ کی طرف سے قبر میں اُتارا، اسی طرح ابن الحنفیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو قبلہ کی طرف سے اُتارا۔ (۲)

جب قبر میں اُتارے، تو اُتارنے والا اور رکھنے والا یہ دعاء پڑھے:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ وَ عَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﴾ (۳)

بعض روایات میں "سنة" کی جگہ "ملة" آیا ہے۔ پھر میت کو داہنی کروٹ پر قبلہ رخ لٹادیا جائے اور اس کے کفن کی گرہ کھول دی جائے، پھر کچھ اینٹوں سے بند کردیا جائے جیسے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے ساتھ کیا گیا تھا۔ (یہ حدیث ابھی اوپر گزرچکی ہے) علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے لیے نو (۹) اینٹیں رکھی گئی تھیں۔ (۴)

لہٰذا نو (۹) اینٹیں رکھنا سنت ہوگا، ضرورت ہوتو زائد بھی رکھی جاسکتی ہیں؛ مگر

---

(۱) ترمذی: ۹۷۷

(۲) ابن ابی شیبہ: ۱/۱۳۱

(۳) ترمذی: ۹۶۷، ابو داؤد: ۲۷۹۸، ابن ماجہ: ۱۵۳۹

(۴) شرح مسلم للنووی: ۱/۳۱۱

پکی اینٹیں رکھنے سے علما نے منع کیا ہے، اسی طرح بانس کا قبر میں رکھنا درست تو ہے؛ مگر لکڑی کے تختے رکھنا مکروہ ہے۔ (۱)

البتہ زمین بہت نرم ہو جس کی وجہ سے قبر کے بیٹھ جانے کا خوف ہو تو پختہ اینٹ اور لکڑی بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ (۲)

عورت کو قبر میں رکھتے وقت کپڑے وغیرہ سے پردہ کرنا مستحب ہے، مرد کی قبر پر پردہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (۳)

حضرت علی ﷺ نے حضرت قیس کے جنازہ پر جب کپڑے سے پردہ کیا گیا، تو اس کو کھینچا اور فرمایا کہ یہ تو عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (۴)

نیز حضرت حارث کے جنازے پر جب کپڑے سے پردہ کیا گیا تو حضرت عبد اللہ بن زید ﷺ نے اس کو کھینچ دیا۔ (۵)

ہاں! اگر کوئی عذر ہو جیسے بارش ہو یا برف باری ہو یا سخت گرمی ہو، تو مرد کی قبر پر پردہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۶)

---

(۱) در مختار مع شامی:۲/۲۳۶، الجامع الصغیر:۹۲

(۲) در مختار مع شامی:۲/۲۳۶

(۳) الجامع الصغیر :۹۲، الهداية :۱/۱۶۲

(۴) بہ حوالہ: التلخیص الحبیر :۲/۱۲۱

(۵) بیهقی:۴/۱۷۹، امام بیہقی نے اس کی سند کو صحیح فرمایا ہے۔

(۶) شامی:۲/۲۳۶ اور حضرت سعد بن معاذ ﷺ کی قبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پردہ کرانا جو "بیہقی" (۵/۳۹۸) وغیرہ نے روایت کیا ہے، اولاً وہ صحیح نہیں، پھر ہو سکتا ہے کہ کسی عذر کی بنا پر ہو، واللہ اعلم۔

اس کے بعد قبر پر مٹی ڈال دی جائے، اس طرح کہ سرہانے کی طرف سے ہر آدمی تین تین مٹھی مٹی قبر میں ڈالے، حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی، پھر قبر پر آئے اور تین مٹھی مٹی سر کی طرف سے ڈالی۔(۱)

اور مٹی ڈالتے ہوئے پہلی مٹھی پر ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ﴾ دوسری مٹھی پر ﴿وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ﴾ اور تیسری مٹھی پر ﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ﴾ پڑھا جائے۔ پھر بقیہ مٹی قبر پر ڈال دی جائے۔(۲)

اس دعا کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے، جس میں ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے انتقال پر اللہ کے نبی ﷺ نے ان کو قبر میں رکھتے ہوئے یہی پڑھا تھا۔(۳)

مگر اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ پہلی مٹھی پر یہ اور دوسری پر یہ اور تیسری پر یہ پڑھا تھا، واللہ اعلم۔ رہا حاضرین کا تین مٹھی مٹی ڈالنا، یہ متعدد احادیث میں آیا ہے۔ (۴)

قبر بنانے کا مسنون طریقہ

پھر قبر کو مسنون شکل پر بنایا جائے اس طرح کہ قبر پر جو مٹی ڈالی جائے وہ صرف

---

(۱) ابن ماجہ:۱۵۵۴

(۲) الاذکار للنووی: ص۱۷۳، فتاویٰ عالمگیری:۱/۱۶۶، الجوهرة النيرة:۱/۱۵۸

(۳) مستدرک حاکم:۲/۴۱۱، حدیث نمبر:۳۴۲۳، بیهقی:۳/۴۰۱، حدیث نمبر:۶۵۱۷، مگر اس کی اسناد ضعیف ہے، جیسا کہ ابن حجر نے "التلخیص" ۲/۱۳۰، میں اور هیثمی نے "مجمع الزوائد":۲/۴۳، میں فرمایا ہے۔

(۴) مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں شرکت کی اور ان کی قبر میں اپنے دونوں ہاتھوں سے تین مٹھی مٹی ڈالی۔ بیهقی:۶۸۳۰

وہی ہونا چاہئے جو قبر کھودتے وقت نکالی گئی تھی، حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر زیادتی کرنے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

جب مٹی ڈالی جائے تو اس کو کوہان جیسی بنادیا جائے اور ایک بالشت یا اس سے کچھ زائد اونچی بنایا جائے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کوہان کی شکل پر بنائی گئی تھی۔(۲)

نیز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قبریں بھی اسی طرح بنی ہوئی ہیں۔(۳)

قبر کا مربع یعنی چوکور بنانا منع ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو مربع بنانے سے منع کیا ہے۔(۴)

قبر کو بہت اونچی بھی نہ بنانا چاہئے؛ بل کہ سنت یہ ہے کہ ایک بالشت اونچی بنائی جائے، حدیث میں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو ایک بالشت اونچی بنایا گیا تھا۔(۵)

قبر تیار ہونے کے بعد اس پر پانی چھڑک دیا جائے۔حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ صاحب زادہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی چھڑکا تھا۔(۶)

---

(۱) نسائی:۲۰۰۰،ابو داؤد:۲۸۰۷،بیهقی:۵/۲۸۵

(۲) بخاری:۱۳۰۲، ابن ابی شیبه:۳/۲۱۵

(۳) کتاب الآثار:۵۲،فتح الباری:۳/۲۵۷

(۴) کتاب الآثار:۵۲، و ذکره ابن حجر فی "الدرایة":۱/۲۴۱و سکت عنه۔

(۵) ابن حبان فی صحیحه:۶۶۳۵،خلاصة البدر المنیر لابن الملقن:۱/۲۷۱

(۶) بیهقی:۵/۲۸۶،مراسیل:۴۲۴

اور خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ اطہر پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس طرح سے پانی چھڑکا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سر سے اپنی داہنی طرف سے شروع کیا اور پیروں پر ختم کیا۔(۱)

اس کے بعد کوئی آدمی قبر کے سرہانے سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ اور پائنتی سورۂ بقرہ کا آخری حصہ (آمن الرسول سے) کھڑے ہوکر پڑھے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب کوئی مرجائے تو اس کو محبوس نہ رکھو، بل کہ اس کو اس کی قبر تک جلدی پہنچادو، اس کے سرہانے سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ اور پائنتی سورۂ بقرہ کا آخری حصہ پڑھا جائے۔(۲)

اور حضرت ابوالجلاج سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو دفن کرنے کے بعد میرے سرہانے سورۂ بقرہ کا شروع اور پائنتی سورۂ بقرہ کا آخری حصہ پڑھیں۔(۳)

دفن اور قبر کے چند مسائل

قبر پر گچ کرنا یا مٹی لیپنا یا عمارت بنانا جائز نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر گچ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔(۴)

اسی طرح قبر پر لکھنا جیسا کہ آج کل رواج ہوگیا ہے اور لوگ اس کو بھی فخریہ

---

(۱) بیہقی :۵/۲۷۸، التلخیص :۲/۱۳۳

(۲) مشکوۃ المصابیح:ص:۱۴۹

(۳) نصب الرایۃ:۲/۳۰۸، بیہقی:۵/۴۰۴

(۴) مسلم: ۱۶۱۰، ترمذی: ۹۷۲، نسائی: ۲۰۰۰، ابو داؤد: ۲۸۰۷، ابن ماجہ: ۱۵۵۱، احمد: ۱۴۰۳۸

اپناتے ہیں، یہ بھی مکروہ وناجائز ہے، حدیث میں اس سے نہی آئی ہے۔(۱)

لہٰذا قبروں پر نام، تاریخ وفات وغیرہ کندہ کرواکر لگانے سے پرہیز کرنا بہتر ہے، ہاں اگر کوئی ضرورت ہوتو اس کی اجازت دی گئی ہے۔(۲)

اگر کوئی حاملہ عورت مرجائے تو اگر اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہوتو اس کا پیٹ چاک کرکے بچہ کو نکال لینا چاہئے، پھر عورت کو دفنانا چاہئے۔(۳)

دفنانے کے بعد تمام حاضرین کا میت کے حق میں دعا کرنا سنت ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ تدفین سے فارغ ہوتے تو فرماتے کہ اپنے (مردہ) بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو، کیوں کہ وہ اب سوال کیا جاتا ہے۔(۴)

جو بچہ مرکر پیدا ہو اس کو بھی اسی طرح قبر کھود کر دفنایا جائے جیسے اوپر مذکور ہوا، صرف گڑھا کھود کر نہ ڈال دینا چاہئے۔(۵)

اگر پانی کے جہاز میں کوئی مرجائے اور ساحل قریب نہ ہوتو غسل وکفن دینے اور نماز پڑھنے کے بعد اس کو سمندر میں ڈال دیا جائے۔(۶)

قبر میں اُتارنے کے لیے بہتر وہ لوگ ہیں جو میت کے قریبی رشتہ دار ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں اُتارنے کے لیے حضرت علی، حضرت قثم بن

---

(۱) ترمذی:۹۷۲،ابن ماجہ:۱۵۵۶،ابو داؤد:۲۸۰۷،نسائی:۲۰۰۰

(۲) شامی:۲/۲۳۸

(۳) فتح القدیر:۲/۱۵۰،شامی:۲/۲۳۸

(۴) ابو داؤد:۲۸۰۴

(۵) فتاوی دارالعلوم دیوبند:۵/۲۸۵

(۶) البحر الرائق:۲/۱۹۳

عباس، حضرت فضل بن عباس اور آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت شقران رضی اللہ عنہم مقرر ہوئے تھے۔ (۱)

اور عورت کو قبر میں اُتارنے والا وہ ہو جس کو زندگی میں اس کا دیکھنا جائز تھا، ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں اور امام طحاوی رحمۃ اللہ نے مشکل الآثار میں روایت کیا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا زوجۂ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ازواجِ مطہرات سے معلوم کروایا کہ ان کو قبر میں کون اُتارے؟ ازواجِ مطہرات نے بتایا کہ جوان کو دیکھ سکتا تھا وہی ان کو قبر میں اُتارے۔ (۲)

دفن وقبر کے سلسلہ میں رائج اغلاط

دفن اور قبر کے بارے میں بھی بہت سارے رسومات و رواجات عوام الناس میں پائے جاتے ہیں، جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں یا شریعت میں وہ ممنوع ہیں مثلاً:

میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا

آج کل میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا رواج بھی وبا کی طرح پھیل گیا ہے اور موقعہ بے موقعہ اپنے مُردوں کو دور دور لے جاتے ہیں، اور بعض لوگ

---

(۱) ابن ماجہ: ۱۶۱۷، ابو داؤد: ۲۷۹۴، البدایۃ و النہایۃ: ۲۰۴/۵، بعض روایات میں اسامہ رضی اللہ عنہ کا اور بعض میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے۔

(۲) ابن ابی شیبہ: ۲۰۶/۳، اعلاء السنن: ۲۹۵/۸

عرب کے علاقوں میں حتّی کہ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ میں انتقال کر جاتے ہیں اور ان کے رشتہ دار وہاں سے اپنے وطن ان اموات کو منگواتے ہیں، جب کہ علما و فقہا نے تصریح کی ہے کہ میت کو اسی جگہ دفن کرنا مستحب ہے، جہاں اس کا انتقال ہوا ہے۔(۱)

اور حدیث میں ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جنگِ احد کے دن مقتولین کو اُٹھا کر لا رہے تھے، تا کہ ہم ان کو دفن کریں، پس ایک منادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو حکم دیتے ہیں کہ مقتولین کو انہیں جگہوں پر دفن کیا جائے جہاں وہ قتل ہوئے ہیں۔(۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا اور وہ حُبشی مقام سے لا کر مکہ مکرمہ میں دفن کیے گئے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی قبر پر حاضر ہوئیں اور چند اشعار پڑھے، پھر فرمایا کہ اگر میں (دفن کے وقت) حاضر ہوتی تو تم وہیں دفن ہوتے جہاں تمہارا انتقال ہوا تھا۔(۳)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ میت کو اسی بستی میں دفن کرنا چاہئے، جہاں اس کا انتقال ہوا ہے اور بعض علما نے بہ صراحت لکھا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا عذر میت کو منتقل کرنا مکروہ ہے، جب کہ تین میل سے زیادہ کا فاصلہ ہو۔(۴)

اس سے اس مسئلہ کی وضاحت ہو گئی کہ میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔ اب رہا یہ شبہ کہ حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کو ان کی جائے وفات سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو

---

(۱) البحر الرائق:۲/۱۹۵، شامی:۲/۲۳۹، مراقی الفلاح:۱۵۰

(۲) ابو داؤد:۲۷۵۲، ابن ماجہ:۱۵۰۵، ترمذی:۱۶۳۹، احمد:۱۳۶۵۳

(۳) ترمذی:۹۷۵

(۴) شامی:۲/۲۳۹، منحة الخالق علی البحر الرائق:۲/۱۹۵

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود حضرت یوسف علیہ السلام کے انتقال کے چار سو سال بعد مصر سے ملکِ شام منتقل کیا تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پہلی شریعتوں کا حکم ہے اور ہمارے لیے ان پر عمل کے جواز کی شرائط پائی نہیں جاتیں۔

جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ نے تحقیق فرمائی ہے۔(۱)

اور بعض حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں، وہ یہ کہ ان کو وادیٔ عقیق سے جہاں ان کا انتقال ہوا تھا، چند میل دور مدینہ طیبہ لاکر دفن کیا گیا۔(۲)

اس کا جواب یہ ہے کہ وادیٔ عقیق، حوالیٔ مدینہ میں سے ہے، جیسا کہ معجم البلدان سے ظاہر ہے۔(۳)

---

(۱) اس مسئلہ میں علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ جہاں انتقال ہوا وہیں دفن کرنا مستحب ہے، تاہم اگر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف منتقل کیا جائے، تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اور اس پر حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ان حضرات کی جائے وفات سے دوسری جگہ منتقل کئے جانے سے استدلال فرمایا ہے؛ مگر علامہ شامی رحمۃ اللہ نے اس استدلال پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ ہم سے ماقبل شریعتیں ہیں اور ان کے ہمارے لیے مشروع ہونے کی جو شرطیں ہیں وہ یہاں پائی نہیں جاتیں، نیز انہوں نے ''تاجیہ'' کے حوالہ سے جزم بالکراھۃ نقل کیا ہے اور ''تجنیس'' کے حوالہ سے فرمایا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا مکروہ ہے؛ کیوں کہ یہ ایک بے فائدہ چیز میں اشتغال ہے اور اس میں دفن میں تاخیر بھی ہوتی ہے اور یہ بات مکروہ ہونے کے لیے کافی ہے۔(منحة الخالق علی البحر الرائق :۲/۱۹۵)

(۲) تہذیب التہذیب : ۳/۴۸۴، ثقاتِ ابن حبان:۲/۳۲۱

(۳) دیکھو معجم البلدان:۴/۱۳۹

لہٰذا یہ ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا نہیں ہے؛ بل کہ مدینہ کے قریب سے مدینہ کے قبرستان میں لاکر دفن کرنا ہے اور یہ بالاتفاق جائز ہے۔

الغرض یہ رواج قابلِ نکیر ہے، رہا بعض بڑے بڑے علما کا موجودہ دور میں منتقل کرنا، یہ حجت ودلیل نہیں، کیوں کہ بہ قولِ حضرت مرشدی شاہ ابرارالحق صاحب:

"یہ ان بزرگوں کا فعل نہیں؛ بل کہ ان کے متعلقین کا فعل ہے، دوسرے یہ کہ عمل کتابوں پر ہونا چاہیے"۔

قبر پر اذان

بعض جگہ دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا رواج ہے، شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، علامہ ابن عابدین الشامی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں تصریح کی ہے کہ یہ بدعت ہے۔(۱)

ان کے علاوہ اور علماوفقہا نے بھی بالتصریح اذان علی القبر کو بدعت و بے اصل قرار دیا ہے، کیوں کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین؛ بل کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں، اگر یہ کوئی دینی وشرعی کام ہوتا اور ثواب کی بات ہوتی، تو یہ حضرات ضرور اس کو کرتے اور ہرگز اس کو ترک نہ فرماتے۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ثواب کا کام نہیں؛ بل کہ بے اصل ہونے کی وجہ سے دین میں اضافہ ہے جو سراسر گمراہی اور ضلالت ہے۔(۲)

---

(۱) شامی:۲/۲۳۵

(۲) اس مسئلہ پر مدلل کلام کے لیے مولانا سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہ کی کتاب ""راہِ سنت"" ص:۲۲۴تا۲۳۸، دیکھیے جو قابلِ مطالعہ ہے۔

قبر کے پاس صدقہ اور کھجور کی تقسیم

بعض جگہ جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے خیرات کرنے کو ضروری خیال کیا جاتا ہے اور اکثر جگہ دیکھا گیا کہ قبر کے پاس لوگ کھجور تقسیم کرتے ہیں، خیر خیرات کرنا اگرچہ نیکی کے کام ہیں؛ مگر کسی چیز کو یا کسی وقت کو یا کسی کیفیت کو اپنے طرف سے مقرر و متعین کر لینا، بلاشبہ دین میں اضافہ اور بدعت ہے، اسی لیے علما نے لکھا ہے کہ قبر کے پاس کھانے پینے کی چیز رکھنا منکر و غلط ہے۔

چناں چہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''قبر کے پاس کھانا پانی رکھنے پر علما نے نکیر کی ہے، کیوں کہ یہ اور اس جیسے کام کفار کے اعمال میں سے ہیں نہ کہ مسلمانوں کے کاموں میں سے''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ کھجور کی تقسیم جو قبر کے پاس کی جاتی ہے یہ مسلمانوں کا طریقہ نہیں ہے اسی طرح علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''قبر کے پاس صدقہ کرنے کو علما نے مکروہ قرار دیا ہے''۔(۲)

غرض یہ کہ اپنی طرف سے کوئی بات تجویز نہ کی جانی چاہئے؛ بل کہ شریعت نے جو سکھایا اور بتایا ہے اس پر عمل کرنا چاہئے۔

دفن کے بعد تین دعائیں

دفن کے بعد میت کے حق میں ثابت قدمی اور مغفرت کی دعا کرنا احادیث سے

---

(۱) فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ :۲۶/ ۳۰۷

(۲) فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ :۲۶/ ۳۰۷

ثابت ہے، جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں؛ مگر عوام میں جو یہ رواج ہے کہ دفن کے بعد تین دفعہ دعا کی جاتی ہے ایک قبر کے پاس، دوسرے چالیس یا ستر قدم ہٹ کر اور تیسرے قبرستان سے باہر نکلنے کے بعد قبرستان کے دروازہ پر، یہ بے اصل اور خلافِ شرع ہے۔ کسی چیز کی کیفیت و مقدار اپنی طرف سے مقرر کرنا شرع میں جائز نہیں۔ اسی لیے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

"میت کو دفن کر کے ستّر قدم پیچھے ہٹ کر دعا مانگنا بدعت اور مذموم اور ناجائز ہے"۔(۱)

غرض دفن کے بعد مذکورہ طریقہ پر دعائیں شریعت سے ثابت نہیں، لہٰذا ان کو ترک کرنا چاہئے۔

قبروں کو پختہ و اُونچا کرنا

حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبر کو پختہ کرنے، اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ قبروں کو پختہ کرنا یا اس پر عمارت بنا کر اونچا کرنا، جیسے گنبد وغیرہ بنائے جاتے ہیں، یہ ناجائز و حرام ہے؛ مگر افسوس کہ ایک ناخداترس گروہ ایسا ہے، جو اپنی زندگی کو انہیں خرافات و محرمات سے وابستہ کیا ہوا ہے اور اس کی روزی و معاش اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین؛ بل کہ بعض معمولی لوگوں کی قبروں پر مجاوری اور ان خرافاتی حرکات پر منحصر ہوگئی ہے؛ بل کہ بعض دکان دار قسم کے پیروں نے

---

(۱) فتاوی دار العلوم: ۲۸۱/۵

(۲) مسلم: ۱۶۱۰، ترمذی: ۹۷۲، نسائی: ۲۰۰۰، ابو داؤد: ۲۸۰۷، ابن ماجہ: ۱۵۵۱، احمد: ۱۴۰۳۸

جانوروں کی قبروں پر مجاوری اختیار کر رکھی ہے، جس کا ذکر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ نے اپنے ملفوظات میں کیا ہے۔(۱)

اس لیے یہ گروہ ان محرمات کو نہ صرف کرتا ہے؛ بل کہ ان کو حق اور جائز ثابت کرنے کے لیے عجیب وغریب اور نامعقول تاویلات سے کام لیتا ہے، جس کو اس قسم کی باطل؛ بل کہ مضحکہ خیز تاویلات کا نمونہ دیکھنا ہو، وہ مفتی احمد یار خان رضوی کی کتاب ''جاء الحق'' دیکھ لے، جو درحقیقت ''جاء الباطل'' کا مصداق ہے اور اس کے ساتھ ان کے مدلل ومحکم جوابات دیکھنا ہو، تو مولانا سرفراز خان صاحب صفدر کی بے مثال کتاب ''راہِ سنت'' کا مطالعہ کرے، حق وباطل میں ان شاء اللہ تعالی پوری طرح امتیاز ہو جائے گا، ہماری یہ مختصر کتاب اس کی متحمل نہیں کہ طرفین کے دلائل سے بحث کرے۔

بہ ہر حال ہم نے اوپر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث پیش کی ہے جس کا مطلب بالکل واضح ہے اور ہمارے علما نے اس سے وہی سمجھا ہے، جو اوپر پیش کیا گیا۔ امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے شاگرد اور ان کی فقہ کے سب سے بڑے شارح ہیں، وہ اپنی ''کتاب الآثار'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''ہم اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں کہ قبر کو پختہ کیا جائے یا اس پر لپائی کی جائے۔ پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی سند سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو چوکور بنانے اور ان کو پختہ کرنے سے منع کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ہم اسی کو لیتے ہیں اور یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا قول ہے۔(۲)

---

(۱) دیکھو ملفوظات جوامع الکلم: ۴۳۷

(۲) کتاب الآثار: ۵۲

غرض قبروں کو پختہ کرنا، ان کو اونچا کرنا، اور ان پر عمارت بنانا درست نہیں، لہٰذا ان سے بچنا چاہئے۔

قبروں پر غلاف اور پھول

آج قبروں کی دنیا جن خرافات و بدعات میں مبتلا ہے ان کی گنتی مشکل ہے، ہر آدمی ایک ایک چیز ایجاد کر رہا ہے، اس لیے ہم نے اوپر شرعی احکام پیش کر دئے ہیں جن کو کرنا، روا و جائز یا ثواب کی بات ہے۔ باقی خرافات میں انسان کو پڑنے کی حاجت ہی کیا ہے؟ تاہم چند مشہور بدعات اور کثرت سے رائج خرافات پر تنبیہ کرنا ضروری ہے۔

ان میں سے ایک یہ کہ قبروں پر تعظیم کے لیے غلاف ڈالتے ہیں، اور اس میں ان بزرگ کی عظمت سمجھتے ہیں، یہ بھی بے اصل اور فضول ہے اور اسراف اور تبذیر میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے جس کی حرمت قرآن کی نص سے ثابت ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

﴿ تکره الستور علی القبور ﴾

یعنی قبروں پر پردہ (غلاف) مکروہ ہے۔(۱)

اسی طرح قبروں پر پھول یا پھولوں کی چادر ڈالی جاتی ہے جو سراسر لغو کام ہے۔ اگر یہ غلاف ڈالنا اور پھول یا پھولوں کی چادر ڈالنا دین کا کام ہوتا، یا اس سے کوئی فائدہ متصور ہوتا، تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین، علما و ائمہ ضرور اس کو کرتے اور اس کا حکم دیتے، حالاں کہ ان حضرات سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا ان کاموں کا بدعت ہونا یقینی امر ہے۔

(۱) شامی:۲/ ۲۳۸

بعض لوگ قبروں پر پھول ڈالنے کے جواز پر ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے دو قبروں پر عذاب ہوتا دیکھ کر ان پر سبز شاخیں لگائیں اور فرمایا کہ یہ جب تک سبز رہیں گی ان قبروں پر عذاب میں کمی ہوگی۔(۱)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح شاخ تخفیف عذاب کا باعث ہے اسی طرح پھول بھی عذاب میں کمی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ استدلال سراسر دھوکہ اور باطل ہے:

اوّلاً: تو اس لیے کہ حدیث میں پھول کا ذکر نہیں ہے، شاخ گاڑنے کا ذکر ہے، لہٰذا اس سے پھول یا پھولوں کی چادر پر استدلال بے معنیٰ ہے۔ رہا شاخ لگانا تو اس کی اجازت ہے اور علما نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔(۲)

رہی یہ بات کہ اللہ کے رسول ﷺ نے شاخ اس لیے لگائی تھی کہ وہ ذکر و تسبیح کرتی ہے اس لیے پھول بھی ذکر و تسبیح کرتے ہیں، قبروں پر ڈالنا درست ہونا چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ ذکر و تسبیح تو ہر چیز کرتی ہیں پھول کی کیا تخصیص؟ دوسری چیزیں کیوں نہیں ڈالی جاتیں؟

ثانیاً: اس لیے کہ علما کی ایک جماعت نے اس عمل سے عذاب میں تخفیف کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”علامہ خطابی رحمہ اللہ اور ان کے متبعین نے قبروں پر شاخ رکھنے پر نکیر کی ہے، اور علامہ طرطوشی رحمہ اللہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

(۱) بخاري: ۲۱۱، مسلم: ۴۳۹، نسائي: ۲۰۳۱، ابو داؤد: ۱۹، احمد: ۱۸۷۷، دارمي: ۷۳۶
(۲) شامي: ۲/ ۲۴۵

یہ اللہ کے نبی ﷺ کے ہاتھ کی برکت کے ساتھ خاص ہے۔(۱)

ثالثاً: اس لیے کہ یہ عمل اللہ کے رسول ﷺ کی دعا و شفاعت ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک طویل حدیث میں اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ کے نبی ﷺ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

« انی مررت بقبرین یعذبان فاحببتُ بشفاعتی ان یرفّه ذالک عنهما مادام الغصنان رطبین . » (۲)

(میں دو قبروں کے پاس سے گزرا جن پر عذاب ہو رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ میری سفارش و شفاعت سے ان سے عذاب کم کر دیا جائے، جب تک کہ یہ شاخیں سبز رہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ اصل تو آپ کی شفاعت ہے اور شاخ رکھنا اس مدت کے لیے علامت کے طور پر ہے جس میں عذاب کی تخفیف ہوئی یا ہوگی۔

رابعًا: اس لیے کہ اس میں بعض علما و صوفیا کرام کا فرمان ہے کہ یہ تخفیف عذاب دراصل نبی کریم ﷺ کا ایک معجزہ ہے نہ کہ ان تازہ شاخوں کی کرامت، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمہ اللہ کے ملفوظات ''جوامع الکلم'' میں اس حدیث کے بارے میں فرمایا:

آیت کریمہ ﴿ وان من شئی الا یسبح بحمدہ۔ ﴾ تو خشک و تر دونوں کو شامل ہے۔

---

(۱) فتح الباري:۱/۳۲۰

(۲) مسلم:۵۳۲۸

پھر اس حدیث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے فرمایا:

''لیکن تخفیف عذاب کی دراصل وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے، کہ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ یہ دونوں شاخیں سبز رہیں اور ان دونوں اہلِ قبور پر عذاب میں کمی ہوتی رہے۔(۱)

بہ ہر حال یہ پھول کی چادر کا رواج بے اصل ہے اگر حدیث کی اتباع کا شوق ہی ہے تو شاخ لگانا چاہئے، جیسا کہ حضرت بریدہ بن الحصیب رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری قبر پر دو شاخیں رکھ دی جائیں۔(۲)

اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ بھی نے اسی طرح کیا ہے۔(۳)

پھر یہ بات اس لیے بھی بہتر ہے کہ پھول کی بہ نسبت شاخ وٹہنی بہت دیر تک سبز و تازہ رہتی ہے تو اس سے پھول کی بہ نسبت فائدہ بھی زیادہ ہوگا، چناں چہ بعض علمانے لکھا ہے کہ اللہ کے رسول علیہ السلام نے ٹہنی اور شاخ کا انتخاب اس لیے کیا کہ وہ دیر تک سبز رہتی ہے، جس سے دیر تک ذکر و تسبیح جاری رہے گی اور میت کے لیے سود مند ہوگی۔(۴)

---

(۱) جوامع الکلم :ص ۵۰۷

(۲) بخاری کتاب الجنائز، باب الجریدة علی القبر

(۳) زهر الربی علی النسائی :۱/۱۳

(۴) زهر الربی علی النسائی :۱/۳

قُل کے ڈھیلے

لوگوں میں رواج ہے کہ دفن کے وقت ''قل ھو اللہ احد'' پڑھ کر ڈھیلوں پر دم کر کے قبر میں میت کے سرہانے رکھتے ہیں، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ نے لکھا........................

تدفین کے بعد

میت کی تدفین کے بعد غم غلط کر کے میت کی بھلائی کی خاطر جو کام کرنے کے ہیں ان کو کیا جائے اسی طرح اس سلسلہ کے دیگر شرعی احکامات کو پورا کر کے اللہ اور اللہ کے رسول کو خوش کرنے کی فکر کی جائے۔تدفین کے بعد کا شرعی دستور العمل یہ ہے:

تدفین کے بعد کا شرعی دستور العمل

ایصالِ ثواب

میت کو ثواب پہنچانے کے لیے شریعت نے جو کام بتائے ہیں ان کو انجام دیا جائے اور ان کا ثواب میت کو پہنچا دیا جائے۔ جمہور علما اہل سنت کے نزدیک مالی عبادات جیسے صدقہ وخیرات اور بدنی عبادات جیسے نماز وروزہ، ذکر وتلاوت ودعاو استغفار وغیرہ کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور وہ اس سے منتفع ہوتی ہے۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

.... ہے کہ یہ ثابت نہیں۔(فتاوی دارالعلوم: ۵/ ۴۱۵) اس رسالہ کی پہلی اشاعت میں یہی لکھا گیا تھا، پھر مولانا عبدالقدوس صاحب بنگلوری رحمۃ اللہ کی کتاب ''خطباتِ جمعہ'' نظر سے گزری اس میں آپ نے اس کی دلیل میں ایک حدیث بہ حوالہ حاکم نقل کی ہے؛ مگر مستدرک میں مجھ کو نہیں ملی، اور متعدد علمائے حدیث (جن میں مفتی سعید احمد صاحب محدث دارالعلوم دیوبند بھی ہیں) سے بھی میں نے رجوع کیا؛ مگر سب نے یہی کہا کہ ایسی حدیث نظر سے نہیں گزری اور نہ میرے پاس موجود کسی کتاب میں ملی، اس لیے احتیاطاً میں نے اس عنوان کو خارج کر دیا۔

”مردے زندوں کے عمل سے دوطرح منتفع ہوتے ہیں، جن پر اہل سنت کے فقہاومحدثین ومفسرین کا اجماع ہے، ایک یہ کہ میت زندگی میں اس عمل کا سبب بنا ہو، دوسرے مسلمانوں کی اس کے حق میں دعاو استغفاراوراس کے لیے صدقہ وحج سے اس کونفع ہوتا ہے۔ البتہ بدنی عبادات جیسے روزہ اورنماز، تلاوت وذکر کے بارے میں علمانے اختلاف کیا ہے، امام احمد رحمۃ اللہ اور جمہور سلف کا مذہب یہ ہے کہ ان کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے بعض اصحاب کا بھی یہی قول ہے۔ (۱)

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو نفع ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو نفع ہوگا۔ (۲)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اوراس نے حج نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تو اس کی طرف سے حج کر۔ (۳)

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا کہ میری ماں کی طرف سے میں کیا حج کرسکتی ہوں اور ایک روایت میں یوں ہے کہ میری ماں نے نذر مانی تھی کہ وہ حج کرے گی؛ مگر وہ مرگئی تو کیا میں اس کی طرف سے حج ادا کرسکتی ہوں؟ اس پر

---

(۱) کتاب الروح :۱۱۷

(۲) بخاری:۱۲۹۹، مسلم:۱۶۷۲، نسائی:۳۶۴۷، ابو داؤد:۲۴۹۵، احمد:۲۳۱۱۷، ابن ماجه:۲۷۰۸، مالک:۱۲۵۵

(۳) نسائی:۲۵۹۱

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں کرسکتی ہو۔(۱)

بہ ہر حال صدقہ، حج، عمرہ، ذکر وتلاوت وغیرہ کے ذریعہ میت کوثواب پہنچانے کی کوشش کرنا چاہئے؛ مگراس کے لیے کسی رسم کی پابندی نہ کرنا چاہئے۔جس سے جتنا ہوسکے نیکی کرکے ثواب پہنچائے، نہ دن ومہینہ کی تخصیص کرے اور نہ کسی خاص انداز وکیفیت کی تعیین کرے، اور ثواب پہنچانے کے لیے بھی صرف نیت کرلینا کافی ہے کہ اے اللہ اس کا ثواب فلاں کوپہنچا۔(۲)

لہٰذا ثواب پہنچانے کے لیے نہ کسی مؤذن وامام کو بلانے کی ضرورت اور نہ شیرینی وغیرہ کوسامنے رکھنے کی ضرورت، بس دل سے نیت کرلینا کہ فلاں کواس کا ثواب پہنچ جائے، یہ کافی ہے۔

نوٹ: اس مسئلہ کی مفصل بحث وتحقیق علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے "کتاب الروح" میں کی ہے۔

دعاواستغفار

میت کے لیے جس طرح ایصال ثواب ہوسکتا ہے اسی طرح باتفاق علما اس کے لیے اللہ سے دعا کی جاسکتی ہے اوراس کے گناہوں کوبخشنے کی درخواست بھی کی جاسکتی ہے۔شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "ائمہ اسلام اس پر متفق ہیں کہ میت، دعاءاوراس کی طرف سے کئے گئے نیک عمل سے منتفع ہوتی ہے اور یہ بات ان باتوں میں سے ہے جو دین اسلام سے ضروری طور پر معلوم ہیں، جواس کے خلاف ہے وہ اہل

(۱) بخاری:۱۷۲۰، نسائی:۲۵۸۶، احمد:۲۰۳۳

(۲) روح المعانی:۲۷/۶۷، کتاب الروح:ص:۱۴۱

بدعت میں سے ہوگا۔ [1]

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دفن میت سے فارغ ہوتے تو فرماتے کہ اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور ثابت قدمی کی دعا کرو۔ (اس حدیث کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ میت کے حق میں دعا کرنے سے اس کو فائدہ ہوتا ہے۔ دعا کیا کرنی چاہئے؟ اس میں کوئی قید نہیں، میت کے لیے جو بھی مفید ہو اس کی دعا کی جائے، جیسے حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ دعا کی کہ اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت کر، ان کے درجات کو بلند کر ان کی قبر کو کشادہ فرما اور ان کے لیے قبر میں روشنی فرما۔ (۲)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے میت کے حق میں جو بھی بہتر خیال کرے وہ دعا کرے، اس سے میت کو فائدہ ہوگا اور یہی دراصل میت کے لیے عظیم تحفہ ہے جو کوئی انسان اس کے لیے بھیج سکتا ہے۔

میراث کی تقسیم

میت کی تدفین کے بعد ایک نہایت اہم کام تقسیم میراث ہے، یعنی اگر میت نے مال چھوڑا ہو تو اس کو اس کے وارثوں میں شرعی قانون اور حساب کے مطابق بانٹنا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مال چھوڑ کر مرا تو وہ مال اس کے وارثوں کا ہے۔ (۳)

نیز احادیث میں ہے کہ بعض حضرات کے انتقال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ: ۳۰۶/۲۴

(۲) مسلم: ۱۵۲۸، ابو داؤد: ۲۷۱۱، احمد: ۲۵۳۳۲

(۳) بخاری: ۲۱۳۳، مسلم: ۳۰۴۰، ابو داؤد: ۲۵۱۲، ابن ماجہ: ۲۷۲۸، احمد: ۱۶۵۴۷

نے ان کے وارثین کو تلاش کر کے، ان تک ان کی میراث کا حصہ پہنچانے کا حکم دیا۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ میرے پاس قبیلۂ ازد کے ایک آدمی کی میراث ہے؛ مگر میں اس قبیلہ کا کوئی آدمی نہیں پاتا ہوں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ ایک سال تک اس کی تلاش کر، وہ صاحب ایک سال بعد آئے اور عرض کیا کہ (ایک سال کی تلاش کے باوجود) میں نے کوئی آدمی قبیلہ ازد کا نہیں پایا، آپ نے فرمایا کہ قبیلہ خزاعہ کے کسی عمر دراز شخص کو دے دو۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ میراث کے مستحق، میت کے وارث ہیں، اس لیے اس کو ان میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے کہ اللہ کی کتاب میں جو وارثین کے حصے مقرر ہیں، ان کو ان کے حق داروں تک پہنچا دو، اور جو بچ جائے وہ میت سے رشتہ میں سب سے قریب مرد کا حصہ ہے۔(۲)

آج کل اس سلسلہ میں بھی بہت ہی کوتاہی اور غفلت سے کام لیا جاتا ہے اور اچھے اچھے بہ ظاہر نیک و دین دار قسم کے لوگ بھی، اس سلسلہ میں نہ صرف یہ کہ اس سے غافل ہیں؛ بل کہ عجیب قسم کی چالاکیوں سے دوسروں کی میراث دبا لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس بارے میں اسلام میں سخت تنبیہات وتشدیدات و وعیدات آئی ہیں۔

ایک موقعہ پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی کی ایک

---

(۱) ابو داؤد: کتاب الفرائض: ۲۵۱۶، احمد: ۲۱۸۶۶

(۲) بخاری: ۶۲۴۰، مسلم: ۳۰۲۸، ابو داؤد: ۲۵۱۱، ابن ماجہ: ۲۷۳۰، احمد: ۲۷۱۵، ترمذی: ۲۰۲۴

بالشت زمین، بغیر حق کے دبالی، اس کو قیامت کے دن اللہ تعالی سات زمینوں کا طوق (بہ طور سزا) پہنائے گا۔(۱)

اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالی ایسے شخص کو اس زمین کی وجہ سے زمین میں دھنسا دے گا۔(۲)

غرض یہ کہ میراث کا اس کے حق داروں کو شرعی قانون وحساب کے مطابق پہنچانا ضروری اور اس میں کوتاہی کرنا باعثِ عذاب ہے۔

اس سلسلہ میں عام طور پر جن کوتاہیوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے، وہ یہاں عرض کرتا ہوں:

بہت سے گھرانوں میں سرے سے میراث تقسیم کرنے کا رواج ہی نہیں ہے، اس پر اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

بعض لوگ جو اس بارے میں کچھ حساس ہیں ان کی بے حسی کا یہ حال ہے کہ میراث اصول اور حسابِ شرعی کے مطابق تقسیم نہیں کرتے؛ بل کہ بے قاعدہ جس کو جتنا چاہا دے دیتے ہیں اور اس میں بسا اوقات آپس میں نزاع وفساد بھی پیدا ہو جاتا ہے اور رشتہ داری، رسّہ کشی کا ایک مظاہرہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس لیے میراث کی تقسیم شرعی حساب کے مطابق کرنا چاہئے؛ تاکہ وارثین کو ان کا حصہ پورے طور پر ملے۔ اسی لیے حدیث میں اس کے مسائل کو سیکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« تعلموا القرآن و الفرائض و علموا الناس فانی

---

(۱) بخاری: ۲۲۷۳، مسلم: ۳۰۲۵، احمد: ۲۴۹۴۷

(۲) بخاری: ۲۲۷۴، احمد: ۵۴۸۱

مقبوض» (۱)

(قرآن اور میراث کے احکام ومسائل سیکھ لو کہ میں وصال کر جانے والا ہوں)

اور اسی حدیث میں امام دارمی اور امام بیہقی نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا ہوگا کہ دو آدمی میراث کے بارے میں جھگڑیں گے؛ مگر ان کو (صحیح وشرعی) فیصلہ کرنے والا کوئی نہ مل سکے گا۔ (۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« تعلموا الفرائض وعلموه الناس فانه نصف العلم وهو ينسىٰ. » (۳)

(فرائض یعنی میراث کے احکام سیکھو، کہ وہ آدھا علم ہے اور وہ بھلا دیا جائے گا۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''میراث کے احکام سیکھو، کہ وہ تمہارے دین میں سے ہیں''۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''جو قرآن سیکھے اس کو چاہئے کہ وہ فرائض بھی سیکھے''۔ (۴)

غرض یہ کہ شرعی قواعد کے مطابق میراث کی تقسیم ہونا ضروری ہے، اور عوام الناس کو اس سلسلہ میں علمائے ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

بعض لوگ میراث کو صرف لڑکوں کا حق سمجھتے ہیں اور لڑکیوں کو اس میں سے نہیں

(۱) ترمذی: ۲۰۱۷

(۲) دارمی: ۲۲۳، بیہقی: ۲۴۰/۹

(۳) بیہقی: ۲۴۱/۹

(۴) سنن سعید بن منصور قسم اول: ۲/۳/۲، بیہقی: ۲۴۱/۹

دیتے؛ حالاں کہ شریعت نے جس طرح میراث میں بیٹوں کا حق بتایا ہے اسی طرح بیٹیوں کا حق وحصہ بھی بتایا ہے اور معلوم ہونا چاہئے کہ لڑکیوں کو حصہ نہ دینا جاہلیت کی ایک باطل رسم ہے، جس کی اصلاح کے لیے اللہ نے اسلام کو دنیا میں بھیجا۔ اس لیے اہلِ اسلام کو اس پر سختی سے عمل پیرا ہونا چاہئے۔

بعض لوگ تمام وارثین میں میراث تقسیم نہیں کرتے؛ بل کہ جن سے تعلقات اور معاملات اچھے ہوتے ہیں، ان کو دیتے ہیں اور جن سے تعلقات اچھے نہیں ہوتے ان کو محروم کردیتے ہیں۔ یہ بالکل حرام اور ناجائز ہے، کیوں کہ اس سلسلہ میں کسی کو اللہ نے یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار نہیں دیا ہے، کہ جس کو چاہے دے دے اور جس کو نہ چاہے نہ دے؛ بل کہ اللہ ورسول نے خود ہی سبھی حق داروں کے حصے مقرر کردئے ہیں اور ان میں کمی وبیشی کا بھی، ان کی رضا کے بغیر کسی کو اختیار نہیں دیا گیا۔

بعض گھرانوں میں نافرمان اولاد کو عاق کرنے کی رسم ہے، کہ نافرمان اولاد کو میراث سے محروم کردیتے ہیں؛ مگر یہ بھی شرعاً جائز نہیں؛ بل کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جو بھی حق مقرر کیا ہے وہ دینا چاہئے، خواہ وہ اطاعت شعار ہوں یا نافرمان ہوں۔

بعض لوگ بیوہ عورت کو اگر وہ دوسرا نکاح کرلے تو اس کے پہلے شوہر کی میراث سے محروم کردیتے ہیں۔ یہ بھی سراسر ظلم اور خلافِ شرع بات ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ عورت اگر اپنے شوہر کی وفات کے بعد دوسرا نکاح حسبِ شرائط کرنا چاہے تو اس کو اس کا پورا حق ہے اور اس سے کسی طرح بھی اس کو روکنا جائز نہیں۔ (۱)

---

(۱) قرآن میں طلاق کی عدت کے بعد مطلقہ عورتوں کو ان کی مرضی کی شادی کرنے سے روکنے سے منع کیا گیا ہے۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۳۲) اور یہی حکم بیوہ عورت کا بھی ہے۔

اور وہ ایک جائز کام کرے، تو اس کو اس کے حق سے محروم کرنا کیسے روا ہو سکتا ہے؟ لہذا یہ بدعت بھی ختم کرنا چاہئے۔ بعض لوگ بہنوں سے اپنا حصہ معاف کرا لیتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معاف ہو گیا؛ مگر یہ معافی عام طور پر دل سے نہیں ہوتی؛ بل کہ کبھی تو جبر و اکراہ کی بنا پر ہوتی ہے اور کبھی کسی دھوکہ کی وجہ سے اور کبھی رسماً یا شرما شرمی میں ہوتی ہے اور شرعاً اس قسم کی معافی کا اعتبار نہیں۔ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ بغیر طیبِ نفس (بغیر دلی رضا و خوشی) کے، کافر معاہد کا مال لینا بھی جائز نہیں، تو کسی مسلمان کا مال لینا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔(۱)

قرض کی ادائیگی

میت پر اگر قرض ہو تو اس کے قریبی رشتہ داروں کو چاہئے، کہ اس کے مال سے پہلے اس کا قرض ادا کر دیں پھر میراث تقسیم کریں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا انتقال ہوا، تو ان پر قرض تھا اور انہوں نے کچھ کھجور ترکہ میں چھوڑے تھے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ قرض خواہوں کو قرض ادا کرنا ہے، آپ بھی تشریف لے چلیں، چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور دعا کی اور تمام قرض خواہوں کا قرضہ ادا فرمایا؛ مگر پھر بھی (آپ کی برکت سے) اتنا ہی بچا رہا جتنا کہ دیا گیا۔(۲)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصیت سے پہلے قرض ادا کرنے کا فیصلہ کرتے تھے۔(۳)

---

(۱) مسند احمد: ۱۶۳۰۵

(۲) بخاری: ۲۲۲۰، نسائی: ۳۵۷۶، احمد: ۱۳۸۳۹، ابن ماجہ: ۲۴۲۵

(۳) ترمذی: ۲۰۴۸، ابن ماجہ: ۲۷۰۶، احمد: ۵۶۱

معلوم ہوا کہ سب سے پہلے میت کا قرض اس کے مال سے ادا کرنا چاہئے، یہ اس کے قریبی رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے۔

وصیت پوری کرنا

اگر میت نے کوئی وصیت کی ہو تو، اس کو قرض کی ادیگی کے بعد پورا کرنا چاہئے؛ مگر اس کا لحاظ رکھا جائے کہ مالی وصیت ہو تو ایک تہائی سے زائد مال کی وصیت پوری نہیں کی جائے گی۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو صرف تہائی حصہ کی وصیت کی اجازت دی اور فرمایا کہ تہائی بھی بہت ہے۔(۱)

معلوم ہوا کہ ایک تہائی کی وصیت ہو تو اس کو پورا کیا جائے گا، دوسرے اس بات کا خیال ہونا چاہئے کہ ناجائز کام کی وصیت نہ ہو، اگر میت نے کسی ناجائز کام کی وصیت کی ہو تو اس کو پورا نہیں کیا جائے گا، مثلاً کسی نے وصیت کی کہ میری قبر پر قبہ یا گنبد بنایا جائے یا اور کسی ناجائز بات کی وصیت کیا، تو یہ وصیت باطل ہے۔(۲)

تدفین کے بعد کی غیر شرعی رسومات

تدفین کے بعد کا جو شرعی دستور تھا، وہ پیش کر دیا گیا، اب ایک نظر ان خرافات و رسومات کی طرف بھی کیجئے، جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں؛ مگر اس کے باوجود وہ رسمیں عوام میں عام اور شائع و مقبول ہیں۔ مثلاً:

---

(۱) بخاری:۲۰۴۲، نسائی:۳۵۶۸، احمد:۱۳۶۳، دارمی:۳۰۶۴، طحاوی:۲/۲۵۰، مؤطاامام مالک: ص:۳۱۸

(۲) در مختار مع شامی:۶/۶۶۶و۶/۶۹۰

میت کے گھر کھانا کھانے کا رواج

آج کل ایک عام رواج یہ ہوگیا ہے کہ میت کے گھر والے جنازے میں آنے والوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتے ہیں، یہ بھی غلط اور گناہ کا کام ہے۔ حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”ہم (صحابہ) میت کے گھر جمع ہونے اور کھانا بنانے کو نوحہ شمار کرتے تھے۔ (۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح نوحہ (یعنی چیخ چیخ کر رونا) حرام ہے اسی طرح میت کے گھر جمع ہوکر کھانا کھانے کو حرام سمجھتے تھے، اسی لیے حضرات فقہا نے بھی صاف طور پر اس کو ناجائز و بدعت قرار دیا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اہلِ میت کی طرف سے ضیافت کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ وہ خوشی کے موقعہ پر مشروع ہے نہ کہ غم کے موقعہ پر اور یہ بدعت قبیحہ ہے۔ (۲)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”رہا اہلِ میت کا کھانا تیار کرنا اور لوگوں کو اس کی دعوت دینا پس یہ غیر مشروع ہے اور یہ تو بس بدعت ہے۔ (۳)

اور اس مسئلہ میں جس طرح علما حق (جن میں علماء دیو بند بھی شامل ہیں) کا یہی مسلک ہے اسی طرح بریلوی مکتبِ فکر کا بھی یہی مسلک ہے، چناں چہ بریلوی مکتبِ فکر کے بانی مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی اپنی کتاب ”احکامِ شریعت“ میں لکھتے ہیں:

---

(۱) ابن ماجہ :۱۶۰۱

(۲) شامی :۲/۲۴۰

(۳) فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ : ۲۴/۳۱۶

''یہ دعوت خود ناجائز و بدعتِ شنیعہ وقبیحہ ہے، امام احمد اپنے مسند اور ابن ماجہ سنن میں بہ سند صحیح حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی ﷺ سے راوی ہیں'' کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصُنعة الطعام من النیاحة ''(ہم گروہ صحابہ اہلِ میت کے یہاں جمع ہونے، ان کے کھانے تیار کرانے کو مردہ کی نیاحت شمار کرتے تھے) جس کی حرمت پر متواتر حدیثیں ناطق ہیں۔(۱)

اس کے علاوہ اس میں اور بھی مفاسد وخرابیاں ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ کھانا میت کے ترکہ سے تیار کیا جاتا ہے اور تمام وارثین کی بہ طیبِ خاطر اجازت کے بغیر اس مال کا استعمال ناجائز ہے، اور کبھی وارثین میں کوئی نابالغ بھی ہوتا ہے، جس کی اجازت بھی شرعاً معتبر نہیں، تو یہ کھانا ناجائز ہوا اور اس کا کھانا معصیت ہوا؛ مگر افسوس کہ آج اس کی پرواہ نہیں کی جاتی اور نہ صرف میت کے گھر والے؛ بل کہ وہاں جا کر کھانے والے بھی بلا کسی تردد کے کھا لیتے ہیں۔

میت کی برائی بیان کرنا

کسی مسلمان کی غیبت اور اس کا شکوہ شکایت اسلام میں ممنوع اور ناجائز ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان اس سے بے خبر ہوگا؛ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس ممنوع وحرام کام میں اشتغال کو ایک محبوب مشغلہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور جن لوگوں کو اس کی عادت پڑ جاتی ہے وہ زندوں سے لے کر مُردوں تک سبھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں، حالاں کہ اسلام نے اس کی تاکید کی ہے کہ مُردوں کی خوبیاں تو بیان کرو؛ مگر ان کی برائی نہ کرو۔ایک

(۱) احکام شریعت :۳/۲۹۲

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لا تسبوا الاموات فانهم قد افضوا الی ما قدموا » (۱)

(مردوں کو گالی مت دو، کیوں کہ وہ اس جگہ پہنچ گئے جس کے لیے انہوں نے (اچھا یا برا عمل) بھیجا تھا)

اور ایک دوسری حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اذکروا محاسن موتاکم و کفوا عن مساویهم . » (۲)

(اپنے مُردوں کی خوبیاں بیان کرو اور ان کی برائیوں سے (اپنی زبانوں کو) روکے رکھو۔)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مردوں کو نہ گالی دینا جائز ہے اور نہ ان کی غیبت و برائی کرنا جائز ہے؛ بل کہ ان کی تعریف و خوبی بیان کرنا چاہئے، ہاں اس میں مبالغہ سے کام نہ لے کہ یہ بھی بُری بات ہے اور اسلام میں ناپسندیدہ فعل ہے۔

قرآن خوانی اور اس پر اُجرت

میت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن پڑھنا مفید و نفع بخش ہے، جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں؛ لیکن ہمارے علاقوں میں قرآن خوانی اور آیتِ کریمہ پڑھنے کی جو رسم عوام؛ بل کہ بعض خواص میں رائج ہے جس میں لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے، حفاظ وقرا کو جمع کیا جاتا ہے، یہ سراسر بدعت ہے۔

چناں چہ علامہ شامیؒ ''رد المحتار'' میں بزازیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

---

(۱) بخاری: ۱۳۰۶، نسائی: ۱۹۱۰، احمد: ۲۴۲۹۶، دارمی: ۲۳۹۹

(۲) ابو داؤد: ۴۲۵۴، ترمذی: ۹۴۰ مستدرک حاکم ۱/۳۸۵

’’تلاوتِ قرآن کے لیے دعوت کا انتظام کرنا صلحاء اور قاریوں کو ختمِ قرآن یا سورۂ انعام یا سورۂ اخلاص پڑھنے کے لیے جمع کرنا مکروہ ہے۔ پھر ’’معراج‘‘ کے حوالہ سے لکھا کہ یہ تمام کام شہرت وریا کاری کے لیے ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے بچنا چاہئے۔(۱)

معلوم ہوا کہ یہ قرآن خوانی اور آیتِ کریمہ پڑھنے کے لیے جو دعوت دی جاتی ہے یہ ناجائز ومکروہ ہے، پھر بعض جگہ حفاظ وطلبہ کو اُجرت پر تلاوت کے لیے بلایا جاتا ہے؛ حالاں کہ اُجرت پر تلاوت کرنیوالے ہی کو ثواب نہیں ملتا، پھر وہ میت کو ثواب کیسے بخشے گا؟ علامہ شامی رحمۃ اللہ نے اپنے ایک رسالہ میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کے لیے تلاوتِ قرآن پر اُجرت لینا، دینا تمام علما کے نزدیک ناجائز ہے اور اُجرت پر پڑھنے والوں کو کوئی ثواب حاصل نہیں ہوتا؛ بل کہ ان کا ثواب تو وہی مال ہے، جو بہ طورِ اُجرت ان کو مل رہا ہے، علامہ شامی کا یہ رسالہ ان کے رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے۔(۲)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

قرآن مجید پڑھنے اور اس کا ثواب ھدیہ کرنے کے لیے اُجرت پر کسی کو لینا بالاتفاق صحیح نہیں ہے اور جو علما نے اختلاف کیا ہے، وہ تلاوتِ قرآن پر اُجرت لینے کے بارے میں نہیں؛ بل کہ تعلیمِ قرآن، اذان، امامت اور غیر کی طرف سے حج کے بارے میں ہے کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟ (آگے چل کر فرماتے ہیں) امام احمد رحمۃ اللہ کے مذہب میں

---

(۱) شامی: ۲/۲۴۰ تا ۲/۲۴۱

(۲) دیکھو رسائل ابن عابدین الشامی: ۱/۱۵۲ تا ۱۹۸

ایک قول یہ ہے کہ فقیر کے لیے تلاوت پر اُجرت لینا جائز ہے؛ لیکن وہ اللہ کے لیے پڑھے اور ضرورت کے لیے اُجرت لے اور اگر وہ اُجرت کے بغیر پڑھتا ہی نہ ہو، تو اس کو اس تلاوت پر ثواب نہیں ملے گا اور جب خود اس کو ثواب نہیں ملا، تو میت کو بھی کچھ نہ پہنچے گا۔(۱)

غرض یہ کہ اُجرت پر قرآن پڑھا جائے یا ذکر وغیرہ کیا جائے، اس سے ثواب نہیں ملتا، اس لیے یہ قرآن خوانی کی رسم جس سے حفاظ وقرا کو اُجرت دے کر بلایا جاتا ہے، حرام ہے۔ اور بلا اُجرت جو یہ رسم ہوتی ہے یہ بھی بدعت ہے، لہٰذا بلا رسم کی پابندی کے، جو افراد گھر کے یا قرب وجوار کے بلا تکلف جمع ہو جائیں وہ سب مل کر قرآن پڑھ کر، یا ذکر کر کے ثواب میت کو پہنچا دیں، جیسا کہ اوپر تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے۔

کھانے اور مٹھائی پر فاتحہ

بہت سے مقامات پر ایصالِ ثواب کے لیے جو کھانا دیا جاتا ہے اس پر فاتحہ دینے کا ایک مہمل طریقہ رائج ہے، اسی طرح بعض لوگ مٹھائی پر فاتحہ دیتے ہیں۔ یہ طریقہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ صحابہ وتابعین سے اور نہ فقہائے کرام سے ثابت ہے۔

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس سے ہٹ کر کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔ علامہ عبد الحی لکھنوی رحمۃ اللہ نے اسی فاتحہ مروجہ کے متعلق سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ:

”جو طریقہ فاتحہ کا مروج ہے کہ شیرینی وغیرہ سامنے رکھ کر، کھڑے

(۱) فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ :۲۴/۳۱۵ تا ۳۱۶

ہوکر فاتحہ دیتے ہیں اس کی اصل شرع میں نہیں ہے۔(۱)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''یہ طریق ایصالِ ثواب کا زمانۂ شفیع المذنبین رحمۃ العالمین وصحابہ و تابعین و تبعِ تابعین و ائمہ مجتہدین میں نہ تھا اور نہ اب تک خاص شرفائے عرب کا دستور ہے، بناءً علیہ میرے نزدیک طریقہ مروجہ مشروع نہیں''۔(۲)

معلوم ہوا کہ فاتحہ کا یہ مروجہ طریقہ بدعت ہے، پھر اس میں بعض امور خلافِ عقل بھی کیے جاتے ہیں، مثلاً فاتحہ دینے والا فاتحہ دے کر مردوں کو ثواب پہنچاتا ہے، جب کہ وہ کھانا جو ایصالِ ثواب کے لیے پکایا ہے، ابھی غریبوں کو دیا ہی نہیں گیا ہے، جب غریبوں کو دیا ہی نہیں تو ثواب کہاں ملا؟ پھر وہ جو پہنچایا جارہا ہے وہ کیا ہے؟

نیز بعض جگہ خصوصاً دیہاتوں میں فاتحہ کے لیے ملاّ، شیخ، پیر، مؤذن وغیرہ کی تلاش ہوتی ہے اور ان کو اُجرت دے کر ان سے فاتحہ پڑھواتے ہیں اور یہ ناخداترس لوگ عجیب چالاکیاں کرتے ہیں، کہ دس روپئے کی فاتحہ، بیس کی، تیس کی، سو کی دو سو کی فاتحہ گھڑ رکھی ہے اور جاہلوں کو دھوکہ دیتے ہیں، افسوس کہ سیدھے سادھے مذہبِ اسلام کو ان من مانی بدعات ورسومات نے کس قدر مشکل بنادیا؛ بل کہ اس کے حلیہ کو کس قدر بگاڑ دیا ہے۔ **اللھم احفظنا من ھذہ الخرافات۔**

غرض یہ سب بے کار ولایعنی وفضول اعمال ہیں، جن سے بچنا ضروری ہے اور سنت پر عمل کی فکر لازم ہے اسی سے خود کو اور میت کو دونوں کو نفع ہوگا۔

---

(۱) مجموعہ فتاوی عبدالحی رحمۃ اللہ: ۱/ ۸۵

(۲) مجموعہ فتاوی عبدالحی رحمۃ اللہ: ۱/ ۳۵۷

قبر پر قرآن پڑھوانے کی رسم

اکثر لوگوں میں رواج ہے کہ تدفین کے بعد چالیس دن تک قبر پر کسی حافظ یا قاری سے قرآن پڑھواتے ہیں اور بعض لوگ ان کو اُجرت پر مقرر کرتے ہیں، اُجرت پر تلاوتِ قرآن کا مسئلہ اوپر گزرا ہے کہ یہ حرام ہے اور اس سے ثواب ہی نہیں ملتا اور خود چالیس دن تک قبر پر قرآن پڑھوانے کی رسم صحیح نہیں ہے، سلفِ صالحین سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں کہ:

”قبروں پر قراٴت کرنا امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اور امام احمد رحمۃ اللہ کی ایک روایت میں مکروہ ہے، کیوں کہ نئی اور من گھڑت بات ہے، جو حدیث میں وارد نہیں“۔(۱)

حضرت شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”قبروں پر پابندی سے قراٴت کرنا سلف کے نزدیک معروف نہیں تھا اور خود قبر پر قراٴت کرنے کے بارے میں علما نے اختلاف کیا ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ نے اکثر روایات میں مکروہ قرار دیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ نے دوسرے قول میں اجازت دی ہے اور تیسرے میں تفصیل کی ہے کہ دفن کے وقت قراٴت جائز ہے اور دفن کے بعد معمولاً قراٴت یہ بلاشبہ بدعت ہے، جس کی کوئی اصل نہیں معلوم۔(۲)

---

(۱) شرح فقہ اکبر: ص۱۶۰

(۲) فتاوی ابن تیمیہ رحمۃ اللہ: ۲۴/ ۳۱۷

خلاصہ یہ ہے کہ کبھی کبھی قبر پر جا کر تلاوت کرنے کے متعلق علما میں اختلاف ہے اور درمختار میں جواز اسی پر محمول ہے اور اگر مستقل مقرر کر کے پڑھوایا یا پڑھا جائے تو یہ بالاتفاق بدعت ہے۔

سوم، دسواں، بیسواں، چہلم و برسی کی رسمیں

تدفین کے بعد بڑے پیمانے پر اور اعلی معیار پر کی جانے والی رسموں میں سوم، دسواں، بیسواں، چہلم، و برسی کی رسمیں عوام الناس میں بڑی معروف ومقبول ہیں۔ مگر کیا ان کا شریعت میں بھی کوئی اعتبار ہے؟ اور کیا ان کی کوئی سند و دلیل بھی ہے؟ اس کا جواب صرف اور صرف یہی ہے کہ یہ ساری رسومات بے اصل و بے دلیل ہیں اور اسی وجہ سے حضراتِ علما نے ان کو بدعت قرار دیا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ ''مدارج النبوت'' میں فرماتے ہیں:

''ان حضرات (صحابہ) کی عادت نہ تھی کہ میت کے واسطے جمع ہوں اور قرآن پڑھیں اور ختمات کریں، نہ قبر پر نہ دوسری جگہ۔ اور یہ سب بدعت ہے۔ تیسرے روز مخصوص اجتماع اور دیگر تکلفات کا ارتکاب اور مالوں کا بلا وصیتِ میت اس کے یتیم بچوں کے حق سے خرچ کرنا، بدعت وحرام ہے۔(۱)

علامہ شامی رحمۃ اللہ نے بہ حوالہ ''بزازیہ'' لکھا ہے کہ:

''موت ہونے کے دن اور تیسرے دن اور ہفتہ بعد اور عیدوں کے موقعوں پر کھانا بنانا اور خاص موقعوں پر قبر پر بھیجنا مکروہ ہے۔(۲)

---

(۱) مدارج النبوت:۱/۴۲۱

(۲) شامی:۲/۲۴۰

ملا علی قاری رحمۃ اللہ ''مرقاۃ المفاتیح''میں تحریر فرماتے ہیں :

''ہمارے اصحاب نے یہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد پہلے اور تیسرے دن اوراسی طرح ہفتہ بعد کھانا پکانا مکروہ ہے''۔(۱)

اورحضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ اپنے ''وصیت نامہ'' میں فرماتے ہیں:

''میرے مرنے کے بعد دنیوی رسمیں جیسے دسواں ، بیسواں، چہلم، شش ماہی اور برسی کچھ نہ کریں۔(۲)

یہ سب عبارات حضراتِ فقہاوعلما کی صاف بتارہی ہیں کہ یہ رسومات شریعت میں اضافہ وبدعت اورناجائز ہیں۔

غور کیجیے کہ جن رسومات کوعلمانے بدعت وضلالت قراردیا ہے،آج مسلمانوں میں وہ کس قدرمقبول ورائج ہیں؟ کیا یہ شیطانی دھوکہ اورفریب نہیں ہے کہ ایک ناجائز اور بدعت کے کام کوصواب وکارِثواب سمجھ لیا جائے؟

پھران میں کئی مفاسد وخرابیاں ہیں مثلاً:(۱) عموماً اس قسم کی دعوتیں میت کے مال سے کی جاتی ہیں اورتمام وارثین کی اجازت نہیں لی جاتی اور کبھی وارثین میں نابالغ بھی ہوتے ہیں،جن کی اجازت بھی شرعاً معتبرنہیں،تواس قسم کا کھانا شرعاً حرام ہے۔(۲)اس قسم کی دعوتوں میں عام طور پرصرف مال داروں کویا کم ازکم مال داروں کوبھی بلایا جاتا ہے،اورظاہر ہے کہ غنی لوگوں کوکھلانے سے صدقہ ادانہیں ہوتا، پھر ثواب کیسا؟ جب ثواب نہ ملاتو پھر بخشیں گے کیا؟(۳)نیزبعض لوگ ان رسومات کو

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح :۴۸۲/۵

(۲) وصیت نامہ ملحقہ''مالابدمنہ''ص:۱٦٦

ادا کرنے کے لیے سودی قرض، یا کم از کم قرض لیتے ہیں اور اسلام میں بلا ضرورت قرض لینا بھی پسندیدہ نہیں اور سودی قرض لینا تو حرام ہے۔ یہ سارے مفاسد اور خرابیاں ان بے اصل رسومات کی بہ دولت لازم آتی ہیں جس کی وجہ سے یہ رسمیں اور زیادہ قبیح و منکر ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کو بالکلیہ ترک کرنا چاہئے۔

گھروں میں روحوں کے آنے کا عقیدہ

بعض جاہل لوگوں میں یہ عقیدہ ہے کہ برسی، چہلم، اور دوسرے بعض خاص خاص دنوں، جیسے عیدوں میں میت کی روح اپنے گھر آتی ہے اور اپنی پسندیدہ چیزیں کھاتی ہے اور اسی عقیدہ کی بنا پر بعض جگہ برسی وغیرہ کے موقعہ پر ایک کمرے میں دستر خوان پر میت کی پسندیدہ اشیا رکھی جاتی ہیں، تا کہ وہ اس کو کھا سکے۔ یہ عقیدہ انتہائی لغو و بے اصل اور نا معقول ہے، کیوں کہ میت اگر دوزخی اور عذاب میں گرفتار ہے، تو اس کی روح کا عذاب سے چھوٹ کر آنا کیوں کر ممکن ہے؟ اور اگر وہ جنتی ہے تو دنیا کی فانی و مادی چیزوں کی تلاش میں وہ کیوں آئے گی؟

لطیفہ : ایک جگہ اسی قسم کی تقریب میں ایک مولانا کو مدعو کیا گیا تو وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک دستر خوان پر مختلف کھانوں کے ساتھ بیڑی سگریٹ بھی ہے، مولانا کو حیرت ہوئی کہ یا اللہ! یہ بیڑی سگریٹ دستر خوان پر کیوں؟ بعد میں پتہ چلا کہ یہ زندہ دعوتیوں کے لیے نہیں؛ بل کہ میت کی روح کے لیے ہے۔ لاحول ولا قوۃ ! کس قدر بے ہودہ عقیدہ ہے؟ غرض یہ کہ یہ عقیدہ بے اصل ہے اور جو بعض روایات میں روحوں کے گھر میں آنے کا ذکر آیا ہے، یہ روایات صحیح و ثابت نہیں ہیں۔

حیلۂ اسقاط

بعض جگہ میت کی نمازوں اور روزوں کا شرعی فدیہ ادا کرنے کے بہ جائے، یہ کرتے ہیں کہ میت کا وارث ایک آدمی (مثلاً ملا، مؤذن وغیرہ) کو ایک نماز کے فدیہ کی رقم دے کر پھر اس سے اپنے نام وہ ھبہ کرالیتا ہے پھر وہی رقم دوسری نماز کے فدیہ میں اس آدمی کو دیتا ہے، اس طرح گویا تمام نمازوں کا فدیہ ادا کرتے ہیں۔ یہ بھی غلط رسم ہے اور جو فقہا نے ایسا حیلہ لکھا ہے وہ مخصوص شرائط کے ساتھ ہے، جو یہاں عام طور پر پائی نہیں جاتیں۔ لھٰذا یہ رسم فقہا کے کلام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ اور اس کے موجد دراصل پیٹ پالو قسم کے پیر اور دکان دار مولوی ہیں، اس لیے اس کو بھی ترک کرنا لازم ہے۔

زیارتِ قبور

اسلامی شریعت میں وقتاً فوقتاً قبرستان جانا اور ایصالِ ثواب کرنا اور عبرت حاصل کرنا جائز؛ بل کہ مستحب ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کر دیا تھا (لیکن اب تم کو اجازت ہے کہ) قبروں کی زیارت کرو، اور ایک روایت میں ہے کہ قبروں کی زیارت کرو کہ وہ آخرت کی یاددہانی کرتی ہیں۔ (۱)

لہٰذا عبرت کی خاطر اور آخرت کی فکر پیدا کرنے کی نیت سے کبھی کبھی زیارتِ قبور کے لیے جانا چاہیے، زیارتِ قبور کے موقعہ پر کیا کرنا چاہیے؟ اس کا مختصر دستور العمل یہ ہے:

زیارتِ قبور کے شرعی آداب

(۱) جب قبرستان میں قبروں کے پاس سے گزرے، تو قبر والوں کو سلام کرنا چاہیے اور ان کو دعا بھی دینا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو قبرستان جانے پر پڑھنے کے لیے یہ الفاظ تعلیم فرمائے اور خود بھی جب قبرستان جاتے تو یہی یا اس جیسے الفاظ پڑھتے تھے:

---

(۱) مسلم:۱۶۲۳، ابو داؤد:۲۸۱۶، نسائی:۲۰۰۵، احمد:۲۱۸۸۰، ابن ماجہ:۱۵۵۸، ترمذی:۹۸۴

« اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْ مِنِیْنَ وَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لاَحِقُوْنَ ،اَسْأَلُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ، اَنْتُمْ لَنَا فَرَطٌ وَنَحْنُ لَکُمْ تَبَعٌ » (۱)

(اے اس بستی کے رہنے والے مؤمنو اور مسلمانو! تم پر سلام ہو اور ہم بھی ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب تم سے ملنے والے ہیں، ہم اللہ سے تمہارے اور ہمارے لیے عافیت کا سوال کرتے ہیں، تم ہم سے پہلے جانے والے ہو اور ہم تمہارے پیچھے آنے والے ہیں۔)

(۲) سنت یہ ہے کہ کھڑے ہو کر، ہاتھ اُٹھا کر دعاء و استغفار کرے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے قبرستان بقیع الغرقد میں کھڑے ہو کر، ہاتھ اُٹھا کر تین دفعہ دعا کی۔ (۲)

علامہ نووی رحمۃ اللہ شرحِ مسلم میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے (قبرستان میں) دعا اور اس میں ہاتھ اٹھانے کا مستحب ہونا معلوم ہوا۔ (۳)

لیکن اگر ہاتھ اُٹھانے میں کسی غلط فہمی کا اندیشہ ہو تو ہاتھ نہ اُٹھانا چاہیے، مثلاً کوئی دیکھنے والا جاہل یہ سمجھے کہ قبر والے سے ہاتھ اُٹھا کر مانگ جا رہا ہے، تو یہ بہت ہی بُرا اور باطل عقیدہ ہے۔ لہٰذا ایک تو ہاتھ اُٹھاتے وقت یہ عقیدہ ہو کہ میں اللہ سے اس میت کے حق میں دعا کر رہا ہوں، دوسرے یہ دیکھ لے کہ اس سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو اور کسی کے غلط عقیدہ کو تقویت نہ ملے۔

---

(۱) مسلم: ۱۶۲۱، نسائی: ۲۰۱۳، ابن ماجہ: ۱۵۳۶، احمد: ۲۱۹۰۷، و بلفظ آخر ترمذی: ۹۷۳، و ابو داؤد: ۲۸۱۸

(۲) مسلم: ۱۶۱۹، نسائی: ۲۰۱۰، احمد: ۲۴۶۷۱

(۳) شرح مسلم ۲۱۳/۲۱

(۳) اس کے بعد قرآن میں سے جو یاد ہو پڑھ کر ایصالِ ثواب کرے، بعض روایات میں ہے کہ جو شخص قبروں پر سے گزرا اور [قل ھو اللّٰہ احد] گیارہ دفعہ پڑھ کر اس کا ثواب مُردوں کو پہنچایا، تو اس کو وہاں کے مُردوں کی تعداد کے برابر اجر ملے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو قبرستان میں داخل ہوا، اور سورۂ فاتحہ اور اخلاص اور الھاکم التکاثر پڑھا اور کہا کہ اے اللہ! میں نے تیرا جو کلام پڑھا ہے اس کا ثواب قبر والے مؤمن مردوں اور عورتوں کو میں دیتا ہوں تو یہ قبر والے اللہ کے پاس اس کے حق میں سفارش کریں گے۔(۱)

یہ روایات اگرچہ ضعیف ہیں؛ مگر چونکہ متعدد ہیں اس لیے حسن لغیرہ ہیں، ویسے بھی فضائل کے باب میں حدیثِ ضعیف قابلِ عمل ہوتی ہے۔ احقر نے اس کی تحقیق اپنے عربی مقالہ ''حول الحدیث الضعیف'' میں کی ہے۔

غرض جو بہ سہولت پڑھا جاسکتا ہے، یا جو یاد ہے اس کو پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو پہنچادینا مستحب ہے۔

(۴) جب قبرستان جائے تو قبروں کی درمیانی جگہ میں جوتے پہن کر نہ چلے، حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے دیکھا کہ وہ قبروں کے درمیان جوتے پہن کر چل رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اے دو جوتے والے! تیرا بُرا ہو، اپنی جوتیاں نکال دے۔(۲)

ہاں! جانے آنے کے لیے جو راستہ مستقل طور پر بنا ہو، یا چلنے کے لیے چھوڑا ہوا

---

(۱) بہ حوالہ اعلاء السنن: ۸/ ۲۸۷تا ۸/ ۲۸۸

(۲) ابو داؤد: ۲۸۱۱، نسائی: ۲۰۲۱، ابن ماجہ: ۱۵۵۷، احمد: ۱۹۸۵۶، طحاوی: ۱/ ۲۴۶، بیہقی: ۳۱۷۷

ہوتا ہے،اس پر جوتوں کے ساتھ چلنا جائز و درست ہے۔

(۵) قبر پر بیٹھنا جائز نہیں ،لہٰذا اس سے بھی بچنا چاہئے ،حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اس بات سے کہ قبروں پر بیٹھا جائے۔(۱)

اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ تم میں سے کوئی انگارہ پر بیٹھے اور اس کے کپڑے جل جائیں اور وہ اس کے جسم تک پہنچ جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ قبر پر بیٹھے۔(۲)

(۶) کوئی کام ایسا نہ کیا جائے جس سے میت کو تکلیف پہنچتی ہو جیسے قبر کو روندنا کہ اس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو روندنے سے منع کیا ہے۔(۳)

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں انگارے پر چلوں، یہ اس سے زیادہ اچھا ہے کہ میں جان بوجھ کر کسی قبر کو روندوں۔امام محمد رحمۃ اللہ اس کو روایت کر کے فرماتے ہیں کہ قبروں کو قصداً روندنا مکروہ ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا قول ہے۔(۴)

(۷) اسی طرح قبر کو ٹیک لگانا بھی مکروہ ہے، کیوں کہ اس سے مردے کو تکلیف ہوتی ہے،حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ قبر پر بیٹھے ہیں تو فرمایا کہ قبر سے اُترو،قبر والے کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔(۵)

---

(۱) مسلم: ۱۶۱۰، نسائی :۲۰۰۱، ابو داؤد: ۲۸۰۷، احمد: ۱۳۶۳۳

(۲) ابو داؤد: ۲۸۰۹،نسائی: ۲۰۱۷،ابن ماجه: ۵۵۵،احمد: ۲۰۷۷،طحاوی: ۱/ ۲۴۹، مسلم: ۱۶۱۰،بیهقی: ۳۱۵۷

(۳) ترمذی: ۹۷۲

(۴) کتاب الآثار: ۵۲،وراه ابن ابی شیبة فی المصنف: ۳/ ۲۱۹

(۵) طحاوی: ۱/ ۲۴۸

(۸)اسی طرح قبروں پر پیشاب یا پاخانہ کرنا سخت ناجائز ہے،ایک صحابی حضرت عقبہ بن عامر ﷺ نے تو یہاں تک فرمادیا کہ مجھے کوئی پرواہ نہیں (یعنی میں کوئی فرق ان دو باتوں میں نہیں پاتا) کہ میں قبر پر پیشاب یا پاخانہ کروں یا کسی بازار میں جہاں لوگ مجھے دیکھتے ہوں۔(۱)

مطلب یہ ہے کہ قبرستان میں قضاء حاجت کرنا اور کھلے بازار میں کرنا دونوں برابر ہیں اور ظاہر ہے کہ کھلے بازار میں قضائے حاجت کرنا انتہائی معیوب و مکروہ اور ناجائز ہے، اسی طرح یہ بھی ناجائز ہے(شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اھلِ قبور کو یہ سب باتیں نظر آتی ہیں واللہ اعلم)۔

زیارت قبور اور شرکیات و بدعات

اوپر زیارتِ قبور کا شرعی دستور اور اس کے اسلامی آداب بیان کیے گئے۔اب ذرا اس طرف نظر کیجیے کہ زیارتِ قبور کے نام پر لوگ کیا کیا اور کیسے کیسے لغو و فضول؛ بل کہ شرک و بدعت کے کام اپنائے ہوئے ہیں،خصوصاً اولیاء اللہ کی مزارات پر جو ہوتا ہے وہ تو بالکل ظاہر ہے۔

مزاراتِ اولیاء پر سجدہ کی بدعت

اولیاء اللہ کی مزارات پر بعض لوگ سجدہ کرتے ہیں حالاں کہ سجدہ تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے لئے جائز نہیں ہے؛مگر افسوس کہ یہ لوگ بلا جھجھک و بلا کھٹک اولیاء اللہ کی مزاروں پر سجدہ کرتے ہیں۔اور عجیب بات یہ ہے کہ ایسے لوگ اکثر و بیشتر اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرنے اور نماز پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے؛بل کہ نماز پڑھنے والوں کو گالیاں دیتے اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔قرآن تو جگہ جگہ یہ کہتا

(۱) ابن ابی شیبہ:۳/۲۱۹

ہے کہ ﴿ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ ﴾ اور ﴿ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾

(کہ اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو)

مگر یہ خدا سے غافل ہو کر مخلوق کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی عبادت کو اور عبادت کرنے والوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔

حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مقام حیرہ گیا تو وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے (دل دل میں) کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، میں جب آپ کی خدمت میں حاضر ہو، اتو عرض کیا کہ میں حیرہ شہر گیا تھا اور میں نے وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں اور آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اگر میری قبر کے پاس سے گزرو گے، تو اس کو بھی سجدہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، (قبر کو تو سجدہ نہیں کروں گا، زندگی میں سجدہ کی اجازت چاہتا ہوں) آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرنا، میں اگر کسی کو سجدہ کا حکم دیتا، تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ (۱)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کے لیے سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (۲)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں حضرت معاذ بن جبل، حضرت سراقہ بن مالک، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی، حضرت طلق بن علی، حضرت ام سلمہ، حضرت انس اور حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہم) سے

---

(۱) ابو داؤد: ۱۸۲۸، دارمی: ۱۴۲۷

(۲) ترمذی: ۱۰۷۹

روایات آئی ہیں ۔معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے سوا کسی کے لیے سجدہ جائز نہیں حتی کہ حضرت آقائے دو جہاں، سرورِ کائنات، فخرِ موجودات محمد عربی (فداہ روحی وابی وامی) صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی جائز نہیں ، نہ زندگی میں اور نہ وفات کے بعد قبر پر، جیسا کہ اوپر کی حدیث سے واضح ہے، اب غور کیجیے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سجدہ جائز نہیں تو کسی پیر، ولی، غوث، قطب، یا ابدال کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ لہٰذا یہ صریح حرام اور اس کا ارتکاب معصیت ہے۔بعض لوگ جو اس قسم کی شرکیہ اور بدعیہ باتوں میں ملوث ہوتے ہیں، اپنے ان خرافات کو جواز کے دائرہ میں لانے کے لیے بعض مہمل تاویلات سے کام لیتے ہیں، مثلاً بعض کہا کرتے ہیں کہ ہم عبادت کے طور پر نہیں؛ بل کہ تعظیم کے لیے سجدہ کرتے ہیں ۔مگر یہ تاویل لغو اور بے سود ہے کیوں کہ جو حدیث اوپر عرض کی گئی وہ صاف بتارہی ہے کہ کسی بھی قسم کا سجدہ غیر اللہ کے لیے جائز نہیں، کیوں کہ اس حدیث میں سجدۂ عبودیت کا سوال نہیں ہے؛ بل کہ ان صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سوال کیا تھا وہ سجدۂ تعظیمی ہی کے متعلق تھا۔ کیوں کہ صحابی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہی کی خاطر یہ اجازت چاہ رہے تھے ،نہ کہ نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے لیے ۔ کیوں کہ عبادت تو غیر اللہ کی کبھی اور کسی بھی شریعت میں جائز نہیں تھی اور صحابی تو صحابی آج کا عام مسلمان بھی اس بات کو جانتا ہے، تو پھر کیا صحابی آپ کی عبادت کیلیے اجازت مانگ سکتے ہیں؟ جب نہیں تو بات صاف ہے کہ ان کا سوال سجدۂ تعظیمی کے بارے میں تھا اور اسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ اللہ کے سوا کسی کے لیے بھی سجدہ جائز نہیں جس سے واضح ہے کہ آپ کی مراد اس سے سجدۂ تعظیمی ہی ہے، معلوم ہوا کہ اسلام میں سجدۂ تعظیمی بھی اللہ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں۔

قبروں پر منتیں ماننا اور حاجتیں مانگنا

بہت سے لوگ اولیاء اللہ سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور ان کے نام پر منت مانتے ہیں، یہ بھی حرام اور شرکیہ کام ہے۔ سوائے اللہ کے کوئی کسی کی حاجت و مراد برلانے والا نہیں۔ مشکل کشا و حاجت روا صرف اور صرف اللہ ہے، اس موضوع پر احقر نے اپنی کتاب ''دیوبندیت و بریلویت'' میں کسی قدر تفصیل سے دلائل کے ساتھ کلام کیا ہے۔(۱)

اور نذر و منت چوں کہ ایک عبادت ہے اور عبادت سوائے اللہ کے کسی اور کے لیے نہیں ہوسکتی، لہٰذا وہ بھی غیر اللہ کے لیے ناجائز ہے، پھر اگر اس نذر میں کسی گناہ کی نذر کی جائے، تو اور زیادہ گناہ کی بات ہے، مثلاً کسی نے نذر مانی کہ میرا بچہ صحت یاب ہوگیا تو کالے شاہ کی مزار پر گھوڑا یا صندل چڑھاؤں گا یا ڈھول بجواؤں گا وغیرہ، تو یہ غیر اللہ کی نذر کے ساتھ ساتھ ایک حرام کام کی نذر ہے اور حرام کام کی نذر اللہ کے لیے ماننا بھی جائز نہیں، تو غیر اللہ کے لیے ماننا اور زیادہ گناہ کی بات ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لا نذر في معصية الله »(۲)

(یعنی اللہ کی معصیت میں نذر جائز نہیں)

ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ:

« من نذر ان يطيع الله فليطعه و من نذر ان يعصيه فلا يعصه »

---

(۱) دیوبندیت و بریلویت، دلائل کے آئینہ میں: ۳۱ تا ۴۲

(۲) مسلم: ۳۰۹۹، نسائی: ۳۷۵۲، احمد: ۱۹۰۱۰، ابو داؤد: ۲۸۴۹، ابن ماجہ: ۲۱۱۶، ترمذی: ۱۴۴۴

(یعنی جو شخص اللہ کی اطاعت کی نذر مانے وہ (اپنی نذر کو پورا کر کے) اللہ کی اطاعت کرے اور جو اللہ کی معصیت کی نذر مانے وہ (اپنی نذر کے ذریعہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔)(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ:

«لا وفاء لنذر فی معصیة اللّٰه»

(کہ اللہ کی معصیت کی نذر کو پورا نہیں کیا جائے گا۔)(۲)

اور اگر کوئی اس قسم کی نذر مان لے تو اس کو چاہیے کہ اس کو توڑ دے اور قسم کا کفارہ ادا کر دے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔(۳)

خلاصہ یہ کہ نذر ایک تو غیر اللہ کے لیے نہیں ہو سکتی دوسرے کسی ناجائز کام کی نہیں ہو سکتی، اور یہ قبر پرست لوگ ان دونوں باتوں میں غلطی کرتے ہیں۔ ایک تو اولیاء اللہ کی نذر مانتے ہیں، دوسرے ناجائز کاموں کی نذر مانتے ہیں۔ پھر یہ نذر اس عقیدہ سے مانتے ہیں کہ یہ اولیاء اللہ ہماری مرادیں اور حاجتیں پوری کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ تمام عقیدے اور اعمال اسلام کے خلاف ہیں اور بالکل مشرکین عرب کے اعمال وعقائد کے مطابق ہیں۔ اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''الفوز الکبیر'' میں فرمایا ہے:

''اور تم کو مشرکین کے احوال، اعمال وعقائد کی تصویر میں کچھ توقف ہو تو اس زمانے کے عوام اور جاہلوں کا حال دیکھ لو۔ خصوصاً ان کو جو

(۱) بخاری: ۶۲۰۲، نسائی: ۳۷۴۶، ابو داؤد: ۲۸۶۲، ابن ماجہ: ۲۱۱۷ احمد: ۲۲۹۴۶، مالک: ۹۰۲، دارمی: ۲۲۳۳

(۲) مسلم: ۳۰۹۹، دارمی: ۲۲۳۲، احمد: ۱۹۰۱۷، ابو داؤد: ۲۸۸۳

(۳) نسائی: ۳۷۸۷، ترمذی: ۱۴۴۴، احمد: ۱۹۱۳۴

دارالاسلام (دہلی) کے اطراف میں رہتے ہیں کہ وہ ولایت کو کیا خیال کرتے ہیں اوراس کے بارے میں ان کا کیا تخیل ہے۔وہ قبروں پر اور آثار کو جاتے ہیں،اورمختلف قسم کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔(۱)

بہ ہر حال مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان خرافات وشرکیات سے بچیں اوراپنی حاجات میں اللہ کی طرف رجوع کریں۔ ہاں! ان بزرگوں کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کی جائے تو درست ہے۔اس مسئلہ پر تفصیلی کلام احقر کی کتاب ''دیو بندیت و بریلویت''میں موجود ہے۔

عرس وصندل کی بدعت

عرس وصندل کے نام سے اولیاءاللہ کی مزارات پر جوخرافات ہوتے ہیں وہ تو اس قدرظاہر ہیں کہ جس کے دل میں ذرابھی حق پسندی ودیانت داری کا عنصر ہوگا وہ صاف صاف اس کو غلط اور منکر سمجھے گا۔مگر شیطان نے بہت سے لوگوں کو بہکا رکھا ہے اور وہ ان خرافات کو دین وایمان کا جز اور تمام فرضوں سے بڑھ کرفرض سمجھے ہوئے ہیں،مگر مسلمانو!اللہ کے لیے غور کرو کہ کیا کبھی صحابہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، یا حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا عرس کیا،یا ان کی مزارات پر صندل چڑھایا تھا؟اگرنہیں اوریقیناً نہیں،توبات بالکل واضح اورصاف ہے کہ یہ دین کا کام اورنیکی وثواب کا کام نہیں ہے،ورنہ یہ حضرات ضروراس کواپناتے۔جب نہیں اپنایا تو اسی لیےنہیں اپنایا کہ یہ دین کا کام نہیں ہے؛بل کہ ان موقعوں پر ہونے والے افعال میں سے بہت سے کام خلافِ شرع ہیں۔مثلاً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) الفوز الکبیر: ۵

فرمایا کہ میری قبر کو عید نہ بناؤ۔(۱)

مشہور محدث ملا علی القاری رحمۃ اللہ شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ میری قبر کو عید کی طرح لہو وسرور کا مظہر نہ بنالو، ایک مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ میری قبر کو عید کی طرح سال میں ایک یا دو دن نہ آیا کرو؛ بل کہ بار بار آیا کرو۔اس کے بعد شارح مشکوٰۃ علامہ طیبی رحمۃ اللہ سے نقل کیا ہے کہ:

" نهاهم عن الاجتماع لها اجتماعهم للعيد نزهة و زينة و كانت اليهود والنصارىٰ تفعل ذالک بقبور أنبيائهم فاورثهم الغفلة و القسوة و من عادة عبدة الأوثان أنهم لا يزالون يعظّمون أمواتهم حتىٰ اتخذوها إصناما و إلى هذا أشار بقوله:" اللّهم لا تجعل قبرى وثنا يعبد" فيكون المقصود من النهي ان يتجاوزوا في قبره غاية التجاوز ۔(۲)

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (صحابہ) کو قبر پر عید کی طرح تفریحاً اور زینت کے طور پر جمع ہونے سے منع فرمایا اور یہود ونصاریٰ اپنے انبیا کی قبروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے تھے پس ان میں اس نے غفلت وسخت دلی پیدا کردی اور بتوں کے پجاریوں کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ سے اپنے مرے ہوئے لوگوں کی تعظیم کرتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے ان (اھلِ قبور) کو بت بنالیا، اور اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے" اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دے

---

(۱) احمد:۸۸۰۴، ابو داؤد:۲۰۴۲، مشکوٰۃ :۸۶، مجمع الزوائد :۲/ ۲۴۷

(۲) مرقاۃ المفاتیح:۲/۳۴۲

جس کی عبادت کی جائے'' لہٰذا اس حدیث کا مقصود یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے بارے میں حد سے آگے بڑھنے سے منع کیا جائے)

حدیث کی ان تشریحات کے مطابق غور کیجیے کی عرس کی ان کے رو سے کیا حیثیت قرار پاتی ہے؟ عرس میں لوگ زیب وزینت کے ساتھ تفریحاً اور لہو ولعب اور کھیل تماشے کی طرح جمع ہوتے ہیں۔ اور اس کے لئے مخصوص تاریخیں مقرر ہوتی ہیں، نیز اس میں گانا بجانا، قوالی وناچ سب کچھ ہوتا ہے جو اسلام میں ناجائز اور حرام ہے، تو بھلا اس کی اجازت اسلامی نقطۂ نظر سے کیوں کر ہوسکتی ہے؟ اور جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قبر کے سلسلہ میں یہ فرمادیا ہے تو کسی اور کی قبر پر عرس اور صندل کی اجازت کا کیا سوال پیدا ہوسکتا ہے؟

پھر عرس کے لئے آنے والے دور دور سے سفر کرکے آتے ہیں حالاں کہ بہت سے علما کے نزدیک قبروں کی زیارت کے لئے سفر ناجائز ہے۔ وہ حضرات اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لا تشدوا الرحال الا الی ثلاثة مساجد ، مسجدی هذا، و مسجد الحرام ، و المسجد الاقصیٰ . » (۱)

(تین مساجد کے علاوہ کسی اور طرف کجاوہ نہ باندھنا یعنی سفر نہ کرنا، ایک میری مسجد (مسجدِ نبوی) دوسرے مسجدِ حرام (کعبۃ اللہ) اور تیسرے بیت المقدس)

اگر چہ اس استدلال میں جمہور علما نے کلام کیا ہے؛ لیکن اگر اس سفر سے معصیت

(۱) بخاری: ۱۱۱۵، مسلم: ۲۳۸۳، احمد: ۷۵۵۷، ترمذی: ۳۰۰، ابوداؤد: ۱۷۳۸

کا ارتکاب لازم آتا ہے تو پھر وہ سفر جائز نہیں۔

چناں چہ حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''قبورِ بزرگان کی زیارت کو سفر کر کے جانا مختلف فیہ ہے، بعض علما درست کہتے ہیں اور بعض منع کرتے ہیں؛ مگر ہاں عرس کے دن زیارت کو جانا حرام ہے۔(۱)

ان تفصیلات سے واضح ہوا کہ عرس وصندل کے نام پر لوگوں کا، اولیاء اللہ کی مزاروں پر جمع ہونا، پھر وہاں مختلف ومتعدد گناہوں کا ارتکاب سخت معصیت ہے اور اس کا اسلامی مزاج سے اور نبوی طریقہ سے کوئی بھی جوڑ نہیں اور جو مجاور اور پیر لوگ ان سلسلوں کے بانی مبانی ہیں، ان کا ان سب چیزوں سے مقصود صرف مال بٹورنا ہوتا ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہئے۔

مزاراتِ اولیا پر عورتیں

اولیاء اللہ کی اور بعض جگہ عام قبروں پر بھی عورتیں زیارت کے لئے جاتی ہیں اور خصوصاً عرس وصندل وغیرہ کی رسموں میں ان کا وجود گویا لازم وضروری ہے، حالاں کہ بہت سے علمانے عورتوں کے لئے قبروں پر حاضری وزیارت کو حرام وناجائز و باعثِ لعنت قرار دیا ہے اور ان حضرات نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔(۲)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے (زیارتِ قبور سے) عورتوں کو اس

---

(۱) فتاویٰ رشیدیہ مکمل :ص۵۵۵

(۲) ابوداؤد : ۲۸۱۷، ترمذی: ۲۹۴، نسائی : ۲۰۱۶، ابن ماجه: ۱۵۶۴، احمد: ۱۹۲۶،مستدرکِ حاکم:ابن ابی شیبه ؛۳/۲۲۵

لئے منع کیا کہ ہم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں سے زیادہ گم راہ کسی کو نہیں پایا۔(۱)

اس سلسلہ میں حنابلہ وشافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ عورتیں جوان ہوں یا بوڑھی، زیارتِ قبور کے لئے ان کا جانا مکروہ ہے اگر چہ کسی فتنہ کا خوف نہ ہو، اور اگر فتنہ کا خوف ہو، تو ان کا جانا حرام ہے، اور حضرات حنفیہ و مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ بوڑھی عورتیں اگر شرعی پابندیوں کے ساتھ جائیں تو درست ہے؛ لیکن جوان عورتوں کا جانا، چوں کہ مفاسد پیدا کرتا ہے، اس لئے حرام ہے۔(۲)

معلوم ہوا کہ اکثر علما تو عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کو جائز نہیں کہتے اور جو جائز کہتے ہیں وہ بھی صرف بوڑھی عورتوں کے لئے جائز کہتے ہیں جب کہ وہ حدودِ شرعیہ و احکام شرعیہ کے خلاف نہ کرے۔(واللہ اعلم)

دعا واختتام

آخر میں تمام اہل اسلام سے گذارش ہے کہ مندرجہ اسلامی احکام کے مطابق موتی کے سلسلہ میں کارروائی کی جائے کہ یہی دراصل مسلمانی کی شان اور اللہ ورسول سے سچی محبت وعشق کی علامت ہے۔ الحمد للہ ہم نے اس رسالہ میں تمام مسائل کو احادیث اور مستند علماء وفقہاء کے حوالوں سے مزین کر دیا ہے۔ جو انصاف اور حق کا متلاشی ہے وہ ضرور اس سے روشنی حاصل کرے گا ہاں جو گمراہی ہی کو اپنا مقدر بنالیا ہو اس کے لئے ہزار دلائل بھی ناکافی ہیں جیسے جاہل پیر جو اولیاء اللہ کی محبت کے نام پر لوگوں کو شرک و بدعت میں مبتلا کرتے ہیں۔ اللہ تعالی مسلمانوں کو ان سے محفوظ

---

(۱) ابن ابی شیبہ:۳/۲۲۶

(۲) الفقہ علی المذاهب الاربعة:۱/۵۴۰،شامی:۲/۲۴۲

رکھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو شرفِ قبول عطاء فرمائے اور اس کو لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت بنائے۔

میری وصیت

میں اپنے رشتہ دار و احباب اور شاگردوں اور متعلقین کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے مرنے پر تمام رسومات شرعی احکام کے مطابق ادا کئے جائیں اور کسی قسم کی بدعت اور غیر شرعی کام نہ کیا جائے۔ اور ان معاملات میں علمائے صالحین کی سرپرستی حاصل کی جائے۔ نیز میرے لئے ایصال ثواب کا اہتمام کریں اور دعاؤں میں فراموش نہ کریں کہ یہی آپ کا میرے لئے عظیم تحفہ ہوگا۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور)

قیامت کی نشانی — حدیث کی زبانی

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

و خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : قیامت کی نشانی — حدیث کی زبانی

مصنف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۶۵

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۷ھ مطابق اپریل ۲۰۱۶ء

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9634307336 \ 9036701512

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

الفہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التقریظ

حضرت مولانا سید مسعود احمد ہاشمی زید مجدہم

(مہتمم مدرسہ احیاء العلوم، شیموگہ)

اہل جنوب کے درمیان ایک معروف ومتعارف شخصیت کا نام ''حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ خان مفتاحی'' ہے۔ موصوف اپنے پہلو میں ایک ایسا حساس دل رکھتے ہیں، جو اصلاح امت فکر کے ساتھ دھڑکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو سوز دروں کی نعمت سے بہرہ ور کیا ہے۔ اسی کا ثمرہ ہے کہ اب تک حالات کے تقاضے اور معاشرے کی ضرورت کے پیش نظر مختلف موضوعات پر، دو درجن سے زائد رسائل اور کتابیں ممدوح کے گوہر بار اور حقائق نگار قلم سے نکل کر ہر گھر اور گھر کے ہر فرد کے لیے ناگزیر ضرورت بن چکی ہیں۔

اسی علمی اور اصلاحی سلسلے کی ایک کڑی کتاب '''قیامت کی نشانی۔ حدیث کی زبانی'' بھی ہے۔ جس میں علامات قیامت پر مشتمل ''ترمذی شریف'' کی ایک مشہور حدیث کو جدید جاہلیت کے پیدا کردہ حالات پر بڑے درد وسوز کے ساتھ تشریح کرتے ہوئے منطبق کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ کتاب ہر قاری کے لیے، مفید ومؤثر ثابت ہوگی اور اس ''سود وسوا مکر فن'' کی دنیا سے دامن بچانے کا ذریعہ اور ساتھ ہی مؤلف کے علم میں برکت اور اجر اخروی میں زیادہ کا باعث بنے گی۔

سید مسعود ہاشمی

مدرسہ احیاء العلوم، شیموگہ

۲۹-۳-۱۴۱۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش نامہ

حدیث پاک کی مشہور و معروف کتاب ''مشکاۃ شریف'' کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس میں ''ترمذی'' کی ایک عبرت ناک حدیث نظروں سے گذری اور دل میں رچ وبس گئی اور جب بھی اس کی طرف قلب نے توجہ کی، ہر بار مزید تاثیر و تأثر کا مشاہدہ ہوا۔ محولہ بالا حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے قریب کثرت کے ساتھ رائج ہو جانے والے گناہوں کا ذکر فرما کر یہ پیش گوئی فرمائی ہے، کہ جب ان گناہوں کا عام رواج ہو جائے گا، تو خدا کی طرف سے زلزلہ، صورتوں کا مسخ ہو جانا، زمین میں دھنسا دیا جانا وغیرہ وغیرہ سخت ترین عذابات پے در پے آئیں گے۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے، جب کہ آج سے پانچ سال قبل ۱۴۰۴ھ میں راقم الحروف آمبور (نارتھ آرکاٹ) کی ایک دینی درسگاہ ''مدرسہ رفیق العلوم'' میں تدریسی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اس دورے سے برابر یہ حدیث پیش نظر رہی اور قلب وجگر کو متأثر کرتی رہی۔ اسی تأثر نے یہ بات دل میں ڈالی کہ اس حدیث کو عام طور پر شائع ہونا چاہیے۔ کیوں کہ:

(۱) آج ایک طرف ہم معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں، تو وہ تمام گناہ جن کی فہرست اس حدیث میں پیش کی گئی ہے، یہاں رائج نظر آتے ہیں اور یہ رواج روز افزوں اور رو بہ ترقی ہے۔

(۲) پھر دوسری طرف اس حدیث میں جن عذابات کی دھمکی دی گئی ہے، ان میں سے بعض عذابات بھی دیکھنے اور سننے میں آرہے ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ نبوی تہدیدات وتنبیہات کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی خیال سے حدیث مذکورہ شائع کرنے کا اب سے بہت پہلے ارادہ کرلیا تھا اور اس حدیث پر ایک مختصر شرح بھی لکھنی شروع کردی تھی۔ مگر کچھ حصہ لکھنے کے بعد یہ سلسلہ التوا میں پڑ گیا اور تقریباً چار سال گزر گئے۔ پھر ایک دن شرح حدیث کا وہ حصہ جو لکھا گیا تھا، بوسیدہ کاغذات سے برآمد ہوا، تو پھر اس کام کا داعیہ پیدا ہوا اور بحمد للہ اسی زمانے میں اس حدیث پر شرح کا کام مکمل کردیا۔

مگر طباعت کا مرحلہ پھر بھی التوا ہی میں رہا؛ تا آں کہ ۱۴۱۰ھ میں جناب محمد کفایت اللہ خان صاحب اور ان کے بھائیوں کی طرف سے ان کے تایا جناب محمد قاسم خان صاحب نے یہ پیش کش کی کہ کوئی دینی رسالہ اگر لکھ کر دیا جائے، تو وہ اپنے والدین کے ایصال ثواب کے لیے طبع کروا کر مفت تقسیم کریں گے۔

میں نے ان کے سامنے یہی پیش کش کردیا، چناں چہ ۱۴۱۰ھ میں پہلی بار ان حضرات کے توسط سے یہ رسالۂ نافعہ طبع ہوا اور اب دوسری بار ''ادارہ تبلیغ وتجدید سنت'' کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ ناشرین کے والدین اور خود ناشرین اور احقر کے لیے بھی اپنی دعوات صالحہ میں کچھ حصہ رکھیں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

احاطہ مدرسہ مسیح العلوم، بیدواڑی، بنگلور۔۱

۱۴۱۸ھ ربیع الاول

الحديث الشريف

«عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم : اِذَا اتُّخِذَ الفَيْءُ دُوِلاً، وَالْأَمَانَةُ مَغْنَماً، وَالزَّكوٰةُ مَغْرَماً، وَتُعَلِّمَ لِغَيْرِالدِّيْنِ، وَ اَطَاعَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ، وَعَقَّ أُمَّهُ، وَاَدْنیٰ صَدِيْقَهُ، وَأَقْصیٰ أَبَاهُ، وَظَهَرَتِ الْأَصْوَاتُ فِي الْمَسَاجِدِ، وَسَادَ الْقَبِيْلَةَ فَاسِقُهُمْ، وَكَانَ زَعِيْمُ الْقَوْمِ اَرْذَلُهُمْ، وَاُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ، وَظَهَرَتِ الْقِيْنَانُ، وَالْمَعَازِفُ، وَ شُرِبَتِ الْخُمُوْرُ وَلَعَنَ آخِرُهٰذِهِ الْأُمَّةِ اَوَّلَهَا فَلْيَرْتَقِبُوْا عِنْدَذٰلِکَ رِيْحاً حَمْرَاءَ وَزَلْزَلَةً، وَخَسْفاً، وَمَسْخاً، وَقَذْفاً، وَاٰيَاتٍ تُتَابِعُ كَنِظَامٍ قُطِعَ سِلْكُهُ فَتُتَابِعُ .»(١)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جب مالِ غنیمت کوشخصی دولت بنالیا جائے اورامانت کو مالِ غنیمت سمجھ لیا جائے اورزکاۃ کو تاوان خیال کرلیا جائے اورعلم دنیا کی خاطر حاصل کیا جائے اورآدمی اپنی بیوی کی اطاعت اورماں کی نافرمانی کرے اوردوست کوقریب اورباپ کودورکرے اورمسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں اورقبیلے کا سرداراُن میں سے فاسق کو بنالیا جائے اورقوم کا سربراہ ان کارذیل آدمی ہوجائے اورآدمی کا اکرام اس کے شرسے ڈرکرکیا جائے اورگانے والیاں اورآلاتِ لہوعام ہوجائیں اور(مختلف قسم کی) شرابیں پی جانے لگیں اوراس امت کا آخری حصہ، پہلے حصۂ امت کو

(١) رواه الترمذي باب بعد أشراط السّاعة: ٢/٤٤

لعنت کرے، تو اس وقت تم سرخ آندھی، زلزلے، زمین میں دھنسنے، چہروں کے مسخ ہونے، آسمان سے پتھر برسنے اور دوسری (قیامت کی) نشانیوں کا انتظار کرو، جو پے در پے اس طرح آئیں گی، جیسے موتیاں جس کی لڑی ٹوٹ گئی ہو اور وہ یکے بعد دیگرے گررہے ہوں۔)

تمہیدی معروضات

درج بالا حدیث شریف جس کی توضیح وتشریح آئندہ صفحات میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔اس کے متعلق یہاں چند باتیں تمہید کے طور پر عرض کرنا ضروری ہے۔

تین وضاحتیں

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں جن عذابوں کا اور مصیبتوں کا ذکر کیا گیا ہے، علما نے ان کو قیامت کی علامتوں میں سے شمار فرمایا ہے۔(۱)

چناں چہ امام ترمذی رحمۃ اللہ نے اس حدیث کو قیامت کی نشانیوں کے باب میں ذکر فرمایا ہے اور صاحبِ ''مشکوٰۃ'' نے بھی اس حدیث کو علامات قیامت کے باب میں داخل فرمایا ہے۔(۲)

نیز ماضی قریب کے مشہور مفسر وفقیہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے بھی اس حدیث کو علامات قیامت میں بیان فرمایا ہے۔(۳)

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ان چیزوں کے علامات قیامت میں سے ہونے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سب چوں کہ ہمارے اختیار سے باہر ہے اور ہونی اور

---

(۱) الترمذي ۲/۴۴

(۲) المشكوٰة:۴۷۰

(۳) معارف القرآن ۸/۳۵

شُدنی بات ہے؛ اس لیے اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ یہ سب عذابات ہمارے اختیار سے باہر اور شدنی ہیں؛ لیکن ان عذابات کا جن باتوں کو سبب ومحرک قرار دیا گیا ہے، وہ سب کے سب اختیاری ہیں، تو یہ نتائج وعواقب بھی گویا ہمارے اختیار میں ہوئے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے سنکھیا کے کھانے سے موت کا واقع ہونا، کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ زہر سے ہلاکت وموت کا ہونا، انسان کے اختیار سے نہیں؛ بل کہ خدائے قادر وحکیم کی قدرت وحکمت کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے؛ مگر اس میں بھی کس بے وقوف کو شبہ ہوسکتا ہے کہ زہر کھانے کا عمل جس کو خودکشی کہتے ہیں، یہ تو انسان کے اختیار میں ہے، جس کے سبب سے زہر اپنا اثر دکھایا ہے؟

اسی طرح یہ عذابات جن کو علامات قیامت میں شمار کیا گیا ہے، انسان کے اختیار میں نہیں ہیں؛ مگر ان کے اسباب وبواعث تو اختیار میں ہیں، تو جب سبب اختیاری ہوا، تو اس کا نتیجہ بھی اختیاری ہی سمجھا جائے گا، جیسے زہر کھانے والے کی موت کو سب اختیاری ہی کہتے ہیں اور اسی کو اس کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں؛ لہٰذا ان باتوں کے ذمے داری بھی ہم ہی ہوں گے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ علامات قیامت جن کا اس حدیث میں ذکر ہے، اختیاری ہیں، تو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو علامات قیامت اختیاری ہوتے ہیں، وہ گناہ اور معصیت میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اپنے وعظ ”الهدیٰ والمغفرة“ میں فرماتے ہیں:

”یہ امر مصرح وثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامت قیامت سے ہوں، وہ معصیت ومذموم ہیں۔“(۱)

---

(۱) بہ حوالہ اشرف الجواب: ۲/ ۲۱۸

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس حدیث میں جن افعال واعمال کی فہرست پیش کی گئی ہے، وہ سخت گناہ ومعصیت کے کام ہیں، جن سے بچنا اور دور رہنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

ایک شیطانی دھوکے کی پردہ دری

اس تفصیل سے ایک شیطانی دھوکے وفریب کاری کی قلعی کھل گئی۔ وہ یہ کہ شیطان نے اکثر لوگوں کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ یہ ساری باتیں جن کے قیامت کے قریب ہونے کی خبریں آئی ہیں، وہ بہ ہر حال ہوکر رہیں گی۔ اس میں انسان بے بس ہے؛ لہٰذا نہ ان گناہوں سے مفر ہے نہ اس کے نتائج سے۔ مگر یاد رہے کہ یہ محض شیطان کی فریب کاری اور مکاری ہے۔ ورنہ غور کیجیے کہ یہ امور اگر ہمارے اختیار میں نہ ہوتے اور ہم اس سلسلے میں مجبورِ محض ہوتے، تو ان باتوں کی برائی ومذمت کیوں بیان کی جاتی؟ اور ان سے بچنے کا کیوں حکم دیا جاتا؟ اور ان گناہ کو معصیت قرار دینا کیوں کر صحیح ہوتا؟ ظاہر ہے کہ گناہ اسی کو کہتے ہیں، جس کو آدمی اپنے اختیار سے کرے، بے اختیار جو کام سرزد ہو جائے، اس کو گناہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس سے بچنے کا حکم دیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ آدمی کو صرف ان چیزوں کا مکلّف بنایا گیا ہے، جو اس کی قدرت واختیار میں ہوں، قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿لاَ یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

(اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مکلّف نہیں کرتا؛ مگر صرف اس کام کا جو اس کی طاقت میں ہو اور اس کو ثواب بھی اس کا ملے گا، جو ارادے سے کرے اور عذاب بھی اسی کا ہوگا، جو ارادہ سے کرے۔)

معلوم ہوا کہ علامت قیامت کے طور پر جن باتوں کو بیان کر کے ان سے بچنے اور رکنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ سب کے سب انسان کے اختیار میں ہیں، ان میں انسان مجبورو بے بس نہیں، جو ایسا خیال کرتے ہیں، وہ دراصل شیطانی فریب کے شکار ہیں؛ اس لیے ہم سب کو ہمت سے کام لے کر ان گناہوں سے بچنے اور دور رہنے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔اب آگے حدیث شریف اور اس کی شرح ملاحظہ فرمائیں۔

غریبوں کی حق تلفی

(۱) "إذا اتخذ الفيئ دوٗلا"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مال غنیمت کو شخصی دولت بنالیا جائے،تو ان ہول ناک عذابات کا(جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے)انتظار کرو۔

فیئ اصل میں اس مال کو کہتے ہیں، جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کو کفار سے حاصل ہو جائے۔جیسے جزیہ،خراج،عشر اور صلح کا مال اسی طرح فی اس مال کو بھی کہا جاتا ہے، جس کو کفار و مشرکین چھوڑ کر بھاگ جائیں(۱)

اور "فیئ" کا مال قرآن کی تصریح کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ،آپ کے رشتہ دار،یتیم،مسکین اور مسافر کا حق ہے۔چناں چہ فرمایا گیا ہے:

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ.﴾ الخ (الحشر:۷)

(جو مال لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں(کفار) سے، سووہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور قرابت والوں اور

---

(۱) تفسیر القرطبي:۱۴/۸

مسافر کے لیے ہے؛ تا کہ وہ مال (فیئ) تمھارے مال داروں کی دولت نہ بن جائے۔)

اس آیت میں اللہ کو حصہ دار قرار دینا ملکیت کے لحاظ سے ہے۔ اس کے بعد جو پانچ حق دار ہیں، ان میں سے رسول کا حق آپ کی وفات کے بعد ساقط ہوگیا۔ (۱)

اور آپ کے بعد آپ کے رشتہ داروں کا بھی حق ختم ہوگیا۔ (۲)

کیوں کہ وہ اس لیے تھا کہ وہ حضرات آپ کی مدد و نصرت کرتے تھے، جب آپ نہ رہے اور آپ کی نصرت کا سلسلہ نہ رہا، تو ان کا حق بھی ختم ہو گیا۔ اب صرف تین قسم کے لوگ ''فی'' کے حق دار ہوئے، یتیم، مسکین اور مسافر۔ اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ '' فی'' کا مال صرف حاجت مندوں اور بے کس مسافروں اور یتیموں کا حق ہے۔ غنی و مال دار لوگوں کا اس پر قبضہ کرنا ناجائز ہے اور قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی تصریح کے مطابق یہ تفصیل تقسیم حصص کی؛ اس لیے بیان کی گئی ہے کہ مال دار و غنی لوگ اس مال کو اپنی شخصی دولت نہ بنالیں۔

مگر حدیث زیر بحث میں فی سے مراد وہ مال ہے، جو فقیروں اور حاجت مندوں کا حق ہے، خواہ وہ کفار سے حاصل ہوا ہو یا مسلمانوں سے، پھر وہ کسی بھی طور پر حاصل ہوا ہو؛ اسی لیے بعض علما نے فی کی تعریف یہ کی ہے:

هو مايوضع في بيت مال المسلمين. (۳)

(مال فیئ وہ مال ہے، جو مسلمانوں کے بیت المال میں رکھا گیا ہے۔)

بہ ہر حال اس سے معلوم ہوا کہ اغنیا و مال داروں کا غریبوں کے مال پر قبضہ کر لینا

---

(۱) روح المعاني ۲۸/۴۶

(۲) معارف القرآن ۸/۳۶۸

(۳) التعريفات الفقهية مندرجہ ''قواعد الفقه'': ۴۱۷

اوران تک ان کا یہ حق نہ پہنچانا ناجائز اور عذاب الٰہی کا سبب و باعث ہے۔

حق تلفی کی مختلف صورتیں

غریب لوگوں کی حق تلفی اور ان کو ان سے محروم کرنا مختلف صورتوں سے ہوتا ہے۔

(۱) بیت المال میں فقرا و مساکین کے مد میں جو مال جمع ہوتا ہے، اس کو بیت المال کے ذمے دار منتظمین ان تک نہ پہنچائیں اور اپنی جیب بھرنے اور ٹریژدی پُر کرنے لگیں۔

(۲) فقیر و محتاج لوگوں کے پاس جو پونجی موجود ہے، اس کو چھین لیا جائے جیسے بعض سر برآوردہ لوگ پس ماندہ طبقے کے افراد پر رعب جما کر چھین لیا کرتے ہیں۔

(۳) فقیروں اور محتاجوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے مال داروں پر جو صدقہ خیرات مقرر فرمایا ہے، اس کو نہ دینا مثلاً زکوٰۃ، صدقہ، فطرہ وغیرہ کیوں کہ یہ بھی ان کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا ان کے حق کو دبا لینا ہے۔

حق تلفی کرنے والوں کی اُخروی سزائیں

حق تلفی کرنے والوں پر دنیا میں بھی بعض اوقات سزا کے طور پر عذابات بھیج دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ زیر بحث حدیث میں اس پر سزائیں سنائی گئی ہیں۔ اور آخرت میں تو ایسے لوگوں کو ضرور سزا ملے گی اور ان اخروی سزاؤں کی کچھ تفصیل بعض حدیثوں میں آئی ہے۔ مثلاً:

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ کھڑے ہوئے اور آپ نے مال غنیمت میں خیانت کا ذکر کیا اور اس کو بڑا گناہ قرار دیا، فرمایا کہ میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر بکری ہو اور پکار رہی ہو، یا اس کی گردن پر گھوڑا سوار ہو اور ہنہنا رہا ہو اور یہ شخص کہے کہ یا رسول

اللہ! میری فریادرسی کیجیے ر میں کہہ دوں کہ مجھے کچھ اختیار نہیں، میں نے تو اللہ کا پیغام پہنچادیا تھا، یا اس کی گردن پر اونٹ بلبلا رہا ہو، یا اس کی گردن پر سونا چاندی ہو، یا اس کی گردن پر کپڑے ہوں۔الخ۔ (۱)

مطلب یہ ہے کہ جو جو چیز خیانت کے ذریعے کسی کی دبائی ہوگی، وہ وہاں اس کی گردن پر سوار ہوگی اور یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد چاہے گا اور آپ علیہ السلام اس کی شفاعت کرنے سے انکار کردیں گے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کی ایک بالشت زمین دبالے گا، اس کو زمین کے ساتوں طبقے طوق بنا کر پہنائے جائیں گے۔ (۲)

(۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کی کچھ زمین ناحق لے لے گا، وہ قیامت میں زمین کے ساتویں طبقے تک دھنسا دیا جائے گا۔ (۳)

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) ایک قوم کو قبروں سے اٹھائے گا، جن کے پیٹوں سے آگ نکل رہی ہوگی اور ان کے منہ آگ کے شعلے بھڑکا رہے ہوں گے۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا کہ تم نے اللہ کا یہ قول نہیں دیکھا کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں ظلم کرکے، وہ دراصل اپنے پیٹوں میں آگ کھا رہے ہیں۔ (۴)

---

(۱) البخاري كتاب الجهاد:۱/۴۳۳

(۲) البخاري، كتاب المظالم:۱/۳۳۱

(۳) ایضاً

(۴) الکبائر للذھبي :۶۵

(۵) حضرت ابوامامہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم (ایک مرتبہ) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کا حق (جھوٹی) قسم کے ذریعے حاصل کرتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ جہنم کو واجب اور جنت کو حرام کر دیتا ہے۔[1]

ان چند احادیث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دوسروں کے حقوق خصوصاً یتیموں کے حقوق کو دبا لینے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں پر قیامت میں کس قدر سخت عذابات ہوں گے۔

ایک عبرت ناک واقعہ

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض عارفین سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کا ہاتھ مونڈھے سے کٹا ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ تیرا کیا قصہ ہے؟ کہا کہ اے بھائی! بڑا عجیب قصہ ہے وہ یہ ہے کہ میں نے ایک آدمی کو دیکھا، جس نے مچھلی شکار کر رکھی ہے جو مجھے پسند آ گئی، میں نے اس سے کہا کہ یہ مچھلی مجھے دے دے، اس نے کہا کہ میں نہیں دے سکتا؛ کیوں کہ میں اسی کی قیمت سے میرے اہل و عیال کی غذا و خوراک کا انتظام کرتا ہوں، یہ سن کر میں نے اس کو مارا اور اس سے وہ مچھلی زبردستی لے لی اور چلا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس کو اٹھا کر لے جا رہا تھا کہ اس مچھلی نے میرے انگوٹھے کو زور سے کاٹ لیا۔ جس سے میں نے بہت ہی درد محسوس کیا۔ حتیٰ کہ شدت تکلیف کی وجہ سے سو بھی نہ سکا اور میرا ہاتھ بھی سوج گیا اور صبح ہوئی تو طبیب کے پاس گیا، اس نے کہا کہ اب یہ سڑنا شروع ہو گیا ہے؛ لہٰذا انگلی کو کاٹ دو؛ ورنہ ہاتھ کاٹنا پڑے گا، وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی انگلی کٹوا دی؛

(۱) کتاب الکبائر: ۱۰۲

مگر یہ تکلیف بڑھ کر ہاتھ میں آ گئی، مجھ سے کہا گیا ہے کہ گٹوں تک ہاتھ کٹوادو، میں نے کٹوادیا؛ مگر تکلیف بازو تک پھیل گئی، تو یہاں تک کاٹ دینا پڑا۔ بعض لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ تکلیف کس سبب سے پیدا ہوئی؟ میں نے مچھلی کا قصہ سنایا۔ اس نے کہا کہ اگر تو پہلی ہی دفعہ مچھلی والے سے مل کر معاف کرالیتا؛ تو تیرے اعضا نہ کاٹے جاتے۔ لہٰذا اب جا کر معافی مانگ لے، وہ کہتا ہے کہ میں گیا اور معافی مانگا اور یہ میرا قصہ سنایا، تو اس نے معاف کر دیا۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کا حق چھیننا اور دبا لینا، خدا کو ناراض کر دینا ہے اور اس سے دنیا و آخرت دونوں جگہ مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔

امانت میں خیانت

''والامانة مغنما''

''اور جب امانت کو مال غنیمت بنالیا جائے''۔ مال امانت کو مال غنیمت سمجھ لینے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے غنیمت کا مال حلال ہے، اسی طرح امانت کے مال کو بھی حلال سمجھ کر اس میں تصرف کیا جائے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ امانت میں خیانت کرنا اور پھر مال غنیمت کی طرح اس کو حلال سمجھنا، یہ بھی ان گناہوں اور شدید تر غلط کاریوں میں سے ہے، جن کو علامات قیامت کے ظہور کا سبب بتایا گیا ہے، جو ہول ناک و خطرناک مصائب کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں خیانت کس قدر بری اور گندی چیز ہے؟ کہ اس کے عام ہوجانے پر ان سخت ہول ناک عذابات کی وعید سنائی گئی ہے، چناں چہ

---

(۱) کتاب الکبائر: ۱۱۴

خیانت کی برائی پر قرآن وحدیث میں واضح ارشادات موجود ہیں۔

خیانت کی برائی وممانعت

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانفال: ۲۷)

(اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کی امانت میں خیانت نہ کرو اور نہ خود تمھاری امانتوں میں خیانت کرو، جب کہ تم جانتے ہو۔)

اس آیت میں صاف طور پر امانت میں خیانت سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث میں بھی اس کی برائی وممانعت آئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منافق کی تین علامتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ جب بولے گا تو جھوٹ بولے گا، دوسرے یہ کہ وعدہ کرے گا؛ تو (قصداً) اس کے خلاف کرے گا اور تیسرے یہ کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے گی؛ تو اس میں خیانت کرے گا۔(۱)

اور ایک حدیث میں فرمایا کہ جس کے پاس امانت نہیں اس کا ایمان نہیں۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ خیانت کرنا مومن کی نہیں؛ بل کہ منافق کی صفت ہے۔ ایک شخص مومن ہو کر خیانت نہیں کرسکتا۔ ایک حدیث میں اس سے زیادہ صاف الفاظ میں یہ بات فرمائی گئی ہے۔ چناں چہ امام احمد رحمۃ اللہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ہر صفت پر پیدا ہوسکتا ہے، سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔(۳)

---

(۱) البخاري، کتاب الایمان: ۱۰

(۲) الکبائر: ۱۴۹

(۳) الکبائر: ۱۵۰

معلوم ہوا کہ جھوٹ کی طرح خیانت بھی مومن کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔

خیانت کا عذاب

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اس شخص کولایا جائے گا، جس نے امانت میں خیانت کی ہوگی اوراس سے کہا جائے گا کہ امانت ادا کرو وہ کہے گا ''اے پروردگار! یہ کیسے ہوسکتا ہے جب کہ دنیا تو جا چکی ہے؟'' اب اس شخص کوجہنم کی گہرائی میں اس (امانت کی) چیز جیسی کوئی چیز دکھائی دے گی، اس سے کہا جائے گا کہ اس میں اترا وراس کونکال لا، پس وہ اترے گا اور اس کو اپنے کندھے پر اٹھائے گا،تو وہ چیز اس کو دنیا کے پہاڑوں سے زیادہ وزنی معلوم ہوگی، حتیٰ کہ جب وہ یہ خیال کرے گا کہ میں اب کامیاب ہوگیا،تو جہنم کی پستی میں گر پڑے گا،اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیےاس میں پڑ جائے گا۔ (۱)

خیانت کی شکلیں

یہاں یہ بات خاص طور پر جان لینے کی ہے کہ خیانت صرف مال میں نہیں ہوتی؛ بل کہ خیانت کی بہت شکلیں ہیں: ان میں سے ایک مالی خیانت ہے،جس کو سبھی جانتے ہیں۔اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ خیانت کے معنی ہیں امانت کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا، اورامانت نام ہے، ہراس چیز کا جو دوسرے کی کسی کے ذمے ہو،خواہ وہ مال ہو یا کسی اور طرح کا حق ہو،اسی عام معنی میں قرآن کریم نے امانت کالفظ استعمال فرمایا ہے۔

﴿ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ. ﴾ (الأحزاب :۷۲)

---

(۱) الكبائر :۱۵۰،قال في الحاشية : قال أحمد: إسناده جيد.

(بلاشبہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر امانت کو پیش کیا، انھوں نے اس بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور انسان نے اس بار امانت کو اٹھالیا۔)

یہاں ''امانت'' سے مراد تمام دینی احکامات ہیں، جو انسان کے ذمے خدا کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ اسی لیے بعض نے ''امانت'' کی تفسیر فرائض سے، کسی نے نماز سے، کسی نے غسل سے، کسی نے عفت وعصمت کی حفاظت سے کی ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے۔ (۱)

اور حدیث شریف میں اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ مجلسیں امانت ہیں۔ (۲) یعنی مجلس میں جو بات ہوئی وہ امانت ہے۔

اسی طرح میاں بیوی کے درمیان ہونے والی رازدارانہ گفتگو کو امانت فرمایا گیا ہے۔ (۳)

الغرض امانت ہر وہ چیز ہے، جو کسی کے ذمے عائد کی گئی ہو۔ اور خیانت کے معنی امانت کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ہے۔ لہٰذا ان سب باتوں میں خیانت جاری ہوتی ہے۔ مثلاً نماز نہ پڑھنا خیانت ہے، روزہ نہ رکھنا خیانت ہے، اپنی عفت کی حفاظت نہ کرنا خیانت ہے، خدا اور رسول کے بتائے ہوئے کسی بھی حکم کی مخالفت کرنا خیانت ہے، اسی سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے، جو اوپر درج کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کی امانت میں خیانت نہ کرو۔

مگر چوں کہ زیر بحث حدیث میں بہ ظاہر خیانت سے مالی خیانت مراد ہے اس

---

(۱) دیکھو تفسیر القرطبي: ۱۴/۲۴۵

(۲) أبو داؤد مع بذل المجهود: ۶/۲۵۲

(۳) أيضاً

لیے ہم یہاں مال سے متعلق خیانت کی بعض جزئیات کو پیش کرنا چاہتے ہیں، جن میں عام طور پر غفلت برتی جارہی ہے اور لوگ اس کو خیانت نہیں سمجھتے۔

بیوی کا مہر اور معاشرے کی تباہ کاریاں

بیوی کا مہر شوہر کے ذمے واجب الادا ہے، یہ بیوی کی امانت ہے۔ قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کو ان کا مہر ادا کرو۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے پانچ شخصوں کا ذکر فرمایا ہے، جو خدا کے غضب کے مستحق ہیں اور ان میں اس شخص کا بھی ذکر کیا ہے، جو بیوی کا مہر ادا نہ کر کے اس پر ظلم کرے۔ (۱)

معلوم ہوا کہ مہر ادا نہ کرنا ایک ظلم ہے اور ایسے شخص پر جو مہر ادا نہیں کرتا، خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔

آج معاشرے میں جہاں اور بہت ساری خرابیاں موجود ہیں، وہیں یہ بیماری بھی مشاہدے میں آرہی ہے کہ شوہر بیوی کا مہر اپنے ذمے سمجھتا ہی نہیں، بس نکاح کے وقت محض دکھاوے اور بڑائی کے لیے لمبا چوڑا مہر باندھا جاتا ہے، جس کی ادائیگی کا خیال و تصور بھی نہیں ہوتا، بل کہ یہ سمجھتا ہے کہ ادا نہیں کرنا ہے۔ حالاں کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کم یا زیادہ مہر پر نکاح کرے اور اس کے دل میں یہ نہ ہو کہ اس مہر کو ادا کرنا ہے، تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ زانی قرار دیا گیا ہوگا۔ (۲)

مہر کے سلسلے میں ایک تباہ کاری یہ بھی معاشرے میں رائج ہے کہ شوہر کے انتقال پر کنبے کی عورتیں، مرنے والے کی بیوی کو مجبور کرتی ہیں، کہ وہ اپنا مہر معاف کردے،

---

(۱) الکبائر للذهبي :۱۰۶

(۲) جمع الفوائد:۱/ ۲۱۹

حال آں کہ جب تک کوئی دل سے معاف نہ کرے معاف نہیں ہوتا۔ نیز ایسی حالت میں جب کہ عورت رنج وغم میں مبتلا ہے، اس سے معاف کرانا بالکل غلط ہے۔ وہ تو ایسی حالت میں معاف کر ہی دے گی، خواہ جی چاہے یا نہ چاہے۔ پھر بھی سوچنا چاہیے کہ مہر معاف کیوں کرایا جائے؟ جب کہ اس بیوہ عورت کو شوہر کے مال سے اس کا حق مل سکتا ہے؟ محض رسم پرستی ہے اور کچھ نہیں۔

مستحق لوگوں کا نفقہ امانت ہے

اسی طرح بیوی بچوں کا نفقہ (خرچ) واجب الادا اور امانت ہے۔ نیز محتاج والدین، بھائی، بہن اور دیگر حاجت مند رشتہ داروں کا نفقہ بھی امانت ہے اس میں کوتاہی کرنا خیانت کا مجرم بناتا ہے۔

مزدور کی اجرت امانت ہے

مزدور کی اجرت بھی امانت ہے، مزدور سے کام لے کر اس کو اجرت نہ دینا بھی اس کی خیانت ہے اور اس کی بھی بڑی سزا ہے۔ "بخاری" میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تین آدمی ایسے ہیں، کہ میں قیامت کے دن ان کا دشمن ہوں گا: ایک وہ جو وعدے کر کے اس کو توڑ دے، دوسرے وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے، تیسرے وہ شخص جو کسی مزدور سے کام لے کر اس کا اجر نہ دے۔ (۱)

دینی خدام کا نفقہ امانت ہے

اسی طرح دین کی خدمت پر جو حضراتِ علما و فقہا اور حفاظ و قرا لگے ہوئے ہیں،

(۱) البخاري، كتاب الإجارات: ۱/۳۰۲

ان کا نفقہ قوم کے ذمے ہے اور امانت ہے، اس کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا بھی خیانت ہے۔ مگر افسوس کہ آج قوم کا مزاج اس قدر فاسد اور خراب ہو چکا ہے کہ وہ ان حضرات کا خرچہ ونفقہ اپنے ذمے امانت تو کیا سمجھتے؛ بل کہ الٹا حضرات علما وفقہا پر اپنا احسان جتاتے ہیں، حال آں کہ یہ ان کی امانت ہے، جس کا ادا کرنا قوم کے ذمے لازم ہے۔

بل کہ بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ علما وخدام کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ خدام دین کو بلا معاوضہ کام کرنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے تعلیقاً نقل کیا ہے کہ قاضی شریح قضا کے کام پر اجرت لیتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما نے اپنی خلافت میں بیت المال سے خرچ لیا ہے۔(۱)

اب کیا یہ حضرات بھی نشانۂ ملامت بنائے جائیں گے؟

پھر غور یہ کرنا ہے کہ علما وخدام دین اپنی خدمت کا معاوضہ ہرگز نہیں لیتے ہیں؛ بل کہ وہ اپنا کام خدا کے لیے کر رہے ہیں، اور خدا کی طرف سے ایسے خدام دین کا نفقہ مسلمانوں پر عائد کر دیا گیا ہے۔

چناں چہ قرآن میں صاف موجود ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ﴾ (البقرۃ: ۲۷۳)

(اس میں حق ہے ان حاجت مندوں کا بھی جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں، کیوں کہ وہ زمین میں محنت نہیں کر سکتے۔)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اس آیت میں اللہ کے راستے میں مقید ہونے والے سے مراد طالب علم

---

(۱) البخاري، كتاب الأحكام: ۲/۱۰۶۱

ہے اور ''زمین پر جو محنت نہیں کر سکتے'' کا مطلب یہ ہے کہ معاش کے لیے فرصت نہیں پاتے۔(۱)

بہ ہر حال معلوم ہوا کہ دینی خدام کا نفقہ خدا نے قوم کے ذمے لگایا ہے، اس میں کوتاہی کرنا خیانت میں داخل ہے۔

ادائے زکاۃ میں کوتاہی

والزکاۃ مغرما (اورزکاۃ کوتاوان سمجھ لیا جائے)

تو (ان عذابوں کا) انتظار رو، زکاۃ کوتاوان سمجھ لینے کا مطلب یہ ہے کہ زکاۃ کوتاوان کی طرح ظلم سمجھ لیا جائے۔ظاہر ہے کہ زکاۃ جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس کو ظلم سمجھنا بڑی گمراہی کی بات ہے اور اس کو تاوان سمجھنے سے ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ زکاۃ ادا نہ کرے گا۔دوسری بات یہ ہوگی کہ اگر دے گا تو نہایت غلط طریقے پر دے گا کیوں کہ رضا و رغبت نہ ہوگی اور یہ سب خدا کو ناراض کرنے والی باتیں ہیں۔

زکاۃ کا تاکیدی حکم

اسلام میں زکاۃ کی اہمیت اور اس کا تاکیدی حکم اور زکاۃ نہ دینے پر سخت عذابات کی وعیدیں کس سے مخفی ہیں؟ اس لیے اس پر کسی تفصیل و توضیح کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ ایک آیت اور ایک حدیث پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۚ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ (التوبۃ: ۳۴،۳۵)

(۱) اصلاح انقلاب امت: ۲/ ۱۹۲

(اور جولوگ سونا، چاندی جمع کرتے ہیں اوران کواللہ کے راہ میں
خرچ نہیں کرتے ، اُنھیں دردناک عذاب کی خبر سنادو جس دن کہ
(مال) جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان لوگوں کی
پیشانیاں پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی، کہ یہ وہی ہے جس کو تم نے جمع
کیا تھا، اب اس کا مزہ چکھو۔)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ جسے مال دے اور وہ اس کی زکاۃ نہ نکالے، تو اس کا مال قیامت کے دن اس کے لیے پرانے سانپ کی شکل میں کر دیا جائے گا، جس کے سر میں دو کالے نکتے ہوں گے، سانپ اس دن اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا اور وہ اس کے دو جبڑوں کو ڈسے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ الخ (۱)

زکاۃ نہ دینے کا برزخی عذاب

زکاۃ میں کوتاہی کرنے والوں پر برزخ (قبر) میں بھی عذاب ہوگا۔ چناں چہ حضرت ابو ہریرہ سے ایک لمبی حدیث میں معراج کے واقعے میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ آپ کا گزر ایک ایسی قوم پر سے ہوا، جس کے اگلے اور پچھلے حصے پر پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح جہنم کے کانٹوں دار درخت اور پھل اور جہنم کے گرم گرم پتھروں کو چر رہے تھے، پوچھا کہ اے جبرئیل! یہ کون ہیں؟ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے مال کا صدقہ زکاۃ نہیں دیتے تھے۔ (۲)

---

(۱) البخاري، كتاب الزكوة: ۱/۱۸۸

(۲) كتاب الروح لابن القيم: ۵۹

ایک عجیب واقعہ

زکاۃ نہ دینے والے پر عذاب قبر کا ایک عجیب واقعہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ علامہ یوسف فریابی رحمۃ اللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابوسنان رحمۃ اللہ کی زیارت کے لیے گئے، ابوسنان نے فرمایا کہ چلو ہمارے پڑوسی کے بھائی کا انتقال ہوگیا ہے، ان کی تعزیت کرآئیں۔ کہتے ہیں کہ جب اس پڑوسی کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ بہت رورہا ہے اور ہماری تعزیت کو بھی قبول نہیں کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا کہ کیا تو جانتا نہیں کہ موت کے بغیر چارہ نہیں کہنے لگا، ہاں جانتا ہوں؛ مگر میں اس لیے رورہا ہوں کہ میرا بھائی صبح وشام عذاب میں مبتلا ہے۔ کہتے ہیں ہم نے پوچھا کہ تجھ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا تجھ کو غیب پر خدا نے اطلاع دی ہے؟ اس نے کہا نہیں؛ لیکن جب میں نے میرے بھائی کو دفن کردیا اور اس پر مٹی ہموار کردی اور لوگ چلے گئے تو میں نے قبر سے اچانک ایک آواز سنی کہ آہ! مجھ کو انھوں نے تنہا بٹھا دیا ہے کہ میں عذاب کا اندازہ کروں، میں تو نماز پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا، یہ سن کر مجھ کو بھی رونا آگیا، میں نے اس کی قبر سے مٹی ہٹائی، تو دیکھا کہ قبر آگ کے شعلے بھڑکا رہی ہے اور میرے بھائی کے گلے میں آگ کا طوق ہے۔ بھائی کی محبت نے مجھے ابھارا اور میں نے اس کی گردن سے طوق اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو جل گئے۔ محمد بن یوسف فرماتے ہیں کہ اس نے ہم کو اپنا ہاتھ دکھایا کہ وہ جل کر کالا ہوگیا ہے، پھر اس نے کہا کہ اب میں اس کے حال پر کیوں غم نہ کروں اور کیسے نہ روؤں؟ محمد فریابی کہتے ہیں کہ ہم نے پوچھا کہ تیرے بھائی کا عمل کیا تھا؟ اس نے کہا: وہ اپنے مال کی زکاۃ نہیں دیتا تھا۔ (۱)

---

(۱) کتاب الکبائر: ۳۶-۳۷

زکاۃ کے بارے میں چند کوتاہیاں

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ زکاۃ کو تاوان سمجھنے والے اولاً تو زکاۃ ادا کرنے کے لیے ہی تیار نہ ہوں گے اور اگر تیار بھی ہوں گے تو ایسے طریقے سے ادا کریں گے، جس سے معلوم ہو کہ یہ ایک ظلم سمجھ کر زکاۃ دے رہے ہیں۔ چناں چہ آئے دن دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض مال دار طبقے کے لوگ زکاۃ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ گویا وہ خدا پر احسان کر رہے ہیں۔ بعض اوقات ان کی زبانوں سے بھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کو اپنا فرض سمجھ کر نہیں؛ بل کہ تاوان خیال کرتے ہوئے دے رہے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اپنے پورے مال کی زکاۃ نہیں نکالتے؛ بل کہ تھوڑی بہت نکال دیتے ہیں اور بہ ظاہر لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ ہم نے زکاۃ ادا کر دی ہے۔ حال آں کہ یہ ان کے کل مال کے عشر عشیر کی زکاۃ بھی نہیں ہوتی، جیسے بعض بل کہ اکثر تجارت پیشہ لوگ ٹیکس سے بچنے کے لیے پورا حساب نہیں بتاتے اور تھوڑا بہت حساب بتا کر پیچھا چھڑاتے ہیں؛ مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ انسان، انسان کو دھوکہ دے سکتا ہے؛ مگر خدا کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ بہ ہر حال بتانا یہ ہے کہ یہ سب اسی غلط خیال کی کرشمہ سازی ہے کہ زکاۃ کو ایک ظلم سمجھ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کے دلوں کو ایمان و عمل صالح کے لیے کھول دے۔ آمین

علم دین سے دنیا کمانا

”وتعلم لغیر الدین“

(اور علم غیر دین کے لیے حاصل کیا جائے۔)

یعنی علمِ دین کو دین کی خاطر حاصل نہ کیا جائے؛ بل کہ دین سے ہٹ کر

دوسرے اغراض ومقاصد کے تحت اس کو حاصل کیا جائے، خواہ وہ مال ودولت کے لیے ہو یا جاہ وحشمت کی خاطر، حکومت وسلطنت اس کا مقصد ہو یا نام ونمود وشہرت۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم دین حاصل کرنے والے کا مقصد صرف دین ہونا چاہیے۔ دین سے ہٹ کر کسی اور مقصد کے تحت وہ علم دین حاصل کرتا ہے، تو وہ ان عذابات کا مستحق ہے، جن کا ذکر درج بالا حدیث میں کیا گیا ہے۔

دنیا طلب عالم کا حشر

اور ان دنیا طلب علما کا حشر بہت بُرا ہوگا۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس لیے علم حاصل کرتا ہے کہ علما سے مناظرہ بازی کرے یا جاہلوں سے جھگڑے یا لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرے، تو اس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کریں گے۔ (۱)

ایک حدیث میں تین شخصوں کا ذکر ہے، جن کو باوجود نیک عمل کرنے کے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے، جو بہت بڑا عالم وقاریٔ قرآن ہوگا، اس کو حاضر کر کے پوچھا جائے گا کہ تونے کیا عمل کیا؟ وہ اپنی کارگزاریاں سنائے گا، اس سے کہا جائے گا تو جھوٹا ہے، تونے یہ سب نیک عمل اس لیے کیا تھا کہ تجھ کو بڑا عالم کہا جائے، لہٰذا یہاں تیرا کچھ حصہ نہیں، پھر اس کو جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ (۲)

علمائے سو کی مذمت

علمائے دنیا جن کو علما سوئے کہا جاتا ہے، آج معاشرے میں گندگی پھیلاتے اور دین کے

---

(۱) مشکوۃ المصابیح :۳۴

(۲) کتاب الکبائر :۱۴۳

نام پر خرافات جاری کرتے نظر آتے ہیں اور اس کارروائی سے ان کا مقصود صرف دنیا اور دنیا کی فانی و مادی چیزیں، دنیا کی محبت و جاہ کی طلب نے ان کو دین میں خرابی وفتور پیدا کرنے پر ابھار دیا ہے، حتی کہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کو کہنا پڑا کہ ہر ضعف و کمزوری جو اس زمانے میں امور شریعت میں واقع ہوئی ہے اور دین کی تقویت وملت کی ترویج میں فتور واقع ہوا ہے، یہ علمائے سو کی نحوست اور ان کی نیتوں کے فساد سے ہے۔(۱)

یہ علمائے سو دین کی ترویج کے بہ جائے، اپنے جذبۂ بد کی تسکین کے لیے خرافات کی ترویج کرتے ہیں، دین میں بدعات پیدا کرتے ہیں اور اس پر موضوع و من گھڑت روایات پیش کر کے عوام کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں، علمائے آخرت سے لوگوں میں بدظنی پیدا کرتے ہیں اور غنی و مال دار لوگوں سے چاپلوسی سے پیش آتے ہیں، ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، ان کے پاس بھلے بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے علم کو اور ساتھ ہی دوسرے علما کو ان دنیاداروں کے سامنے ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔ یہی وہ علمائے سو ہیں جن کے بارے میں اللہ کے رسول علیہ السلام نے فرمایا کہ بدترین علما وہ ہیں، جو امیروں کے پاس آتے ہیں۔(۲)

اور حضرت سعید بن المسیب نے فرمایا کہ جب تم کسی عالم کو دیکھو کہ وہ امیروں سے تعلق رکھتا ہے تو اس سے دور رہو کیوں کہ وہ (عالم نہیں) چور ہے۔(۳)

اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ جہنم میں ایک وادی ہے، جس میں

---

(۱) المنتخبات من المکتوبات :۵

(۲) ابن ماجہ کذافی احیاء العلوم للغزالی :۱/ ۶۸

(۳) ایضاً

صرف ان علما کا ٹھکانہ ہوگا، جو بادشاہوں کی زیارت (دنیا حاصل کرنے کے لیے) کرنے والے ہیں۔ (۱)

ایک عبرت ناک واقعہ

امام غزالی رحمۃ اللہ نے ''احیاء العلوم'' میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک شخص خدمت کیا کرتا تھا، وہ لوگوں سے بیان کرتا تھا کہ مجھے موسیٰ صفی اللہ نے یہ بات بتائی، کبھی کہتا کہ مجھے موسیٰ کلیم اللہ نے، موسیٰ نجی اللہ نے یہ خبر دی، اس طرح لوگوں کو سنا سنا کر اس نے خوب مال و دولت جمع کر لی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اس کو مفقود پایا اور لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کیا، مگر اس کی کچھ خبر نہ ملی، پھر اچانک ایک دن ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے ہاتھ میں خنزیر (سور) تھا اور سور کے گلے میں کالی رسی بندھی ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس آنے والے سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جو بہت دنوں سے نظر نہیں آ رہا تھا کہ فلاں کو تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے کہا اے حضرت! یہ سور ہی شخص ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے سوال کیا کہ اے اللہ اس کو اپنی اصلی حالت پر لوٹا دے؛ تا کہ میں اس سے اس کے مسخ ہو جانے کی وجہ دریافت کر لوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر تم مجھے ان تمام ناموں سے پکارتے جن سے آدم اور ان کے بعد کے انبیا نے مجھ کو پکارا تب بھی میں یہ دعا قبول نہ کرتا؛ لیکن میں اس کی وجہ بتا دیتا ہوں کہ میں نے اس کو مسخ کیوں کیا ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص دین کے ذریعے دنیا طلب کرتا تھا۔ (۲)

---

(۱) ایضاً

(۲) احیاء العلوم ۱/۶۲

علما کی دنیا طلبی کے برے اثرات

علمائے سو کی دنیا طلبی نے معاشرے پر جو اثرات چھوڑے ہیں، ان کی فہرست تو بڑی طویل ہے، ان کی تفصیلات پیش کرنے کا یہ موقع نہیں، البتہ یہاں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں: وہ یہ کہ ان دنیا طلب؛ بل کہ دنیا پرست علمائے سو کی مجرمانہ حرکتوں کی وجہ سے لوگوں نے اور خاص طور پر مال دار لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ علما ان ہی دنیا کے کتوں کا نام ہے؛ اس لیے ان کے ساتھ بھی اور دوسرے علمائے ربانیین کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنے لگے، جو ایک کتے کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ دنیا کے کتے برابر ان دنیا داروں کو چاٹتے رہتے ہیں، جوں جوں ان کو دھتکارا جاتا ہے۔

اس صورت حال نے ایک طرف دنیا داروں کو نہ صرف یہ موقع دیا کہ وہ ان علمائے سو کو برا کہتے؛ بل کہ انھیں یہ موقع بھی ہاتھ آیا کہ علمائے ربانیین اور خود دین اسلام کو بھی برائی سے یاد کریں اور اسلام کو بری نگاہوں سے دیکھیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مساجد میں علما، احکام اسلام کے نہیں؛ بل کہ مسجد کے صدر و سکریٹری و دیگر اراکین کے تابع فرمان و خادم و غلام بنے ہوئے ہیں۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ علما محض اپنی ضروریات زندگی کی خاطر امامت، خطابت و تعلیم و تدریس کا مشغلہ اختیار کرتے ہیں اور یہ سمجھنے والے ان ہی علمائے سو کی حرکتوں سے یہ سمجھتے ہیں؛ لہٰذا ایک نوکر سے زیادہ ان کی وقعت و عظمت دلوں میں نہیں ہے۔

اے کاش! کہ یہ علمائے سو خدا پر توکل و اعتماد کی دولت سے مال مال ہوتے اور دنیا اور دنیا پرستوں سے اپنے آپ کو مستغنی کر لیتے، تو آج یہ ذلت و رسوائی ہرگز نہ ہوتی اور یہ جائے اس کے کہ علما؛ امرا کے پاس جاتے۔ امرا، علما کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس کو فخر سمجھتے اور اس سے خود اپنا وقار بھی رہتا اور اسلام و شریعت کا وقار بھی

قائم رہتا۔

شیخ جیلانی رحمہ اللہ کا ملفوظ

آخر میں ان دنیا پرست علما کے متعلق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا ایک ملفوظ ان کی مجالس سے نقل کرتا ہوں، جس میں آپ نے ان علما سے خطاب فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

"اے علم وعمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت؟ اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو! اے بندگان خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (مبتلا) ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے عالمو! اے زاہدو! شاہان وسلاطین کے لیے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان سے دنیا کا زر و مال اور اس کی شہوات ولذات لیتے رہو۔"(۱)

بیوی کی خاطر ماں کی نافرمانی

وأطاع الرجل امراته وعق أمه

(اور مرد اپنی عورت کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرے)

یہاں دو جملے ہیں: ایک اپنی عورت کی اطاعت کرنا، دوسرا ماں کی نافرمانی کرنا۔ یہ ظاہر ہے کہ مطلقاً اپنی بیوی کی بات ماننا اور اس کے مطابق چلنا ناجائز نہیں ہے؛ بل کہ بیوی کی ان باتوں کو ماننا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے، جو گناہ اور معصیت ہوں؛ اس لیے یہاں جس چیز کی برائی و مذمت بیان کرنا مقصود ہے۔ وہ ان دونوں جملوں کو ملانے سے ظاہر ہوگی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بیوی کی ایسی اطاعت کرنا جس سے ماں

---

(۱) خطبات غوثیہ مجلس:۵۱/۴۴۵

کی نافرمانی لازم آتی ہو، ناجائز ہے اور اس پر مذکورہ عذابات نازل ہوں گے۔

فرماں برداری ونافرمانی کے جواز وعدم جواز کا معیار

اس جملے کے مضمرات پر بحث کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اسلام میں کسی کی فرماں برداری ونافرمانی کے جائز ہونے یا ناجائز ہونے کا معیار کیا ہے؟ سواس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ کسی کی وہ فرماں برداری ونافرمانی جائز ہے، جس سے خدا کی معصیت لازم نہیں آتی ہو اور ہر وہ فرماں برداری ونافرمانی ناجائز وحرام ہے، جس سے خدا کی معصیت لازم آتی ہو۔ جیسے والدین اگر حکم دیں کہ نماز نہ پڑھو؛ تو اس میں ان کی فرماں برداری ناجائز ہے، کیوں کہ نماز نہ پڑھنے سے خدا کی معصیت لازم آتی ہے۔ اور اگر والدین کہیں کہ شراب پیو، تو اس میں ان کی نافرمانی جائز ہے؛ کیوں کہ اس سے بھی خدا کی معصیت لازم آتی ہے۔ چناں چہ حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق »

(خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔)(۱)

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نہ تو مطلقاً بیوی کی اطاعت ناجائز ہے اور نہ مطلقاً ماں کی نافرمانی ناجائز ہے؛ بل کہ بیوی کی وہ اطاعت ناجائز ہوگی، جس سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو اور اسی طرح ماں کی وہی نافرمانی ناجائز ہوگی، جو خدا کی معصیت تک پہنچانے والی ہو؛ لہٰذا حدیث زیر بحث میں عورت کی اطاعت وماں کی نافرمانی سے وہی اطاعت ونافرمانی مراد ہے، جس سے خداوند قدوس کی نافرمانی ہوتی ہے، یہ وہ بات ہے جس پر قرب قیامت میں خدا کے عذابات نازل ہوں گے۔

---

(۱) اس معنے کی بہت سی حدیثیں آئی ہیں، دیکھو: فتح الباري: ۱۲۳/۱۳

معاشرے کی دو بیماریاں

غرض یہ کہ اس حدیث نے بتایا کہ بیوی کی ایسی خاطر داری جس سے ماں کی ایسی نافرمانی لازم آئے، جو شریعت میں ناجائز ہو، یہ حرام ومعصیت اور عذاب کا باعث ہے۔ مگر افسوس کہ آج کے نوجوان طبقے میں یہ بیماری عام ہوتی جارہی ہے، نفسانی خواہشات کے غلبے اور شیطانی وساوس کے تسلط نے ان کو اندھا کردیا ہے۔ وہ حق وناحق کے سمجھنے اور صحیح وسقیم میں امتیاز کرنے کی صلاحیت واستعداد سے محروم ہو چکے ہیں، ''وہ اُجلا دیکھ کر اچھلتے ہیں اور پیلا دیکھ کر پھسلتے ہیں'' اور ظاہر ہے کہ یہ بات انسان کے لیے انتہائی ذلت وپستی کی ہے کہ وہ صرف نفسانی خواہشات کا پیرو ہو جائے اور بندوں کے وہ حقوق، جو خداوند قدوس نے مقرر کیے ہیں، ان سے غافل ہو جائے۔

اسلام نے ماں کے حقوق بتائے ہیں، ان میں سے ایک حق اس کی فرماں برداری ہے اور اس کی نافرمانی گناہ اور معصیت ہے؛ بل کہ ''بخاری'' کی حدیث کے مطابق یہ گناہ کبیرہ ہے۔ (۱)

اب اگر کوئی شخص ماں کی فرماں برداری سے اس لیے دست کش ہوتا ہے کہ بیوی کی خاطر داری کرے، تو یہ سخت ترین گناہ اور معصیت ہے؛ لیکن یہ یاد رہے کہ مراد بیوی کی وہ خاطر داری ہے جس سے والدہ کی شرعی قاعدے سے نافرمانی لازم آئے۔

الغرض معاشرے میں ایک مہلک وخطرناک بیماری نوجوان طبقے میں پھیلتی جارہی ہے، کہ وہ بیوی کی اطاعت وخاطر داری میں والدہ کی نافرمانی کرنے اور اس سے بغاوت کرنے کے جذبات سے بھرپور ہیں۔

---

(۱) البخاري، كتاب الأدب: ۸۸۴/۲

اور اس کے بالمقابل معاشرے میں ایک اور بیماری بھی پھیلتی جا رہی ہے اور اس نے اپنی جڑیں زمین قلب میں کسی قدر جمادی ہیں، اور وہ ہے بیوی کے جائز مطالبات وواجب حقوق کو ماں کی فرماں برداری میں تلف کر دینا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ جیسے پہلی بیماری خطرناک ہے اور معاشرے کو فاسد وخراب کر دینے والی ہے، اسی طرح یہ دوسری بیماری بھی معاشرے کو بدبودار اور گندہ کر دینے والی ہے۔

ایک عام غلطی کا ازالہ

اس سلسلے میں، میں یہ عرض کر دینے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتا کہ جس طرح پہلی بیماری کا سبب نوجوان طبقے میں خواہشات نفسانی کا غلبہ اور وساوس شیطانی کا تسلط ہے۔ اسی طرح اس دوسری بیماری کا سبب بڑوں اور ان نوجوانوں کے سرپرستوں کی بے رحمانہ ومجرمانہ رعب داری وخدا اور سول کے احکام سے سرکشی ہے۔

عام طور پر یہ بات دلوں میں رچ بس گئی ہے کہ بیوی کی خاطر داری اور اس کی بات ماننا اور اس کے کسی مطالبے کو پورا کرنا ناجائز ہے اور جو ایسا کرے، وہ ''جورو کا غلام'' ہے؛ مگر یہ خیال خود غلط اور باطل ہے۔ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ بیوی کی وہ اطاعت تو ضرور ناجائز ہے، جس سے خدا کی معصیت لازم آتی ہو؛ مگر مطلقاً اور ہر بات میں اس کی اطاعت ناجائز نہیں، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حدیبیہ'' کے موقعے پر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مشورے پر عمل کیا ہے۔ (۱)

اور بعض حدیثوں میں جو آیا ہے کہ عورت کی بات ماننا آخر کار ندامت ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ بے جا اور ناجائز امور میں عورتوں کی اطاعت شرمندگی کا

---

(۱) حیاۃ الصحابہ:۱/۱۳۲

باعث ہے، جیسا کہ علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے۔(۱)

غرض یہ کہ عورت کی بات ماننا مطلقاً ممنوع نہیں ہے۔

اس طرح اس کی خاطر داری اور اس کے جائز مطالبات کا پورا کرنا جائز تو کیا، بل کہ خوبی کی بات ہے۔ حدیث میں عورتوں کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا گیا ہے اور حقوق واجبہ کا پورا کرنا تو مرد پر لازم ہے، اس میں کمی و کوتاہی کرنا تو گناہ کی بات ہے اور اس سلسلے میں والدین کی اطاعت بھی ناجائز ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ ''ازالۃ الرین'' میں فرماتے ہیں:

''جو امر شرعاً واجب ہو اور ماں باپ اس سے منع کریں، اس میں ان کی اطاعت جائز بھی نہیں، واجب ہونے کا تو کیا احتمال ہے۔ مثلاً اس شخص کے پاس مالی وسعت اس قدر کم ہے کہ اگر ماں باپ کی خدمت کرے تو بیوی بچوں کو تکلیف ہونے لگے، تو اس کو جائز نہیں کہ بیوی بچوں کو تکلیف دے اور ماں باپ پر خرچ کرے اور مثلاً بیوی کا حق ہے، وہ شوہر سے ماں باپ سے جدا رہنے کا مطالبہ کرے، پس اگر وہ اس کی خواہش کرے اور ماں باپ اس کو شامل رکھنا چاہیں، تو شوہر کو جائز نہیں کہ اس حالت میں بیوی کو شامل رکھے؛ بل کہ واجب ہوگا کہ اس کو جدا رکھے''۔(۲)

نیز اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ہی کی ایک اور کتاب اصلاح انقلاب امت دیکھیے۔

---

(۱) موضوعات کبیر: ۴۳۔ اس روایت کو ابن عدی اور عقیلی نے روایت کیا ہے۔ ابن الجوزی رحمۃ اللہ نے اس کو موضوع قرار دیا ہے؛ مگر ملا علی رحمۃ اللہ اور سیوطی رحمۃ اللہ اس کو موضوع قرار نہیں دیتے۔ دیکھو اللآلی المصنوعہ (۲/۱۷۴)

(۲) ازالۃ الرین: ۸

راہ اعتدال

بتانا یہ ہے کہ معاشرے میں ایک طرف بعض لوگ ماں کی نافرمانی کرکے خدا کی معصیت کے مرتکب ہورہے ہیں، تو دوسری طرف بعض والدین کے اطاعت شعار لوگ، بیوی کے حقوق کوتلف کرکے معصیت کے مرتکب ہورہے ہیں اور یہ دونوں باتیں دراصل بے اعتدالی کی ہیں۔ راہ اعتدال یہ ہے کہ خدا کے مقرر کردہ بندوں کے حقوق پورے کیے جائیں، خواہ وہ ماں کے ہوں یا بیوی کے، اس سے خدا راضی ہوگا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ معاشرے کی خباثتوں کے خوگر اور اس کے خرافات میں جکڑے ہوئے لوگ اس کو بھی غلط ہی قرار دیں اور اس سے راضی نہ ہوں؛ لیکن راضی تو خدا کو کرنا چاہیے نہ کہ مخلوق کو؛ اس لیے سلامتی کا اور اعتدال کا راستہ یہی ہے کہ اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے۔

دوست کو قریب کرنا اور باپ کو دور کرنا

وأدنى صديقه وأقصى اباه

(اور جب دوست کو قریب اور باپ کو دور کرے۔)

معلوم ہونا چاہیے کہ دوست اور ساتھی سے محبت والفت، اس کے ساتھ احسان وسلوک، کوئی ناجائز بات نہیں ہے؛ البتہ دوست سے تعلقات اور محبت والفت باپ کے حقوق سے غفلت کا سبب بن جائیں؛ تو بلاشتہ یہ بری اور غلط بات ہے، اسی کو یہاں بتانا مقصود ہے اور باپ کو دور کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے حقوق ادا نہ کیے جائیں۔

مسجد میں شور وشغب کرنا

وظهرت الأصوات في المساجد:

(اور مساجد میں شور وشغب کرنا۔)

یعنی دنیاوی باتیں،لڑائی جھگڑے وغیرہ سے مسجدوں کے احترام وتقدس میں فرق پیدا کیا جائے۔ یہ بھی سخت ترین معصیت وگناہ ہے۔

مسجدیں اللہ تعالیٰ کا گھر ہیں، جو عبادت وبندگی، تسبیح وتہلیل، تعلیم وتبلیغ اور دینی کاموں کے لیے موضوع ہیں۔ وہاں شور وشغب کرنا، ان کے احترام وتقدس کے خلاف ہے اور شعائر اللہ کی بے حرمتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بازار کی طرح مسجد میں شور کرنے سے پرہیز کرو۔(۱)

بخاری میں ہے کہ دو شخصوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ڈانٹا؛ کیوں کہ وہ مسجد میں شور کر رہے تھے۔ چناں چہ آپ نے ان سے پہلے یہ پوچھا کہ تم کہاں کے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم طائف کے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر تم مدینے کے ہوتے، تو تم کو اتنا مارتا کہ درد ہو جاتا، تم اللہ کے رسول کی مسجد میں اپنی آواز بلند کرتے ہو؟!!(۲)

مسجد میں شور کی صورتیں

مسجد میں شور اور آواز کا بلند کرنا، جس سے اس حدیث میں ڈرایا گیا ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہاں دنیاوی باتیں کی جائیں، علما نے مباح کلام کو بھی مسجد

---

(۱) مشکوٰۃ:۹۸

(۲) البخاري، کتاب الصلوٰۃ:۱/۶۷

میں مکروہ لکھا ہے۔(۱)

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہاں ہنسی مذاق کیا جائے، یا دینی باتیں ہی بے وجہ زور زور سے کہی جائیں، علمانے تو بے وجہ ذکر میں بھی آواز بلند کرنے کو مکروہ لکھا ہے۔(۲)

نیز مسجد میں خرید وفروخت کرنا بھی اس شور وشغب میں داخل ہے۔اسی طرح دعا میں بے وجہ زور زور سے چیخنا بھی اس میں داخل ہے۔اور یہ ایک بدعت ہے۔(۳)

دعا میں جہر کے سلسلے میں احقر کا رسالہ ''دعا سری و جہری پر محققانہ نظر'' ملاحظہ فرمایئے۔اسی طرح بعض مساجد میں اسپیکر کے ذریعہ کسی کے مرنے کی اطلاع و اعلان کیا جاتا ہے یہ بھی اس میں داخل ہے اور غلط ہے، اس کی تفصیل میرے دوسرے رسالے ''سفر آخرت کے اسلامی احکام'' میں درج ہے۔نیز رمضان میں افطار کے وقت جو ہنگامہ مساجد میں ہوتا ہے، یہ بھی اس وعید کا باعث ہے۔لہذا یہ بھی منکر ہے اس کی تحقیق میں نے رسالہ ''منکرات رمضان'' میں کی ہے۔

بعض دین داروں کی بددینی

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مسجدوں میں شور وشغب نہایت بری چیز اور موجب عذاب و گناہ ہے؛ مگر افسوس کہ بعض دین دار لوگ نمازوں کے بعد مسجدوں میں باتیں کرنے اور شور کرنے کے عادی ہیں اور جوں ہی نماز ہوئی، باتوں میں مشغول ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات ان کے بازو نمازی؛ نماز میں مشغول رہتے ہیں۔مگر ان کو اس کا

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۱/۶۶۲

(۲) أيضاً

(۳) روح المعاني:۸/۱۳۹

خیال تک نہیں رہتا اور جب کوئی ان کو تنبیہ کرتا ہے؛ تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم دین کی باتیں کررہے ہیں، اگر واقعۃً دین کی باتیں کررہے ہیں تب تو خیر؛ ورنہ صرف دوسرے کو خاموش کرنے کے لیے یہ بہانہ بنانا آخرت میں رسوائی کا موجب ہوگا۔

بہ ہرحال بتانا یہ مقصود ہے کہ مسجدوں کو مسجد کے کاموں میں استعمال کرنا چاہیے؛ نہ کہ اس کے خلاف کاموں میں، ورنہ خداوند قدوس کی طرف سے عذاب کا سلسلہ جاری ہوگا۔

نااہل کی سرداری وقیادت

”وساد القبلية فاسقهم وكان زعيم القوم ارذلهم“

(جب قبیلہ کی سرداری ان کا فاسق کرے اور قوم کا سربراہ ان کا رذیل آدمی ہوجائے۔)

پہلے جملے میں ” قبیلہ“، جو قوم کی نسبت سے چھوٹا اور محدود ہوتا ہے، اس کی سرداری وقیادت کے لیے فاسق کے آگے بڑھنے یا بڑھانے کی برائی ہے اور دوسرے جملے میں قوم پر حکومت وسیادت کے لیے ارذل انسان کو آگے کرنے یا کسی کو آگے بڑھنے کی حرمت کا بیان ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی بھی چھوٹی یا بڑی سرداری وسیادت کے لیے نااہل شخص کو آگے بڑھنا یا بڑھانا قیامت کی نشانی وعلامت ہے۔

”بخاري“ کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امانت ضائع کی جانے لگے، تو تم قیامت کے منتظر رہو، صحابہ نے پوچھا کہ امانت کا ضائع کرنا کیا ہے؟ فرمایا کہ جب نااہل کے ذمے کوئی کام سپرد کیا جائے

تو قیامت کے منتظر رہو۔(۱)

اس میں بتایا گیا ہے کہ نا اہل کو کوئی ذمے داری دینا امانت کو ضائع کرنے کے برابر ہے اور یہ قیامت کی نشانی ہے۔

نا اہلوں کا تسلط

آج دیکھا جا رہا ہے کہ ہر عہدے ومنصب پر نا اہل لوگ مسلط ہیں یا ان کو مسلط کیا گیا ہے، سیاسی عہدوں سے لے کر دینی ومذہبی عہدوں تک ہر جگہ نا اہل لوگوں کا قبضہ وتسلط ہے یا دوسرے لوگ ان کو مسلط کیے ہوئے ہیں۔

سیاسی عہدوں پر فائز نا اہل لوگوں کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، ان کی نا اہلی سب پر روز روشن کی طرح واضح ہے۔

مساجد میں دیکھو تو نا اہل امام ومؤذن ملیں گے، جن کو قرآن تک صحیح پڑھنا نہیں آتا، نماز کے مسائل تک سے ناواقف، اذان کے احکام سے بے خبر وجاہل، عمل و تقوے سے عاری وکورے؛ مگر لوگ ہیں کہ ان کو اپنا امام بنائے ہوئے ہیں اور اپنی نمازیں غارت کر رہے ہیں۔

مساجد کے ذمے داروں کو دیکھو، جو اپنے آپ کو امام کا بھی امام سمجھتے ہیں اور امام کو اپنا غلام خیال کرتے ہیں، یہ لوگ اپنی نا اہلی کا جواب نہیں رکھتے، علم دین سے کورے، عمل سے عاری، باطن سے لے کر ظاہر تک ان کا فاسد وخراب، نماز تک سے دست بردار، خدا ورسول کے باغی، خرافات وبدعات میں ملوث، فحش کاریوں و بے حیائیوں کے عادی، غرض یہ کہ یہ نہایت ہی نا اہل ہوتے ہیں، حال آں کہ علما نے تولیت وذمے داریٔ مسجد کے لیے جو شرائط لکھے ہیں، ان میں یہ بھی ہیں کہ وہ امانت ودیانت سے

(۱) البخاري: (۲/۹۶۱و۱۴/۱۴)

متصف ہو، فاسق وفاجر نہ ہو اور متولی بننے کا خواہش مند وطالب نہ ہو۔ (۱)

اور یہ لوگ سیاسی عہدے بازوں کی طرح متولی بننے یا رکن مسجد بننے کے لیے ووٹ کے غیر شرعی طریقے پر اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔

بعض لوگ وعظ وتقریر کا مشغلہ اپناتے ہیں، حال آں کہ یہ عالم نہیں ہوتے؛ بل کہ کچھ ادھر ادھر سے قصے کہانیاں، بے سند و بے اصل حدیثیں، قرآنی آیات کا خود ساختہ غلط ترجمے یاد کر کے اس کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی اس حدیث کا مصداق ہیں۔

الغرض آج ہر جگہ نظر آتا ہے کہ نا اہل لوگوں کا تسلط ہے، یہ بڑی بری بات اور بڑا سخت گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سیاست سے لے کر مذہب تک ہر چیز میں فتور وقصور نظر آرہا ہے۔ اگر ہر جگہ قابل ولائق لوگ جمع ہو جائیں؛ تو پھر یہ فتور وقصور بھی ختم ہو کر اس کی جگہ بھلائی وخوبی پیدا ہو جائے۔

شر پسندوں کا اکرام

”وأكرم الرجل مخافة شره“

(اور آدمی کا اکرام اس کے شر کے خوف سے کیا جائے۔)

مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں شر پسندی وایذا رسانی کا اس طرح مادہ وجذبہ پیدا ہو جائے، کہ ان کے شر سے بچنے کے لیے دوسرے لوگوں کو ان کا اکرام کرنا پڑے، اگر اکرام نہ کیا گیا تو ان کی شر پسندی وغنڈہ گردی وایذا رسانی کا جذبہ، ان کو مجبور کرے گا کہ ان کو تکلیف وایذا پہنچاؤ۔

حاصل یہ ہے آدمی کا اکرام اس کے علم وعمل، تقویٰ وبزرگی، شرافت وسیادت، اور اخلاق وتہذیب کی وجہ سے نہیں؛ بل کہ اس کی غنڈہ گردی اور شر کے خوف سے کیا

(۱) دیکھو الشامي على الدر: (۴/۳۸۰) و (۴/۴۲۲)

جائے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ عذابات آنے والے ہیں، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

معاشرے میں غنڈہ گردی کی کثرت

آج اپنے معاشرے پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر دیکھو، کہ کیا اس میں یہ بات نہیں پیدا ہوگئی ہے؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج عزت وعظمت ان لوگوں کو دی جارہی ہے، جو لوگوں پر ظلم ڈھا کر لوٹ مار کر کے کسی عہدے پر فائز ہو گئے ہیں یا مال ودولت کے انبار لگا لیے ہیں اور ان سیاسی غنڈوں یا دوسرے شر پسندوں کی یہ عزت وعظمت بھی محض اس بنا پر ہے کہ اگر ان کا اکرام نہ کیا گیا، تو خوف ہے کہ اپنی غنڈہ گردی اور شر پسندی سے کوئی تکلیف نہ پہنچا دیں؛ ورنہ دلوں سے کوئی ان کا اکرام نہیں کرتا، بل کہ یہ ظاہری اکرام بھی درست نہیں ہے۔

حدیث کا منشا

حدیث کے اس ٹکڑے میں غور یہ کرنا ہے کہ کس چیز کی مذمت وبرائی بیان کرنا مقصود ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شر پسندی وغنڈہ گردی کی ہی نہیں؛ بل کہ غنڈوں وشر پسندوں کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرنے کی بھی برائی بیان کرنا مقصود؛ ہے بل کہ یہاں اصل مقصود یہی ہے۔ کیوں کہ فرمایا گیا ہے کہ جب آدمی کا اکرام اس کے شر کے خوف سے کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ یہاں جس کی برائی بیان کرنا مقصود ہے، وہ ایسے شخص کا اکرام ہے جو شر پھیلانے والا ہو، لہٰذا ایسے شخص کا اکرام کرنا گناہ اور موجب عذاب وگناہ ہوگا؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس سے اس شخص کے جذبہ شر انگیزی کو تقویت حاصل ہوگی اور وہ اس میں اور پختہ ہو جائے گا اور اس کا شر تجاوز کرتے کرتے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« انصر أخاك ظالما أو مظلوما » (کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔) صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ مظلوم ہے، ہم اس کی مدد تو کر دیں گے؛ لیکن ظالم کی مدد کیوں کر کی جائے؟ آپ نے فرمایا کہ ظالم کے ہاتھوں کو (ظلم کرنے سے) پکڑلو۔(۱)

شر کو ختم کر دینا ضروری

معلوم ہوا کہ ظالم کو ظلم سے روکنا ضروری ہے؛ تا کہ معاشرے میں ظلم کی اندھیری اور شر کی نحوست نہ پھیلے اور قرآن کریم میں جو یہ فرمایا:

﴿ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ﴾ (هود: ۱۱۳)

(ظلم کرنے والوں کی طرف میلان نہ کرو کہ کہیں تم کو آگ نہ پکڑ لے۔)

اس سے سدی رحمۃ اللہ اور ابن زید رحمۃ اللہ کے نزدیک مراد یہ ہے کہ ظالموں کے ساتھ مداہنت نہ کرو۔(۲)

کیوں کہ اس مداہنت کا نتیجہ وہی نکلے گا، جس کا ابھی اوپر ذکر ہوا کہ معاشرہ ظلم و شر سے مملو ہوگا اور یہاں جینا دوبھر معلوم ہوگا۔

لہذا ضروری ہے کہ ان شر پسندوں اور فتنہ پروروں کے شر و فتنے اور ان کے ظلم و جور کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، ان سے مداہنت کرنا اور اپنی ذات کی بھلائی کی خاطر پورے معاشرے کو ظلم کی آگ میں جھونکنے کے لیے تیار ہو جانا، صریح نفس وتن پروری اور قوم کشی ہے، جس کا مرتکب سخت گنہ گار ہے؛ اسی لیے حدیث میں اس فعل پر سخت عذابات کی دھمکی دی گئی ہے۔

---

(۱) البخاري: ۱/۳۳۱

(۲) الکبائر: ۱۱۱

گانے بجانے کی کثرت

”وظهرت القيان والمعازف“

(اور گانے والیاں اور گانے بجانے کے سامان زیادہ ہو جائیں۔)

قیان؛ قينة کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں گانے والی عورت۔ اور معازف؛ معزف ومعزفة کی جمع ہے، آلات لہو ولعب کو کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ گانا، بجانا اور اس کے آلات وسامان کی زیادتی بھی علامات قیامت میں سے ہے اور سخت گناہ کی بات ہے۔ آج یہ مصیبت بھی سب سے زیادہ عام ہوگئی ہے، ہر گھر ودوکان، ہر مجلس وبیٹھک گانوں بجانوں کی آواز سے مسموم رہتی ہے؛ اس لیے ہم کسی قدر تفصیل سے اس پر کلام کریں گے۔

گانا، بجانا قرآن کی نظر میں

سب سے پہلے قرآن کریم کو مدنظر رکھنا، مسلمان کا فریضہ ہے۔ اس میں گانے بجانے کے سلسلے میں اگرچہ بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں؛ مگر ہم یہاں چند پر اکتفا کرتے ہیں:

(۱)﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ . ﴾ (لقمان:۶)

(اور بعض لوگ وہ ہیں، جو کھیل کی باتوں کو خریدتے ہیں، تاکہ اللہ کے راستے سے گمراہ کریں اور اس کو مذاق بنالیں، ان کے لیے ذلت والا عذاب ہے۔)

اس آیت میں ﴿لَهْوَ الْحَدِيْثِ﴾ سے مراد کیا ہے؟ اس میں متعدد اقوال ہیں اور اکثر علما کے نزدیک اس سے گانا، بجانا مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

سے بھی مروی ہے کہ اس سے مراد غنا (گانا، بجانا) ہے۔ (۱)
اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی۔ (۲)
اوراس کے خریدنے سے مراد؛ گانے والی عورت کو یا مرد کو یا ایسے آلات کو خریدنا ہے۔ آج اگر چہ گانے والی عورت ومرد کو خریدنا بہت زیادہ رائج نہیں ہے؛ تاہم یہ کسی قدر رائج ہے، چناں چہ فلم سازاداروں میں یہ بات آج بھی رائج ہے اورآلات لہو جیسے ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی سی آر وغیرہ خریدنا تو سب جانتے ہیں، بہت ہی عام ورائج ہے۔ یہی اس آیت سے مراد ہے۔ ان چیزوں کو خریدنے والوں پر اللہ کی طرف سے ذلت والا عذاب نازل ہوگا، خواہ دنیا میں نازل ہو یا آخرت میں اورظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کام پر عذاب کی دھمکی دیں، وہ کوئی اچھا کام تو نہ ہوگا؛ بل کہ برا اورنہایت قبیح کام ہوگا۔

﴿ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِکَ ﴾ (الإسراء: ۶۴)
(اللہ تعالیٰ شیطان سے فرماتے ہیں، تو جس کو بہکا سکتا ہے اپنی آواز سے بہکالے)

اس آیت میں شیطان کی آواز سے مراد گانا بجانا ہے، جیسا کہ حضرت امام مجاہد رحمۃ اللہ سے منقول ہے۔ (۳)
اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ گانا بجانا شیطان کی آواز ہے اوردوسری

---

(۱) روح المعاني:۲۱/۶۷، عوارف المعارف:۱۱۴مندرجہ ملحق لإحیاء، کف الرعاع لابن حجر المکي: ۲۷۲، طبع ترکی مع دیگر کتب۔
(۲) روح المعاني:۲۱/۶۷
(۳) عوارف المعارف:۱۱۴، روح المعاني:۱۵/۱۱۱، تفسیر القرطبي:۱۷/۲۸۸

بات یہ معلوم ہوئی کہ اسی اپنی آواز سے شیطان سب سے زیادہ انسان کو بہکا تا ہے۔

قرطبی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے ہابیل کی اولاد کو پہاڑ کے اوپر کے حصے میں ٹھہرایا تھا اور قابیل کی اولاد کو پہاڑ کے نیچے ٹھہرایا اور ان میں حسین لڑکیاں بھی تھیں، شیطان نے بانسری بجانا شروع کر دی، اس کی آواز سے متاثر ہو کر اوپر والے نیچے اتر آئے اور زنا کر بیٹھے۔ (۱)

معلوم ہوا کہ شیطان لعین اپنی اس ناپاک آواز سے انسان کو سب سے زیادہ کامیاب طریقے سے بہکاتا ہے اور جو شیطان کی آواز ہو اور اس کا خاص حربہ ہو، وہ ممنوع کیوں نہ ہوگا؟

﴿وَأَنتُمْ سَامِدُونَ﴾ (النجم: ۶۱)

(اور تم لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔)

اس آیت میں لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ اس میں غفلت میں پڑ جانے کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم گانے بجانے میں مشغول ہو۔ (۲)

اور بہ طور توبیخ و زجر کہا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کو گانا بجانا غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے اور یہ کہ غفلت قابل مواخذہ وجرم ہے۔ لہٰذا گانا بجانا بھی حرام و ناجائز ہے۔

گانا بجانا – حدیث کی نظر میں

اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں سے چند احادیث نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱) تفسیر القرطبي: ۱۷/ ۲۸۸

(۲) عوارف المعارف: ۱۱۴، تفسیر القرطبي: ۱۷/ ۱۲۳

(۱) حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دینے والا اور مومنین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ گانے بجانے کے آلات واسباب، صلیب اور جاہلی رسومات کو ختم کر دوں اور مٹا دوں۔ (۱)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری زمانے میں میری امت میں سے ایک قوم بندر اور سور کی صورت میں مسخ کر دی جائے گی۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا وہ مسلمان ہوں گے؟ فرمایا ''ہاں'' وہ لوگ اللہ کی توحید اور میری رسالت کی شہادت دیتے ہوں گے اور روزے رکھتے ہوں گے، صحابہ نے پوچھا کہ پھر وہ ایسا کیوں کر دیے جائیں گے؟ فرمایا وہ گانے بجانے کی چیزوں، گانے والیوں اور دف کو اختیار کرنے والے ہوں گے اور شرابیں پیں گے، پس وہ شراب پر اور ان کھیلوں پر رات گزاریں گے جب صبح کریں گے تو ان کی صورتیں مسخ ہوگئی ہوں گی۔ (۲)

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ سب سے پہلے نوحہ کرنے والا اور گانے والا شیطان ابلیس ہے۔ (۳)

ان احادیث سے بھی گانے بجانے کی حرمت و مذمت بہت ہی واضح انداز سے ثابت ہوتی ہے، ایک مسلمان کے لیے یہ چند حدیثیں بہت کافی ہیں۔

ٹیلی ویژن اور ویڈیو کی حرمت

اوپر کی تفصیلات کو پڑھیے اور غور کیجیے کہ آج یہ گانے بجانے کی بیماری و مصیبت

(۱) کف الرعاع:۴

(۲) ایضاً

(۳) عوارف المعارف :۱۴

جس پر اتنی سخت وعیدیں آئی ہیں، کس قدر معاشرے میں فروغ پا رہی ہیں اور اس کو کس درجہ لازم وضروری قرار دے لیا گیا ہے؟ اور افسوس کیجیے، خصوصاً دورِ حاضر میں ٹیلی ویژن اور ویڈیو کی کثرت کے ساتھ اشاعت وترویج نے پورے معاشرے کو جس طرح بدبودار اور نجس کر دیا ہے، یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے۔ حدیث زیر بحث میں ''معازف'' کا جو لفظ آیا ہے، وہ ہر لہوولعب کی چیز کو عام وشامل ہے۔

لہٰذا اس میں ٹیلی ویژن وویڈیو بھی داخل ہو کر حرام وممنوع قرار پائیں گے؛ بل کہ دوسری چیزوں کی بہ نسبت ان میں چوں کہ زیادہ خباثت پائی جاتی ہے؛ اس لیے ان کو معازف کا اولین مصداق قرار دینا چاہیے۔

ٹی وی کے خطرناک اثرات معاشرے پر

اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ ٹی وی نے معاشرے پر اپنے خطرناک اثرات چھوڑ کر اس کو مسموم کر دیا ہے اور عریانی، بے حیائی، بداخلاقی کو عام کر دیا ہے اور وہ کام اس نے کیا ہے، جو برسہا برس میں ہزاروں آلات لہوولعب نے نہیں کیا۔ اس موقع پر راقم الحروف کی کتاب ''ٹیلی ویژن اسلامی نقطۂ نظر'' میں راقم الحروف نے جو لکھا ہے، اس کو یہاں نقل کر دینا مناسب ہوگا۔

> ''کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ ٹیلی ویژن کے ان فحش پروگراموں کی وجہ سے لوگوں کی بے راہ روی میں اضافہ ہوا۔ بے حیائیوں اور فحاشیوں میں بے پناہ ترقی ہوئی۔ وہ لوگ جو سنیما کی حقیقت تک سے ناواقف تھے، اس کی بہ دولت اس میں ملوث ہوئے۔ وہ لوگ جن کے قلوب واذہان اگر نورِ معرفت سے منور نہ تھے؛ تو بے حیائی اور فحاشی کی ظلمت سے سیاہ بھی نہ تھے، اس کے طفیل سیاہ بختیوں وبدقسمتیوں کا شکار ہوئے۔

وہ معصوم بچے جن کی فطرت وطبیعت سلامتی پر ڈھل سکتی تھی؛ اس کی وجہ سے اپنی عصمت وعفت کھو بیٹھے۔ وہ نوجوان جو قوم وملت کے قائد ورہبر بن سکتے تھے، اس کی بہ دولت قوم کے ناہنجار افراد قرار پائے۔ وہ عورتیں جن کی عصمت وعفت پر ان کے آبا واجداد کو فخر اور قبیلے وخاندان کو ناز تھا اک لخت عصمت فروشی و بے حیائی پر اتر آئیں۔ اگر یہ سب ایک حقیقت اور واقعہ ہے اور بلا شبہ ایک حقیقت ہے، تو پھر وہ اسلام جو برائیوں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ اور بے حیائی اور فحاشی کو اک قلم ختم کر دینے کا تہیہ کر چکا ہے، اس کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ ''(۱)

کیا ہر عکس جائز ہے؟

بعض لوگ ٹی وی اور وی سی آر کے جواز اور عدم جواز کے مسئلے پر جب بحث کرتے ہیں، تو امورِ مذکورہ بالا پر قطعاً غور کر نہیں کرتے اور چھوٹتے ہی یہ بحث کرنے لگتے ہیں کہ ٹی وی اور وی سی آر میں جو نظر آتا ہے، یہ تصویر نہیں؛ بل کہ عکس ہے۔ لہٰذا جائز ہے۔ مگر یہ طرزِ استدلال نہایت ہی غیر معقول اور غیر منطقی ہے؛ کیوں کہ اگر ہم مان لیں کہ ٹی وی اور وی سی آر میں جو نظر آتا ہے وہ عکس ہے، تب بھی یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جائز ہے؟ کیا قرآن وحدیث کی کسی دلیل سے یہ ثابت ہے کہ عکس خواہ کسی قسم کا ہو اس کو دیکھنا جائز ہے؟ یا کسی فقیہ نے یہ کہیں لکھا ہے؟ قطعاً نہیں؛ بل کہ فقہا نے اس کے خلاف یہ لکھا ہے کہ بعض چیزوں کا عکس دیکھنا بھی حرام ہے۔ چناں چہ علامہ شامی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ اجنبیہ عورت کا پانی یا آئینے میں عکس دیکھنا بھی حرام ہونا چاہیے کیوں کہ فتنہ اور شہوت کا اندیشہ ہے۔ پھر علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ

---

(۱) ٹیلی ویژن۔ اسلامی نقطۂ نظر سے: ۱۲

کے فتاویٰ سے بھی اس کی ترجیح نقل کی ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ مطلقاً ہر عکس جائز نہیں ہے؛ بل کہ جس طرح بعض اصل چیزوں کو دیکھنا حرام ہے، اسی طرح ان کے عکس کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔

اب غور فرمایئے کہ کس قدر عجیب بات ہے کہ بعض علما ٹی وی کو جائز قرار دینے کے لیے اس کے عکس ہونے کو ثابت کرنے لگتے ہیں، جب کہ اس کا عکس ہونا بھی اس کے جائز ہونے کی دلیل قطعاً نہیں بن سکتا، جب کہ اس عکس سے وہ تمام خرابیاں لازم آرہی ہیں؛ جن کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔[2]

بل کہ حقیقت یہ ہے کہ عام تصویروں سے زیادہ اور پانی و آئینے کے عکس سے تو ہزاروں درجہ زیادہ ٹیلی ویژن کے عکس میں انسانی جذبات کو اپیل کرنے والی کیفیات وخصوصیات ہوتی ہیں، تو پھر بھی یہ صرف عکس ہونے کی وجہ سے جائز ہوجائے یہ نہایت ہی غیر معقول بات نہیں تو اور کیا ہے؟

بہ ہر حال ہر قسم کے لہو ولعب، گانے بجانے سے مسلمانوں کو پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔

نشہ بازی کی کثرت

”وشربت الخمور“

(اور شرابیں پی جانے لگیں)

”خمور“ ”خمر“ کی جمع ہے اور خمر عربی میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے، جو عقل پر پردہ ڈال

(۱) الشامي علی الدر المختار: ۶/۳۷۲

(۲) اس کی تفصیل کے لیے راقم کا رسالہ ”ٹیلی ویژن، اسلامی نقطہ نظر سے“ دیکھیے

دینے والی ہو،خواہ وہ چیز تر ہو یا خشک ،کھائی جانے والی یا پی جانے والی ہو۔[1]

اور اسی کو حدیث میں اس طرح فرمایا گیا ہے

« کل مسکر خمر و کل مسکر حرام »

(ہر نشہ لانے والی چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔)[2]

اس سے معلوم ہوا کہ شراب اور خمر صرف اس کو نہیں کہتے جو زمانۂ رسالت و زمانۂ صحابہ و تابعین میں پائی جاتی تھی؛ بل کہ ہر وہ چیز خمر و شراب ہے جس سے نشہ آتا ہو،خواہ وہ کھانے کی چیز ہو یا پینے کی ،تر ہو یا خشک ہو جیسا کہ علامہ ذہبی نے فرمایا ہے۔

پھر یہاں "خمر" کی جمع "خمور" استعمال کر کے اس طرح اشارہ کیا گیا ہے کہ مختلف قسم کی شرابیں اور نشہ آور چیزیں رائج ہوں گی۔ چناں چہ آج ہزاروں اقسام و انواع کی شرابیں مروج ہیں،کوئی کسی کا عادی ہے،کوئی کسی کا۔ سنا جاتا ہے کہ سانپ کے زہر میں بھی نشہ ہوتا ہے اور اس نشے کے نشہ باز بھی پائے جاتے ہیں۔ اس حدیث نے بتایا کہ جب اس طرح مختلف قسم کی شرابیں پی جائیں،تو خدا کی طرف سے مذکورہ عذابات آئیں گے۔

نشے بازی کا عام رجحان

اس حدیث سے جو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مختلف قسم کی شرابیں پی جائیں گی۔ اس کے مطابق آج معاشرے میں دیکھا جا رہا ہے کہ نشہ بازی کا رجحان عام ہوتا جا رہا ہے؛ حتی کہ کالج کے طالب علم جن میں لڑکیاں بھی ہیں، وہ بھی اس نشہ بازی کے شکار ہیں اور یہ عادت اس قدر بری ہے کہ جس کو اس کی لت پڑ گئی، وہ اس سے باز آنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ الا ما شاء اللہ

---

(۱) الکبائر للذهبي :۸۲

(۲) أبو داود مع بذل المجهود: ۳۳۱/۵

اس میں ایک طرف اگر خدا اور رسول کی ناراضگی ہے، جس سے عذاب لازم آتا ہے، تو دوسری طرف اس میں جان و مال کی تباہی اور ہلاکت بھی ہے اور اس سے معاشرے میں بھی بڑی برائیاں پھیلتی ہیں اور اس کی جڑوں کو اکھاڑ دیتی ہے۔

نشہ-ایک مہلک ہتھیار ہے

اس نشے کے عادی و مریض لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ نشہ بازی ایک مہلک ہتھیار ہے، جو نشہ باز کی نسل کو ختم کر دیتا ہے۔ گویا یہ وہ ہتھیار ہے، جس سے نشہ باز خود اپنے اوپر حملہ کرتا ہے۔ میں اس جگہ ایک فرانسیسی ڈاکٹر مسٹر ہنری کی یہ بات نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جو اس نے اپنی ایک کتاب ''خواطر و سوانح في الإسلام'' میں لکھی ہے۔ اور اس کو علامہ طنطاوی رحمۃ اللہ کے حوالے سے حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ صاحب نے نقل کیا ہے:

> ''بہت زیادہ ہتھیار جس سے اہل مشرق کی بیخ کنی کی گئی اور وہ دو دھاری تلوار جس سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا یہ شراب تھی۔ ہم نے ''الجزائر'' کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا؛ لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہ لوگ ہمارے اس تحفے کو قبول کر لیتے؛ تو ہمارے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتے۔''(۱)

اس کے علاوہ اس کے دیگر مفاسد و خرابیاں عام طور پر سب کو معلوم و مشاہد ہیں، جو جسمانی بھی ہیں روحانی بھی، جانی بھی اور مالی بھی؛ لہٰذا اس سے ضرور پرہیز کرنا چاہیے۔

---

(۱) معارف القرآن: ۱/۵۳۰

ایک کفن چور کا واقعہ

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ نے ایک لمبا واقعہ نقل کیا ہے۔ہم یہاں اس کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں :وہ یہ کہ ایک نوجوان ایک دن امیر المومنین عبدالملک بن مروان کے پاس غم زدہ روتا ہوا آیا اور کہا کہ میں نے بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لیے توبہ ہے؟ عبدالملک نے پوچھا کہ تیرا گناہ کیا ہے؟ کہا کہ بڑا گناہ ہے، میں قبر کھود کر کفن چرایا کرتا تھا اور میں نے اس زمانے میں عجیب باتیں دیکھی ہیں۔اس کے بعد اس نے بہت سی باتیں بتائیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے کہا میں نے ایک قبر کھودی تو دیکھا کہ قبر والا مردہ سور کی شکل میں مسخ ہوگیا ہے۔ اور زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہے ۔اور گردن میں بیڑی پڑی ہوئی ہے ،میں ڈر کر نکلنے کا ارادہ کیا،تو کسی نے آواز دی اور کہا کہ تو اس کا حال کیوں نہیں پوچھتا؟ میں نے کہا اس کی یہ حالت کیوں ہے؟ تو بتایا کہ دنیا میں شراب پیتا تھا اور بغیر توبہ کیے مر گیا‘‘۔(۱)

اسلافِ کرام پر لعنت

ولعن آخر هذه الامة أولها

(اور اس امت کا آخری حصہ،اس کے پہلے حصہ پر لعنت کرے۔)

یعنی بعد میں آنے والے لوگ گزرے ہوئے نیک لوگوں مثلاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ، تابعین عظیم، ائمہ دین وعلما فقہا یہ امت پر لعن طعن کرنے لگیں، یہ بھی سخت ترین گناہ ہے ،جس پر دنیا میں بھی بڑے بڑے عذابات آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلاف کرام پر لعنت اور طعنہ زنی دراصل اسلام پر طعنہ زنی ہے اور اسلام پر طعنہ زنی کس قدر بری بات ہے؟ یہ سب کو معلوم ہے۔

---

(۱) الكبائر للذهبي:٨٧

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعنہ زنی کا حکم

اسلاف اسلام پر سب سے زیادہ دین سے اور اللہ کے رسول علیہ السلام نے قرب رکھنے والے، دین کی اشاعت وتبلیغ میں سب سے زیادہ محنت ومجاہدہ کرنے والے اور دین کی خاطر سب سے زیادہ تکالیف ومصائب کو برداشت کرنے والے ''صحابہ کرام'' رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔ لہٰذا اسلافِ کرام میں سے صحابۂ کرام پر لعنت وطعن، ان پر سب وشتم اور ان پر تبرابازی سب سے زیادہ بڑا گناہ اور بددینی کی بات ہوگی؛ اس لیے اللہ کے برگزیدہ رسول نے اپنے اصحاب کو برا کہنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

''ترمذی'' کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، میرے صحابہ کے بارے میں، میرے بعد ان کو ہدف ملامت نہ بناؤ، کیوں کہ جو اُن سے محبت کرتا ہے، وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ میرے سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے اور جو ان کو تکلیف پہنچاتا ہے، وہ مجھے تکلیف پہنچاتا ہے اور جو مجھے تکلیف دیتا ہے، وہ اللہ کو تکلیف دیتا ہے اور خدا کو تکلیف دینے والا قریب ہے کہ پکڑا جائے۔ (۱)

''ترمذی'' ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہو، امام ترمذی نے اس حدیث کو ''حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔ (۲)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پسند کرلیا اور میرے لیے میرے صحابہ کو چن لیا، پھر ان میں میرے وزیر ومددگار اور

---

(۱) الترمذي: ۲/۲۳۶

(۲) ایضاً

سسر بنائے، پس جو ان کو برا بھلا کہے، اس پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اس سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ فرض قبول کرے گا نہ نفل۔(۱)

یہ چند حدیثیں نمونے کے طور پر یہاں نقل کر دی گئی ہیں، اگر کسی کو اس سلسلے میں تفصیل درکار، ہو، تو وہ علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ کی کتاب ''الصواعق المحرقة'' کا مطالعہ کرے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کو برا بھلا کہنا حرام اور فحش محرمات میں سے ہے۔قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحابہ پر سب وشتم کرنا؛ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔(۲)

ملا علی قاری رحمہ اللہ " شرحِ فقه ا کبر''میں رقمطراز ہیں:

''شرح العقائد میں ہے کہ صحابہ کو برا کہنا اوران پر طعن کرنا، اگر ان چیزوں سے ہے، جو دلائل قطعیہ کے مخالفت ہے؛ تو یہ کفر ہے: جیسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانا اور اگر ایسے امور میں نہ ہو؛ تو وہ بدعت وگناہ ہے''۔(۳)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص حضرات صحابہ پر طعن کرتا یا ان پر سب وشتم کرتا ہے، وہ دین سے خارج اور ملت اسلام سے الگ ہے؛ کیوں کہ ان پر طعن کرنا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کے حق میں برائیوں کا اعتقاد ہو، اور دل میں ان سے بغض پوشیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کی جو تعریف کی

---

(۱) الصواعق المحرقة :۳

(۲) شرح مسلم:۲/۳۱۰

(۳) شرح الفقه الأكبر:۸۶

ہے اور رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کی جو فضیلت و بڑائی بیان کی ہے، اس سے انکار ہو، پھر صحابہ کرام چوں کہ دین کے پہنچانے والے اور اس کا بہترین ذریعہ و وسیلہ ہیں؛ اس لیے ان پر طعن کرنا گویا اصل (دین) پر طعن کرنا ہے، اور ناقل کی توہین منقول کی توہین ہے۔“(۱)

علما کے ان بیانات سے صاف معلوم ہوا کہ صحابہ پر زبان طعن دراز کرنا، ان پر سب و شتم کرنا سخت گناہ اور بعض کے نزدیک کفر ہے۔

مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہل سنت کا موقف

آج سبائی پروپیگنڈے سے متاثر افراد جو حضرات صحابہ کی توہین و تنقیص کرتے اور ان کے خلاف اپنی ناپاک زبانوں کو چلاتے رہتے ہیں، سب سے زیادہ جس چیز کو اچھالتے اور صحابہ کرام کے حق میں نقص و برائی پر استدلال کرتے ہیں، وہ حضراتِ صحابہ کرام کے مابین ہونے والے بعض مشاجرات و اختلافات ہیں اور اس سلسلے میں ان کے پاس جو کچھ ہے، وہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں، جن میں صحیح و سقیم، قوی و ضعیف، حق و باطل کی آمیزش ہے؛ کیوں کہ سبائی ایجنٹوں نے تاریخ کو اپنے ناپاک عزائم و حرکات سے پاک و صاف رہنے نہ دیا؛ اسی لیے اہل سنت علما نے لکھا ہے کہ ان تاریخ کے اوراق سے صرف وہی بات مانی جائے گی، جو صحابہ کرام کی عدالت و ثقاہت کو جس پر نصوص قطعیہ نے دلالت کی ہے، برقرار رکھنے والی ہے، اس کے خلاف کوئی بات نہ لی جائے گی؛ کیوں کہ اس میں سبائیوں نے خلط ملط کر دیا ہے اور جو صحیح روایات سے ثابت ہے اس میں وہ حضرات معذور ہی نہیں؛ بل کہ ماجور بھی ہیں کیوں کہ ان حضرات نے کسی غلط و برے ارادے و نیت سے ایسا نہیں کیا تھا؛ بل کہ

(۱) الکبائر: ۲۳۸

نیک نیتی کے ساتھ اپنے موقف پر وہ قائم رہے تھے، یہ ان کا اجتہاد تھا، جن میں ممکن ہے بعض سے خطا ہوئی ہو؛ مگر یہ خطا بھی معاف ہے اور اس پر ایک اجر بھی ثابت ہے۔ میں نے یہاں اہل سنت کا جو موقف پیش کیا ہے، یہ حضرات علما اہل سنت کی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے، ہم یہاں اختصار کے پیش نظر صرف ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ اپنی کتاب ''العقیدۃ الواسطیۃ'' میں فرماتے ہیں:

''اہل سنت کے اصول میں سے یہ ہے کہ وہ روافض، جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے اور ان کو برا کہتے ہیں اور نواصب، جو اہل بیت رسول کو قول یا عمل سے ایذا دیتے ہیں، ان کے طریقے سے اپنے آپ کو بری کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین جو اختلاف ہوا، اس کے بارے میں (اپنی زبان کو) روکتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ان روایات میں جن سے صحابہ کی برائیاں معلوم ہوتی ہیں، بعض محض کذب اور جھوٹ ہیں اور ان میں سے بعض میں کچھ کمی بیشی کر دی گئی ہے اور ان کے اصل مفہوم سے ان کو بدل دیا گیا ہے اور ان میں سے جو صحیح ہیں، ان میں صحابہ معذور ہیں یا مجتہد برحق ہیں یا مجتہد خطاوار ہیں''۔(۱)

صحابۂ کرام کے گناہ تلاش کرنا ایمان کی کمزوری ہے

یہ تو ان خطاؤں کے سلسلے میں تفصیل و توضیح تھی، جو اجتہاد سے سرزد ہوئیں اور جو صریح گناہ و معصیت کے کام صحابہ سے صادر ہوئے، ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ معصوم نہیں ہیں؛ اس لیے گناہ کا صدور ان سے ممکن ہے؛ بل کہ واقع ہے؛

(۱) العقیدۃ الواسطیۃ، مندرجہ: المجموعۃ العلمیۃ السعودیۃ: ۱۸۰-۱۸۱

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی معافی قرآن میں کئی جگہ اعلان فرمایا ہے، پھر ان کی دین کی تبلیغ واشاعت کے سلسلے میں جدوجہد، ان کے خلوص وللٰہیت، خوف وخشیت، تقویٰ وپرہیزگاری، تعلق مع اللہ وحب رسول اللہ وغیرہ نیکیوں کے سامنے ان کے یہ دو چار گناہ جو بشریت کے تقاضے سے صادر ہو گئے، اس قابل نہیں کہ ان کو ان کی بنیاد پر گنہ گار ثابت کیا جائے، جیسے آج سبائی ایجنٹوں نے تحریک چلا رکھی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ نے بہت ہی صحیح فرمایا:

"بشاراتے کہ در حق ایشان بہ نصوص قطعیہ قرآن واحادیث متواترہ آمدہ است، ازان چشم پوشیدن واین عیوبات نادرہ ایشان را تجسس کردن؛ شان ایمان نیست"۔(۱)

(ان بشارتوں سے جوان (صحابہ) کے حق میں قرآن واحادیثِ متواترہ کی قطعی نصوص سے آئی ہیں، آنکھ بند کر لینا اوران کے اندر عیوب کو تلاش کرنا ایمان کی شان نہیں ہے۔)

صحابہ؛ انبیا کے حکم میں ہیں

اسی کتاب میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ ایک اور بات ارشاد فرماتے ہیں:

یہاں یہ دقیقہ جاننا چاہیے کہ انبیا کو برا بھلا کہنا؛ اس وجہ سے حرام وکفر ہے کہ برا کہنے کا سبب (یعنی گناہ وکفر) ان حضرات کے حق میں پایا نہیں گیا اور (اس کے مقابل) تعظیم وتوقیر کے اسباب ان میں بہ وفور پائے گئے اور جس کے گناہوں کی مغفرت اوران کا کفارہ بہ نص قرآن ثابت ہو، وہ جماعت بھی بالیقین سب وشتم وتحقیر واہانت کے حرام ہونے میں

(۱) تحفۂ اثنا عشریہ: ۳۳۸

انبیا کے حکم میں ہوگی، زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ انبیا میں اسباب تحقیر ہی موجود نہیں ہیں اور ان (صحابہ) میں اسباب تحقیر پائے جانے کے بعد (مغفرت الٰہی سے) معدوم ہو گئے اور وجود کے بعد معدوم ہو جانے والی چیز اس باب میں معدوم اصلی کے برابر ہے۔ (۱)

بہ ہر حال حضرات صحابہ کے بارے میں لب کشائی، ان پر سب وشتم، ان کی برائیاں تلاش کرنا سخت گناہ ہے۔

صحابہ پر سب وشتم کرنے والے پر عذاب کے واقعات

صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنے والے پر آخرت سے پہلے بسا اوقات دنیا میں بھی عذاب لوگوں کو دکھایا گیا ہے۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ ''کتاب الروح'' میں لکھتے ہیں کہ ابواسحاق نے کہا کہ مجھے ایک میت کو غسل دینے کے لیے بلایا گیا، جب میں نے اس کے چہرے سے کپڑا اہٹایا؛ تو دیکھا کہ ایک سانپ ہے، جو اس کے گلے میں لپٹا ہوا ہے اور بہت موٹا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں چلا آیا اور اس کو غسل نہیں دیا، لوگ بیان کرتے تھے کہ وہ صحابہ کو برا بھلا کہتا تھا۔ (۲)

''ائمہ تلبیس'' میں بدایونی کے حوالے سے اکبر بادشاہ کے حالات میں لکھا ہے:

''ملاّ احمد نامی ایک رافضی، صحابۂ کرام کو گالیاں دیتا تھا، ایک مرتبہ اکبر لاہور آیا ہوا تھا، ملا احمد صحابۂ کرام کے خلاف سب وشتم کی غلاظت اچھالنے لگا۔ ایک غیور مسلمان مرزا فولاد بیگ نے اس کو قتل کر دیا اور یہ رافضی کئی دن تک حالت نزع میں دم توڑتا رہا، اس اثنا میں اس کا چہرہ مسخ ہو کر

(۱) تحفۂ اثنا عشریہ :۳۲۹

(۲) کتاب الروح :۷۰

سور کی شکل میں تبدیل ہوگیا تھا، بہت سے لوگوں نے اس کو اس حالت میں دیکھا۔ ملا بدایونی کہتے ہیں کہ میں نے بھی اس کو اس حالت میں دیکھا۔‘‘(۱)

ائمہ وعلما پر لعنت کا حکم

اسلاف میں سے حضرات علما و ائمہ دین کو برا بھلا کہنا، ان پر لعنت وطعن کرنا بھی گناہ ہے؛ بل کہ علما نے فرمایا کہ عالم پر لعنت اور فقیہ کا اس کے علم وفقہ کی وجہ سے استہزا و مذاق اور اس کی توہین کفر ہے۔(۲)

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ حضرات سلف صالحین کے متعلق ہمارے دلوں کو پاک صاف رکھے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

مذکورہ گناہوں پر دردناک عذابات

حدیث زیر بحث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ گناہوں کو شمار فرما کر آخر میں ان پر مرتب ہونے والے عذابات میں سے بعض کو صاف طور پر بتا دیا ہے اور بعض کو اجمالاً و اشارۃً بیان فرمایا ہے۔ پانچ کو صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:

(۱) سرخ آندھی: یہ تیز وتند ہوا ہے، جس سے بلند قامت عمارتیں اور فلک بوس ومستحکم پہاڑ بھی ہل جاتے اور ہلاکت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں؛ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیز ہوائیں چلتیں، تو گھبرا جاتے اور اس کے آثار آپ کے

---

(۱) ائمہ تلبیس: مصنفہ ابو القاسم رفیق دلاوری :۳۳۴

(۲) الاعلام بقواطع الاسلام: لابن حجر المکي :۵۲

چہرۂ انور پر ظاہر ہوتے۔(۱)

کیوں کہ آپ کو گنہ گاروں کے گناہوں سے عذاب آنے کا اندیشہ ہوتا۔(۲)

اور یہ عذاب پچھلی امتوں میں قوم عاد پر نازل ہوا تھا۔

(۲) **زلزله**: کون نہیں جانتا کہ یہ زلزلہ کے جھٹکے کس قدر خطرناک ہوتے ہیں، ابھی گذشتہ دنوں ۱۹۸۸ء کے اواخر میں ''رشیا'' میں جو خطرناک وخوف ناک زلزلے یکے بعد دیگرے آئے اور بستیوں کی بستیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا تھا، اس کو ابھی تک لوگ بھولے نہیں ہیں۔

(۳) **خسف**: زمین میں دھنسنا- قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ پچھلے لوگوں پر بھی عذاب آیا تھا، ''قارون'' کے متعلق بھی قرآن نے بتایا ہے کہ اس کو اللہ نے زمین میں دھنسا دیا تھا- (القصص :۸۱) اور دیگر حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس امت میں بھی متعدد خسوف ظاہر ہوں گے۔ ان میں سے ایک حدیث میں تین کا ذکر ہے۔(۳)

ممکن ہے کہ اس حدیث میں جس کا ذکر ہے وہ ان ہی تین میں سے ایک ہو، یا ان کے علاوہ؛ بہ ہر حال یہ بڑی خوف ناک چیز ہے؛ جس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔

(٤) **مسخ**: صورتوں کا مسخ ہو جانا، یہ عذاب پچھلی امتوں میں بہت ظاہر ہوا ہے، بنی اسرائیل کو بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا تھا اور بعض کو خنزیر کی شکل میں اور اس طرح کے واقعات اس امت میں بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ وہ دو چار واقعات اس رسالے میں بھی گزر چکے ہیں۔

---

(۱) البخاري:۱/۱۴۱

(۲) ایضاً

(۳) جمع الفوائد:۲/۳۹۲

(۵) **قذف**: آسمان سے پتھر آنا، ''ابرہہ'' بادشاہ اور اس کے لشکر پر آسمان سے کنکریاں برسنا قرآن سے ثابت ہے، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر کی بارش بھی قرآن میں مذکور ہے۔ (هود: ۸۲)

یہ سب عذابات جو پچھلی قوموں پر آئے تھے، اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والتسلیم فرماتے ہیں: اس امت پر بھی مذکورہ گناہوں کی وجہ سے آئیں گے۔

پھر اس پر بس نہیں؛ بل کہ فرمایا کہ اس کے علاوہ اور عذابات بھی اس طرح لگاتار اور یکے بعد دیگرے آئیں گے، جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ جانے پر، موتیاں لگاتار گرنے لگتی ہیں۔

آخری بات

مذکورہ بالا حدیث جس کی عام فہم تشریح پیش کی گئی ہے، اس میں ہمارے لیے عبرت وبصیرت ہے، اور سخت تنبیہ وتوبیخ بھی ہے کہ ان گناہوں سے بچا جائے اور اپنے آپ کو ان میں ملوث کر کے، ان عذابات کا مستحق نہ بنائیں۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام مسلمانوں کو اپنی مرضیات پر چلنے اور نامرضیات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی رحمت کے سایہ میں ہمیں جگہ دے اور اپنے غضب سے بچائے۔ آمین

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ